''چہارسُو''

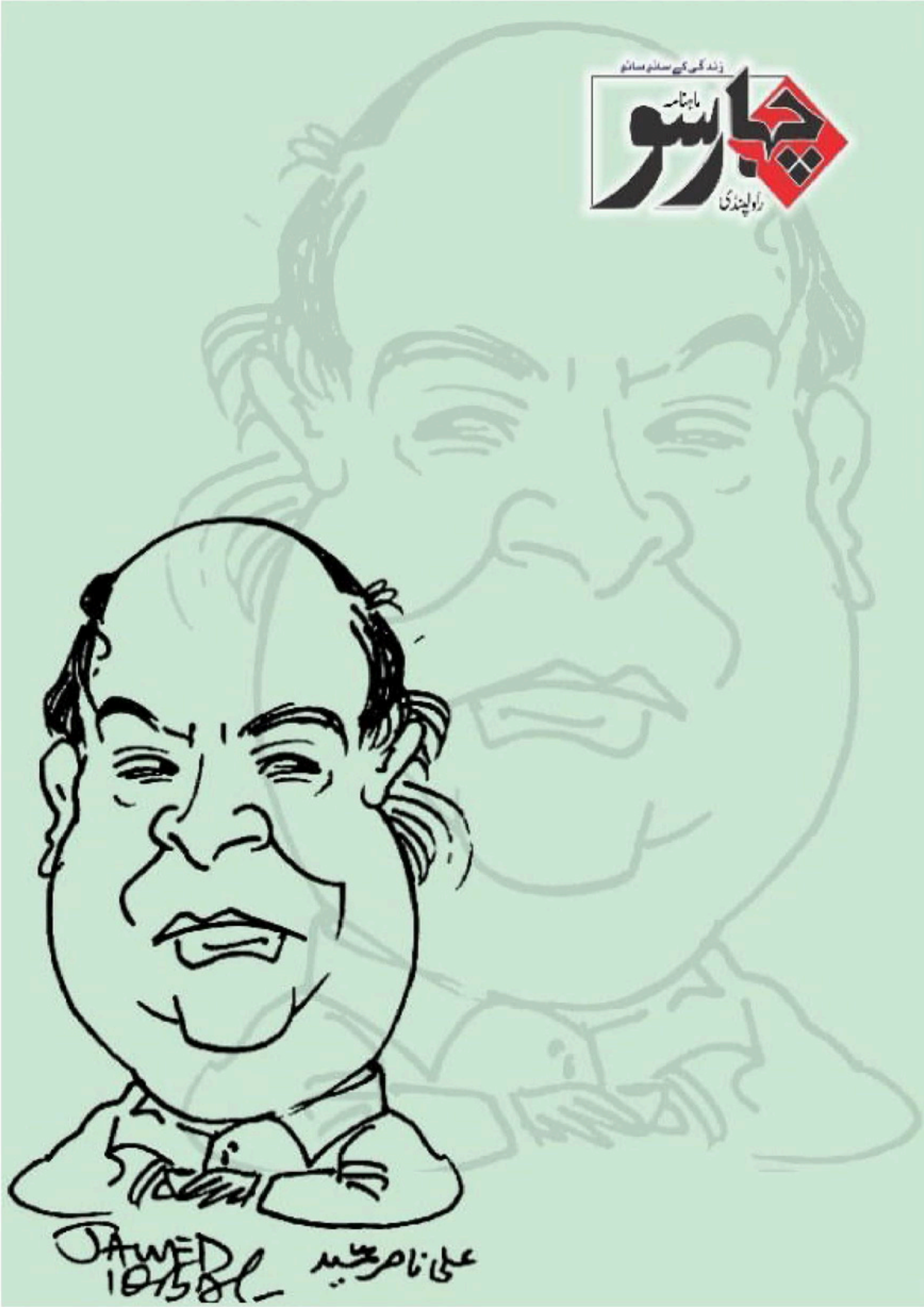
زندگی کے سنگ سنگ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
JAWED
علی ناصر مجید

...... باتیں مشفق خواجہ کی ......

جناب مشفق خواجہ کی علمیت، بذلہ سنجی، تحقیقی ژرف نگاہی اور خداداد تخلیقی صلاحیت سے سبھی اہل قلم واقف ہیں۔اُن کی تحریریں آج بھی اُردو ادب کا زندۂ جاوید حصہ ہیں۔انہوں نے طنز ومزاح، تنقید، تحقیق، کالم اور خطوط کی صورت میں جو بھی تحریر کیا، اس سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہوا ہے۔متعدد معروف شخصیات کے نام مشفق خواجہ کے خطوط پہلے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔اب پیشِ نظر خطوط جو ڈاکٹر تحسین فراقی کے نام لکھے گئے تھے، کتابی صورت میں ''باتیں مشفق خواجہ کی'' کے زیرِ عنوان یک جا شائع ہوگئے ہیں۔ان خطوط کے مطالعے سے جناب مشفق خواجہ اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے ادبی معاملات اور دوستانہ تعلقات سے بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔ڈاکٹر تحسین فراقی ایک وضع دار انسان اور قد آور ادبی شخصیت کا نام ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔وہ آج کل مجلسِ ترقی ادب، لاہور کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دے رہے ہیں۔اُن کی متعدد علمی و ادبی کاوشیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں اور قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فن و ہنر اور مشاہیر اردو ادب سے داد و تحسین بھی وصول کر چکی ہیں۔''باتیں مشفق خواجہ کی'' ترتیب کا سہرا محترمہ ڈاکٹر حمیرا ارشاد کے سر ہے۔قوی اُمید ہے کہ مشفق خواجہ اور ڈاکٹر تحسین فراقی جیسی دو بڑی ادبی شخصیات سے متعلق یہ کتاب اردو ادب کا وقیع سرمایہ قرار پائے گی اور دنیائے اردو ادب میں اس کتاب کی شہرت کی آواز تادیر گونجتی رہے گی۔

...... شاعر علی شاعر

اشاعت:۲۰۱۸ء قیمت:۶۰۰ روپے، دستیابی: رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی۔

...... رہِ حافظ وخیام ......

آغا گل افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں مگر وہ تو شاعر نکلے۔شاعری کے زیرِ عنوان بظاہر جو نثر نما تحریر انہوں نے سپردِ قلم کی ہے وہ تو شاعری ہے، نثر نہیں ہے۔اسے آپ نثری نظم کہہ سکتے ہیں۔کہہ سکتے ہیں کیا، یہ ہے ہی نثری نظم، یعنی شاعری، اسی لیے تو اس کا نام انہوں نے شاعری رکھا ہے۔غالبؔ نے کہا تھا: ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!'' یہ نظم آغا گل صاحب پر بھی غیب سے نازل ہوئی ہے۔انہوں نے اس نظم کو اسی بے اختیاری میں صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے، جیسے کولرج نے ''قبلائی خان'' کو لکھا تھا۔ان کا قلم پہلی سطر سے آخری سطر تک کہیں رکا نہیں۔بے ساختہ اور بے محابا چلتا گیا ہے۔وہ شاعری کی گرفت میں تھے۔غالباً خود انہیں بھی معلوم نہیں ہوگا کیا لکھتے جا رہے ہیں۔انہوں نے مختلف زاویوں سے کئی باتیں کی ہیں۔مگر ان میں وحدتِ تاثیر ہے۔کیوں کہ یہ ساری باتیں شاعری کے بارے میں ہیں۔

......جمیل یوسف

اشاعت:۲۰۱۸ء، قیمت: ایک مسکراہٹ، دستیابی: کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ۔

...... پہچان کا سفر ......

زہیر کنجاہی کی شاعری میں ہمیں جذبے چلتے پھرتے اور احساس تجسیم کا مرکب بن کر نظر آتا ہے۔زہیر کنجاہی نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونوں کو بیان کرتے ہوئے خوبصورت لفظوں اور ترکیبوں کا سہارا لے کر قاری کے سامنے ایک نئی دنیا بسانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔لفظ اگر علامت ہے، ہمارے کسی خاص جذبہ اور سوچ کی تو زہیر کنجاہی نے قاری تک اپنے احساسات کو من وعن پہنچانے میں کہیں کوتاہی نہیں برتی بلکہ اپنے کمالِ فن اور بے پناہ محنت کے ذریعے قاری کے لیے ترسیل کو سہل بنانے کی کوشش کی ہے۔وہ تہذیبِ انسانی کو ایک اکائی فرض کرتے ہوئے اس بات پر نوحہ خواں نظر آتے ہیں کہ انسان نے اپنے ہی ہاتھوں تہذیب وتمدن کو خانوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے۔اب انسانیت ان ٹکڑوں کو ایک اکائی کی صورت میں دوبارہ جوڑنے کی کوشش میں مگن ہے مگر کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکے گی۔

......پروفیسر شیخ عبدالرشید

اشاعت:۲۰۱۸ء، قیمت: دعائے مغفرت (زہیر کنجاہی)، دستیابی: کامرانیاں پبلشرز، کنجاہ، گجرات۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۷،شمارہ:جولائی،اگست ۲۰۱۸ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمدانعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِسالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:537/D-1 ،گلی نمبر18،ویسٹریج-III ،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:8730433-8730633-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازارراولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

تقدیس کے طائر۔۔۔۔۔۔۔سید شکیل احمد نایابؔ ۵

حرفِ محبت کی عطا۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۶

رفعت کے نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ناصر علی سید ۷

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۸

میں آدھے سے زیادہ مر چکا ہوں۔۔۔ناصر علی سید ۱۵

بچھڑنے کا بہانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۱۶

بیکسی کے موسم میں۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ریاض مجید ۱۹

ہوا، ساغر اور چاندنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمود شام ۲۹

تلخ نوائی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد اظہار الحق ۲۱

ناصر کی نثر کا بنیادی عنصر۔۔۔واصف حسین واصف ۲۳

ادب کے اطراف میں۔۔۔۔پروفیسر خالدہ ظہور ۲۵

میرے ہونے کا استعارہ۔۔۔ڈاکٹر طاہر تونسوی ۲۷

ادب کے اطراف۔۔۔۔۔۔۔۔بی بی حلیمہ بشریٰ ۲۹

هلکه ورغ بہ لیونے شے۔۔۔سعد اللہ جان برق ۳۱

ادب نما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارشاد صدیقی ۳۳

فیصلے کی گھڑی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۳۴

ایک محتاط کہانی (افسانہ)۔۔۔۔۔۔۔ناصر علی سید ۳۷

زندگی (ڈرامہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ناصر علی سید ۳۸

قرآں کی رہنمائی

شگفتہ نازلی، انیس الرحمٰن۔ ۴۸

افسانے

روشنی کا ہالہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بلال مختار ۴۹

سودا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سلیم آغا قزلباش ۵۴

رودادِ چمن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شیخ بشیر احمد ۵۸

سمے کی کہانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نگہت یاسمین ۶۱

پتھر کے شہر میں

غالب عرفان، محمود الحسن، آصف ثاقب، اختر شاہجہاں پوری، مہندر پرتاپ چاند، قاسم جلال، رؤف خیر، کرامت بخاری، نذیر فتح پوری، گل بخشالوی، اشرف جاوید۔ ۶۳

افسانے

روٹھی ہوئی بیوی کے نام خط۔۔۔۔۔۔یونس خان ۶۸

میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا۔۔۔اسلم جمشید پوری ۷۰

عمر قید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طیبہ ولایت خان ۷۲

کانچ کا چھناکا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۷۵

کشکولِ سخن

عارف امام، نوید سروش، وجے منوہر، کرشن گوتم، شریف شیوہ، عطاء الرحمٰن، عارف شفیق، مراق مرزا، جاوید صدیق، اسد اعوان، ہاجرہ نور، آفتاب خان، آپا جمیلہ شبنم، ابراہیم عدیل، سید طاہر شیرازی۔ ۷۹

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۸۴

اُفق کے اُس پار

گر مشتاق بروئے زمیں است۔۔۔۔زید بن عمار ۹۱

آدابِ سخن

چوبیس مشہور بحور۔۔۔۔۔۔۔۔محمد اسامہ سرسری ۹۲

زندگی نایاب ہے

پراسٹیٹ کینسر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم ۹۳

مثلِ تیغِ بُرّاں

عبداللہ جاوید، یوگیندر بہل، جواز جعفری، عبدالرحمٰن ضمیر درویش، سبیلہ انعام، نیلم بشیر، وِبھا نازلی، شگفتہ نازلی۔ ۹۵

آئینۂ فن

تعارف میری شاعری ہے۔۔۔۔۔۔تقی عابدی ۱۰۰

خزاں کا گیت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ریاض احمد ۱۰۳

نادیہ فصیل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نازیہ پروین ۱۰۵

نشانِ راہ

کشور ناہید سے کشور آپا تک۔۔۔۔فرح کامران ۱۰۷

ہمارے رانا خان۔۔۔۔۔۔۔ملک زادہ جاوید ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

گیتا بالی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہہ الوقار ۱۱۸

تقدیس کے طائر

زندگی پیار سے کب ہوتی ہے قاصر ناصر
میں لگا تار یہ کہتا رہا ناصر ناصر

زندگی جن کے ترنم سے جنم لیتی ہے
تیری خوشبو میں ہے وہ چار عناصر ناصر

تو نے الفاظ کو ادراک نیا بخشا ہے
اڑتے ہر سمت ہیں تقدیس کے طائر ناصر

تجھ میں آباد ہیں چاہت کے جزیرے ہر سو
تجھ میں پنہاں ہیں ہستی کے نظائر ناصر

ان کو جذبوں کے تقدس کا قرینہ ہو عطا
ہر قدم پر یہاں مصروف ہیں تاجر ناصر

مرے دل کو کیا الہام سے روشن نایابؔ
میرے ادراک سے ہوتا نہیں باہر ناصر

○

سید شکیل احمد نایابؔ
(پشاور)

●○●

قرطاسِ اعزاز

ناصر علی سید

کے نام

●○●

حرفِ محبت کی عطا

محمد انعام الحق
(اسلام آباد)

پروفیسر ناصر علی سید ایک صاحب طرز افسانہ نگار، ممتاز شاعر، متوازن نقاد، ریڈیو، ٹیلیوژن کے معروف ڈرامہ نگار اور بین الاقوامی شہرت کے حامل شعبہ ادب کی نامور شخصیت ہیں۔ آپ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو ضلع نوشہرہ کے تاریخی قصبے اکوڑہ خٹک میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اکوڑہ خٹک، گورنمنٹ کالج نوشہرہ اور پشاور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ماسٹر کرنے کے بعد وفاقی وزارت اطلاعات ونشریات حکومت پاکستان میں ریسرچ آفیسر اور پھر حکومت پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے پشتو ماہنامہ ''کاروان'' کے ایڈیٹر کے طور پر ٦ سال تک کام کیا جس کے بعد لیکچر شپ جوائن کی اور اکتیس سال تک تدریس سے وابستہ رہنے کے بعد بطور چیئرمین شعبہ اردو گورنمنٹ کالج پشاور سبکدوش ہوئے۔

ادب کے شعبہ میں نقاد، افسانہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے پشاور، خیبر پختونخوا اور پاکستان بھر سے شناخت حاصل کرنے کے بعد بیرون پاکستان پوری اردو دنیا سے احترام اور وقار حاصل کرنے والی اس ادبی شخصیت کو بین الاقوامی مشاعروں، سیمینارز اور ادبی تقریبات میں شرکت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس ضمن میں آپ امریکہ (نیویارک، بوسٹن، فینکس، لاس اینجلس) ترکی (استنبول، انقرہ، کروشہر) اور انڈیا (دہلی، الٰہ آباد، آگرہ، لکھنؤ) کے عالمی مشاعروں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شریک ہو چکے ہیں۔

آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ اردو، ہندکو اور پشتو تین زبانوں کے ادبی جریدوں کے ایڈیٹر رہے ہیں۔

اردو: بطور ایڈیٹر (ماہنامہ ہفت رنگ ٦ سال، سہ ماہی ادراک، سہ ماہی احساس (دورِ اوّل) اور ان دنوں اردو دنیا کا مقبول ادبی جریدہ ترقی پسند ادب کا سہ ماہی ''احساس'' پشاور نکال رہے ہیں (جاری)

ہنکو: بطور چیف ایڈیٹر (ماہنامہ پرچول دور اول۔ پرچول انٹرنیشنل مجلس مشاورت ماہنامہ فروغ (جاری)

پشتو: بطور ایڈیٹر ماہنامہ کاروان (حکومت پاکستان وزارت اطلاعات و نشریات) چھے سال۔

آپ سنڈیکیٹ آف رائٹرز پاکستان کے چیئرمین اور اباسین آرٹس کونسل کے مشیر ادبیات ہونے کے علاوہ ملاقات، عالمی ادبی تنظیم حلقہ ارباب ذوق اور دسیوں ادبی انجمنوں کے صدر اور سیکرٹری ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے صوبائی صدر اور سرپرست ہیں۔

آپ گذشتہ چالیس سال سے ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی وژن اور سٹیج کے لیے اردو، ہندکو اور پشتو زبان میں سینکڑوں کی تعداد میں انفرادی ڈرامے، سیریلز اور سیریز لکھ چکے ہیں اور ایک نجی پشتو چینل پر دو سال سے زیادہ عرصہ تک مسلسل مقبول ادبی پشتو پروگرام ''خبرہ دا کتاب'' (کتاب کی بات) بطور میزبان پیش کر چکے ہیں۔

آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان ٹیلی وژن پشاور سے نشر ہونے والی اردو، پشتو اور ہندکو کی انگنت سیریلز میں سے آپ کی مقبول ترین ہندکو ڈرامہ سیریل ''زندگی'' کو مرکزی ہندکو بورڈ نے کتابی صورت میں شائع کیا اور جسے اباسین آرٹس کونسل نے سال کی بہترین کتاب گردانتے ہوئے گولڈ میڈل دیا۔

آپ کے شعری مجموعہ ''شامیں فریب دیتی ہیں'' کو ۲۰۰۸ء کے لیے پاکستان بھر سے شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں سے بہترین قرار دیتے ہوئے سب سے بڑا غیر سرکاری معروف و مشہور ایوارڈ ''عکسِ خوشبو'' (پروین شاکر ایوارڈ) دیا گیا۔

آپ کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے اردو دنیا کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے مقالہ جات کو ۲۰۱۰ء میں سنڈیکیٹ آف رائٹرز نے کتابی شکل میں ''محبت بیکراں ہے'' کے نام سے شائع کیا۔ جبکہ کالموں کا مجموعہ ''مقابل ہے آئینہ'' اور رفعت کے نام قیام امریکہ کے دوران لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ''تیرے نام'' ہے۔ ۲۰۱۳ء میں ادبی مضامین اور ادبی کالموں پر مشتمل آپ کی تازہ کتاب ''ادب کے اطراف میں'' شائع ہو کر ادبی حلقوں سے پذیرائی حاصل کر رہی ہے۔

آپ ایک طویل عرصہ تک روزنامہ مشرق کا ادبی صفحہ ترتیب دیتے رہے ہیں اور اب گزشتہ سات برسوں سے روزنامہ آج کا پاکستان اور بیرون پاکستان پوری اردو دنیا میں مشہور اور مقبول ہفتہ وار ادبی صفحہ ''ادب سرائے'' آپ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

آپ کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ شعبہ ادب وفن میں گزارنے کے دوران وفاقی وزارت مذہبی امور، حج واوقاف کے بہترین نعت گو شاعر کا ایوارڈ ایرانی کلچر سنٹر کا ایوارڈ صوبائی حکومت کی طرف سے پشاور ایوارڈ اور فرنٹیئر آرٹس کونسل کے ایوارڈ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی مختلف ادبی وثقافتی تنظیموں کی طرف سے ستر سے زیادہ ایوارڈ اور میڈلز عطا کیے گئے۔

''چاند پر آلو''

چینی اخبار ''چانگ فنگ پوسٹ'' کے مطابق چاند سے متعلق ''چانگ چار مشن'' آئندہ برس لانچ کیا جائے گا اور اسی مشن کے دوران (ایکو سسٹم) کے تحت ایک چھوٹے حصے پر چین کے سائنسدان آئندہ چاند پر آلو اگانے کی کوشش کریں گے۔

رفعت کے نام

ناصر علی سید

رفعت جی! پیار لو!

میرا رب کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔اس سے قبل میرے دو خط مل چکے ہوں گے۔گزشتہ رات شاہین کیفی سے واپس آیا تو عتیق صاحب کا فون آیا خوب گپ شپ ہوئی وہ اتوار کو نیویارک والدہ صاحبہ کو ریسیو کرنے آئے گا اور انہیں بھائی کے گھر چھوڑ کر "حجرہ میر" آ جائے گا اور پھر میں اُن کے ساتھ بوسٹن کے قریب کیپ کوڈ چلا جاؤں گا۔ سنا ہے کہ بہت خوبصورت جگہ ہے بہرحال "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" (سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہے) آپ نے فون پر مووی بنانے کی بات کی مگر مووی کیمرہ اُن کے پاس بھی نہیں ہے 400 ڈالرز سے کم کا ملے تو شاید خرید لوں۔تقریب کے بعد جب عتیق صاحب آئے تھے تو جاتے ہوئے ایک لفافہ دے گئے کہ اس میں میرا فون نمبر اور میل ایڈریس وغیرہ ہے۔اُن کے جانے کے بعد کھولا تو نہ فون نمبر تھا اور نہ ہی پوسٹل ایڈریس البتہ 50,50 کے دو نوٹ یعنی 100 ڈالرز پڑے تھے عجیب آدمی ہے۔ فون پر کہا بھی کہ عتیق جی یہ کیا ہے مگر آپ کو تو اس کی محبت اور خلوص کا پتہ ہے۔۔۔ میں تو۔۔۔ بہت کم باہر اکیلا جاتا ہوں۔اس لیے بہت کم خرچہ ہے۔ ٹکٹ لفافہ یا سب وے (ٹرین) کے لیے ہی خرچہ کرنا پڑتا ہے۔ جہاں آپ کسی سب وے سٹیشن 1.5 ڈالر کا ٹکٹ خرید کے گھس جائیں اور یہاں مرضی ہے نیویارک میں چلے جائیں یا کتنی ہی گاڑیاں صبح سے شام تک بدلتے رہیں زیر زمین اور زمین کے اوپر سیر کرتے رہیں۔البتہ سٹیشن سے ایک بار باہر آ گئے تو پھر اندر جانے کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔ ایئر کنڈیشنڈ گاڑیاں ہیں خود کار دروازے سٹیشن آنے پر خود ہی کھلتے اور پھر چند لمحوں کے بعد بند ہوتے ہیں اور ایک سیلاب لوگوں کا اُترتا چڑھتا ہے۔لڑکے لڑکیاں بوڑھے بوڑھیاں اور بچے بچیاں سب مل کر ہی سفر کرتے ہیں جو جہاں جس کے پاس بیٹھ جائے۔سفر میں زیادہ تر نوجوان لڑکے لڑکیاں واک مین لگائے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے ساتھ ساتھ جھومتے بھی ہیں اکا دکا لڑکی آپ کو کتاب یا رسالہ پڑھتی ہوئی نظر آئے گی۔ اکثر جاب کر کے واپس آتی ہیں تو ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر کے کندھوں پر سر رکھ کر بے فکری سے سو جاتی ہیں۔اپنے اسٹیشن سے ذرا پہلے نہ جانے کیسے جاگ جاتی ہیں اور "سوری ہول نائٹ آئی واز آن دی جاب آئی ہوپ یو ونٹ مائنڈ اٹ" گویا معذرت کہ میری وجہ سے آپ کے کاندھے کو زحمت ہوئی نہ ہوئے چچا غالب ورنہ روز اپنا یہ شعر پڑھنا پڑتا۔

نیند اُس کی دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

سارا دن سوری۔ ایکسکیوز می۔ تھینک یو۔نوک زبان پر رہتا ہے دوسروں کے آرام کا اور عزت نفس کا یہاں بہت خیال رکھا جاتا ہے یوں تو ہر ملک اور ہر زبان کا شخص آپ کو یہاں ملے گا مگر زبان انگریزی اور سپینش ہی زیادہ چلتی ہے اس طرح دیگر ممالک کے لوگ نیویارک میں ایک مخصوص جگہ پر رہتے ہیں۔ جیسے جیکسن ہائیٹس جہاں میر صاحب کا اپارٹمنٹ ہے اس علاقے میں ایشیائی لوگوں کی اکثریت ہے۔ ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی اور چین وغیرہ کے لوگ ہی رہتے ہیں۔حلال چیزیں یہاں آسانی سے ملتی ہیں اور بڑے بڑے سٹورز ہیں جو انہی ممالک کے لوگوں کے ہیں۔ سیلز گرل بھی ایشیائی ہی ہیں زیادہ تر ہندوستانی۔جیکسن ہائیٹس کو آپ ایک منی پاکستان کہہ سکتے ہیں اُردو پنجابی ہندکو اس علاقے میں چلتی ہے یہاں کے کباب ہاؤس میں آپ کو پاکستانی کھانے پانچ چھ ڈالرز میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔میر صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ رات 9 بجے جاب پر چلے جاتے ہیں اور صبح 8 بجے آف کرتے ہیں۔8 بجے اُن کے ساتھ گپ لگتی ہے ناشتہ تیار کر کے دیتے ہیں اور پھر 10 بجے تک سو جاتے ہیں اور شام 5 بجے جاگتے ہیں نہا دھو کر تیار ہو کر سات بجے شاہین ریستوران جا کر دوستوں سے مل کر 9 بجے پھر چلے جاتے ہیں اُن کا بیٹا پوپی صبح گیارہ بجے جاب پر جاتا ہے اور رات 3 بجے کے لگ بھگ لوٹتا ہے اور سو جاتا ہے بس ایک تنویر شاہ ہے جو چھٹی پر ہے مگر وہ بھی ساری رات جاگتا اور صبح سوتا ہے پھر 3 بجے کے قریب جاگتا ہے کل شاہین سے ہم دس بجے لوٹے کھانا کھایا اور تنویر شاہ نے کہا چلو شاہ جی سوانوں نیویارک وکھالیاں۔گیارہ بجے گئے ٹیکسی پکڑی اور ویلیج گئے۔بارونق جگہ ہے۔ آؤ کچھ پی لیاں ہنستے ہوئے ایک کلب میں گھس گئے تو بڑی مشکل سے ایک کرسی ملی جس پر مجھے بٹھا کر تنویر شاہ اُس ہجوم میں کھو گئے جو انتہائی کم روشنی میں تیز موسیقی کے لے پر ایک دوسرے کے بانہوں میں جھول رہا تھا جھوم رہا تھا چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔15 سال کے کم سن لڑکے لڑکیوں سے لے کر 50-55 سال تک کے مرد و خواتین ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے جلدی ہی تنویر شاہ کو ایک سپینش ساتھی میسر آ گئی اور وہ "ڈو یو بلیو ان لو کم اون ٹل می" گانے پر مست و الست ہو کر ناچ رہے تھے۔نہ جانے کیوں میرے حلق میں اورنج جوس سوکھی روٹی کی طرح پھنسنے لگا تھا اور جب ایک رو میں تنویر شاہ قریب آئے تو میں نے چلنے کا اشارہ کیا اُس نے اپنے پارٹنر سے معذرت کی اور نہ جانے میرے بارے میں اشارے کرتے ہوئے اُسے کیا کہا اُس نے میری طرف دیکھ کر "پور گائے" کہا اور فلائنگ کس سے وِش کیا باہر کھلے ماحول میں آئے تو میں نے سکھ کی سانس لی۔ یہ ہے نیویارک بائی نائٹ باقی ملاقات پر۔

تمہارا علی
نیویارک

براہِ راست

دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، دکن، لاہور، کراچی کی طرح پشاور بھی ایک زمانے سے علم وادب کا گہوارا رہا ہے۔اس زرخیز سرزمین نے اتنی تعداد میں ادیب، شاعر، نقاد، اداکار اور فنونِ لطیفہ کی دیگر اصناف کی قدآور شخصیات اس قدر تعداد میں پیدا کی ہیں کہ اُن کے شمار کے لیے الگ سے ایک کتاب ترتیب دینا ہوگی!

جناب ناصر علی سید اسی علمی، ادبی اور ثقافتی چمن کے ایک ایسے شگوفے کا نام ہے جو گذشتہ چار دہائی سے اپنی ہمہ رنگی اور فہم و فراست سے ایک ایسا چمن آباد کر رہے ہیں جس میں ادب کے ساتھ اخوت، محبت اور بھائی چارے کی فصل اُگ رہی ہے نہ صرف اُگ رہی ہے بلکہ پھل پھول بھی رہی ہے!!

آج کی مجلس اسی باغ و بہار شخصیت کے اعزاز میں برپا کی گئی ہے اور اُن کی قلمی جہات کو پھولوں کے گلدستے کی مانند آپ کی خدمت میں پیش کر کے طمانیت کے ساتھ ایک طرح کی سرشاری بھی ہم پر طاری ہے جس کا اندازہ آپ ہی لگا سکتے ہیں اور ہمیشہ کی مانند نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی کی بنتی ہے!!!

گلزار جاوید

☆ حسبِ روایت اور حسبِ معمول گفتگو کا آغاز بچپن کی کچی پکی یادوں سے کرنا چاہیں گے جس میں گھر آنگن کے مکین اور قرب وجوار کے اعزا کا ذکرِ خیر شامل ہو؟

☆☆ جو بات میں آج بھی سمجھنے سے قاصر ہوں وہ اکوڑہ خٹک (نوشہرہ) جیسے خالصتاً دیہاتی ماحول میں، میری ماں کی، ''شہری بابو'' قسم کی میری تربیت کرنا ہے۔چونکہ ان دنوں والد سے دوستی کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا اس لئے میں اپنی ماں کے بہت قریب رہتا تھا۔میں نہ ان کا پہلا بیٹا تھا اور نہ سب سے چھوٹا، مجھ سے ایک بہن اور تین بھائی بڑے اور ایک چھوٹا تھا۔مگر میری ماں نے بچپن سے لڑکپن تک میرا لائف سٹائل قطعاً مختلف رکھا۔جب میں پانچویں کلاس کے لئے اکوڑہ خٹک کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوا تو سکول یونیفارم ملیشیا کی شلوار قمیص تھا۔پورے سکول میں ایک لڑکا جو پناہ گزین (مہاجر) تھا بس وہی پتلون اور شرٹ پہنتا تھا کہ ان کا عمومی لباس ہی یہی تھا، بس اسی کا سہارا لے کر میری ماں نے مجھے بھی بش کوٹ اور پینٹ سلوا کر دی، جس کی بہت مشکل سے اجازت ملی۔مگر میٹرک تک میں اس غیر دیہاتی لباس میں سکول آتا جاتا رہا۔میری ماں خود کبھی سکول نہیں گئی تھیں لیکن وہ بہت مہذب، رکھ رکھاؤ والی اور بے پناہ محبت کرنے والی، خاندان میں بہت مقبول تھیں۔میں نے اتنی شستہ اور با محاورہ پشتو پھر کسی اور سے نہیں سنی۔صلح کل رویہ رکھنے والی میری ماں سراپا محبت تھی، میں نے شاید اسی لئے کہا ہے کہ

میں اپنی ماں کے بہت ہی قریب رہتا تھا
سو بچپنے سے محبت مزاج میرا ہے

والد صاحب سے میری دوستی تو نہ تھی مگر انہیں کتاب پڑھتے دیکھ کر مجھے بہت اچھا لگتا، ان کی لائبریری میں اردو، فارسی اور پشتو زبان وادب کے ساتھ ساتھ مذہبی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا، جب شام کو وہ حجرے میں گفتگو کرتے تو بہت توجہ سے سنے جاتے مگر ہم بچوں کو بڑوں میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔میں حجرے کے باہر والی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہو کر اکثر انہیں سنا کرتا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے، اس سے پہلے میرے سب سے بڑے بھائی سید پیر محمد شاہ جو پشاور میں جاب کرتے تھے، ہر ہفتے بچوں کی کہانیاں اور رسائل، کھلونا، بچوں کی دنیا، تعلیم و تربیت اور نونہال گھر لایا کرتے، پہلے پہل میری اکلوتی بہن مجھے ان کتابوں سے کہانیاں سناتی پھر جب مجھے حرف جوڑنے آ گئے تو پہلے میں پڑھوں گا کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ہم دونوں سے بڑے بھائی سید اعجاز بخاری مرحوم، ایم اسلم اور نسیم حجازی کے ناول گھر لانے لگے تو بہت اوائل ہی میں ان سے دوستی کر بیٹھا، ایم اسلم کا چشم لیلیٰ غالباً میں نے کوئی پندرہ بیس مرتبہ پڑھا، پھر ہمشیرہ کی سہیلی کے گھر سے بھی چوری چھپے ناول آنے لگے، ان میں سے چھٹی ساتویں کلاس کے زمانے کا پڑھا ہوا انجم پرواز کا ناول برف تلے چنگاری بعد کے زمانوں میں کئی دوستوں کو میں نے زبانی سنایا، اب بھی سنا سکتا ہوں، ذرا ہوش آیا تو پھر والد مرحوم کی غیر حاضری میں ان کی لائبریری سے شورش کشمیری کا چٹان اور ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر سے یک طرفہ محبت کا ڈول ڈالا یعنی غبار خاطر ذرا بھی تعاون پر آمادہ نہ ہوئی پھر بھی کچھ اردو شعر سے شناسائی ہو گئی، اور مشکل نثر اور فارسی عربی اشعار کی نسبت اردو شعروں نے دل میں گدگدی سی شروع کر دی، چنانچہ داغ کا یہ شعر مجھے اسی زمانے سے یاد ہے

ملے جو حشر میں، لے لوں، زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدعا کے لئے

شعر پڑھنے کا اعتبار تو مجھے پانچویں کلاس سے ہی حاصل ہو گیا تھا جب پہلی بار اپنے استاد مولانا راحت گل مرحوم کی لکھی ہوئی تقریر پر گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں ایک کل پاکستان تقریری مقابلہ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔تقریر میں لکھے ہوئے علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کی اشعار آج بھی حافظہ میں موجو ہیں۔گھر کے اسی ادبی ماحول نے سید اعجاز بخاری کو ایک جانا پہچانا اور ہمشیرہ کو فیملی کی حد تک بے حد مقبول پشتو شاعر بنا دیا تو کیا یہ بدذوقی نہ ہوتی کہ میں شعروسخن کی طرف مائل نہ ہو تا۔(لذیز بود حکایت درازتر گفتم)

☆ گھریلو تربیت، دینی تعلیم، دنیاوی تعلیم کے بعد آپ کی شخصیت اور سوچنے، سمجھنے کے انداز میں کسی طور کی دورنگی یا تضاد تو در نہیں آیا؟

☆☆ مجھے نہیں لگتا کہ ایسے گھرانے میں اور اتنے مہربان اور چاہنے والوں

کی انگلی پکڑ کر چلنے کے بعد ایسا کچھ ہونے کی گنجائش باقی رہ گئی ہو۔ ویسے بھی تعلیم دینی ہو دنیاوی ہو یا پھر شعر و ادب کی ہو، یہ شخصیت کو نکھارنے، سنوارنے اور شا ئستہ بنانے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ ان سے ہی انسان سجتا، سنورتا ہے اور اسی سے شخصیت کی تہذیب ہوتی ہے۔ بھلا تضاد کیسا۔

☆ شاعری سے آپ کی ملاقات کس عمر اور ماحول میں ہوئی اور اس کی پرداخت کا ذمہ کس کے سر رہا؟

☆☆ شعر پڑھنا شروع ہی سے اچھا لگتا تھا، سکول میں بزم ادب کے لئے نثر کے ساتھ ساتھ کچھ الٹے سیدھے مصرعے بھی لکھنا شروع کر دیے تھے۔ مگر کالج تک پہنچنے سے پہلے اسے سنجیدگی سے نہیں برتا۔ آغاز پشتو شاعری سے ہوا پھر اردو شعر کی طرف آیا اور جب اکوڑہ خٹک سے پشاور آیا تو ہندکو زبان میں بھی شعر کہنے لگا۔ سچی بات تو گلزار جی یہ ہے کہ یہ زمانہ محض لفظ جوڑنے اور مصرع موزوں کرنے کا تھا۔ مگر شعر واردات نہ بنے تو بات نہیں بنتی، اور جب شعر واردات بنتا ہے تو اس کی پرداخت کسی سینئر دوست، استاد، کتاب اور ماحول سے زیادہ روحانی طور پر وہ کر رہا ہوتا ہے جس نے شعر گوئی کی توفیق عطا کی ہوتی ہے یا جس کیلئے شعر کہا جاتا ہے۔ اسی لئے غالب نے کہا اور میں نے اپنے شعری مجموعہ کے انتساب میں شامل کیا۔

اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

☆ ارسطو شاعری کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ اس میں تخلیق کی قوت ہوتی ہے۔ آپ کا اردو شاعری سے رومانس کس نوعیت کا ہے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ شعر شاعر کے لئے سرشاری لے کر آتا ہے، تخلیق کا کرب اور اور اذیت ناک لمحے بسر کرنے کے بعد جب کوئی ’’مصرع تر‘‘ نصیب ہوتا ہے تو وہ پڑھنے والے کو بھی اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘۔ شاید اسی لئے شاعری کو جادو کی بیٹی کہا گیا ہے۔ شاعری سخت کھردری زمین کا سینہ چیر کر نکلنے والے نرم و نازک پودے کے مشابہ ہوتی ہے جتنی سخت جان اتنی ہی نازک، جس کی خوشبو ہی اس کی تاثیر ہوتی ہے۔ یہ ریاضت، محبت اور ہنر تینوں کا کرشماتی عکس ہوتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ

ریاضتیں ہو مسلسل تو پھول کھلتے ہیں
محبتوں کا شجر ایسا بے ثمر بھی نہیں

☆ آپ کی شاعری میں گھر، گاؤں، شہر، شام، یاد، تنہائی، انتظار، چاند، دن، رات، ہنر اور خسارے جیسے الفاظ کی گردان کسی خاص کیفیت یا زمانے کی نشان دہی تو نہیں کرتی؟

☆☆ ہر لفظ اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے، اس کی اپنی ایک سائیکی ہوتی ہے۔ اور شاعری میں یہ موئے قلم سے لگنے والے سٹروک کی طرح ہوتا ہے، ان سٹروکس سے مل کر جو تصویر بنتی ہے وہ شاعر کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی بھی کرتی ہے اور اپنے عہد کی بے چہرگی، نارسائی اور محرومی کی کہانی بھی سناتی ہے۔ یہ جو ہم گاؤں سے شہروں کی طرف یا ایک شہر سے دوسرے شہر یا دوسرے خطوں کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو اکیلے نہیں ہوتے، ہمارے سامان میں بیتا ہوا وقت، حسرتیں، خواہشات، خواب، زمین چھوڑنے کا دکھ، پیچھے رہ جانے والے کٹھے بیٹھے سارے موسم اور کچھ بہت مہربان چہرے بھی بندھے ہوئے ساتھ چلے آتے ہیں، اس لئے نئے افق کی تلاش لاکھ مستحسن سرگرمی سہی مگر مراجعت سے بھی انگلی چھڑانا ممکن نہیں ہوتا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں شعر کے معبد میں ہوم کمنگ کے احساس سے بھیگا ہوا داخل ہوتا ہوں:

عجیب میٹھی سی چھاؤں میں دن گزرتے ہیں
جہاں بھی جاؤں میرا گاؤں ساتھ ہوتا ہے

میری ایک نظم خسارہ بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

نکل کر گاؤں کی کچی حویلی سے
میں جب کھیتوں سے،
کرنوں سے لدے خوشبو بھرے پیڑوں
بہت آباد کھلیانوں سے
اور شہر خموشاں سے گزر کر
شہر کی جانب چلا تھا تو
بہت ہی زور سے
روتی خزاں کی بارشوں کا پہلا دن تھا۔

☆ آپ کو موسموں کا عاشق بتلانے والے کس موسم کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں؟

☆☆ موسم اور بھیگے بھاگے موسم میرے اندر کے سارے موسموں کو ترو تازہ کرتے اور رکھتے ہیں، بہار کا سرسبز و شاداب موسم بھی میرے اندر دھال ڈالتا ہے اور پت جھڑ کا سنہرا موسم بھی مجھے اتنا ہی گدگداتا ہے، پابلو نرودا نے کہا تھا کہ ’’میں تمہارے ساتھ وہ کرنا چاہتا ہوں جو بہار چیری کے سفید درختوں سے کرتی ہے‘‘ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے یہ کھٹے میٹھے موسم مجھے چیری کا سفید درخت سمجھ بیٹھے ہوں۔

☆ مکالمے کی کیفیت بھی آپ کے ہاں کثرت سے استعمال ہوئی ہے؟

☆☆ خود کلامی تنہائی کی سہیلی ہے اور ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کرنا ان کو اچھا لگتا ہے مگر دیکھا جائے تو یہ بھی ایک غیر محسوس مکالمہ بن جاتا ہے۔ چپ کی بکل مار کر ایک کونہ پکڑ لینا اور بات ہے اور مسلسل بیٹھے رہنا ایک مختلف کیفیت ہے، اس لئے مکالمہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بلکہ میں نے تو اس مکالمہ کی یہ صورت بھی پیدا کی ہے:

آ، ذرا مل بیٹھ کر یہ تجربے بھی بانٹ لیں
میں تجھے تیری سناؤں تو مجھے میری سنا

☆ آپ نے سفر کا استعارا کن معنوں میں برتا ہے؟

☆☆ میرے ہاں اس کی مختلف شکلیں ہیں، یہ سوچ میں تبدیلی کی عکاسی بھی کرتا ہے، ایک ذہنی کیفیت سے دوسری میں داخل ہونے سے بھی عبارت ہو

سکتا ہے۔سفر کا ایک اظہار یہ میں نے یوں بھی بُنا ہے:

یہ اور بات کہ موجود اپنے گھر میں ہوں
میں تیری سمت مگر مستقل سفر میں ہوں

☆ یہ کرب میں مبتلا ہوئے بغیر لکھنے کی اصطلاح بھی خوب ہے؟

☆☆ جی ایسا ہوتا ہے اور اس وقت ہوتا ہے جب آپ کی تخلیق خود آپ کو اندر سے چھوتی نہیں اور آپ اسے کاغذ پر منتقل کر رہے ہوتے ہیں، تب وہ محض لفظوں کا ڈھیر بن جاتی ہے، تخلیق کو کاغذ پر اتارنا ثانوی بلکہ شاید آخری حیثیت کا حامل ہوتا ہے، اس سے پہلے تخلیق کی پرورش اس طرح کرنا پڑتی ہے جس طرح خواجہ میر درد اپنے محبوب کے غم کی کرتا ہے۔

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی، دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

☆ وقت کی تجسیم استعارا ہے، کیفیت ہے یا ضرورت اور یہ تمام وجوہات وکیفیات شعرا کے ہاں ہی دستیاب ہیں یا شاعرات بھی اس رویہ کی حامی ہیں؟

☆☆ دیکھئے ادب میں خانے نہیں ہوتے، جو شعر بُن رہا وہ شاعر ہے، پھر بھی آپ کی تشفی کی لئے کہہ دیتا ہوں کہ وقت کی تجسیم کی کیفیات خاتون شاعر کے ہاں ایک الگ سی معنویت رکھتی ہیں کہ ہر گزرتا لمحہ ان کی سوچ ہی نہیں خدو خال میں بھی تبدیلی لے آتا ہے تو یقیناً ان کی فکر پر بھی اثر انداز ہوگا بشر طیکہ ان کا شعر ان کے اپنے خوابوں کا آئینہ دار ہو۔ (جیسا کہ کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے)

☆ لمحے، چہرے تک تو بات سمجھ آتی ہے، محبتیں سمجھانے والی بات قدرے اُلجھاؤ پیدا کر رہی ہے؟

☆☆ مجھے تو یہ سوال ہی الجھا رہا ہے، شاید یہ اپنے پس منظر سے انگلی چھڑا بیٹھا ہے، محبت بھی زندگی کی طرح ''اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

☆ جو لوگ آپ کو اندیشوں میں ڈوبا شاعر گردانتے ہیں اُن کا روئے سخن کس جانب ہے؟

☆☆ شاعری نامعلوم کی سمت کا ایسا سفر ہے جسے اگرچہ پورے تیقن سے طے کرنے کی سعی کی جاتی ہے، مگر کون جانے کہ کب کہاں کس وقت اور کس موڑ پر یکلخت کوئی ان دیکھی ان ہونی گھٹنا راستہ کاٹ دے۔ یہ ڈر، یہ اندیشے تو ہم سفر رہتے ہیں، مانو یہ کہانیوں کی اس چوتھی کھونٹ کا سفر ہے جو خوف کی پر چھائیوں میں طے ہوتا ہے، میں بھی اس ڈر کی تصویریں بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

دشت کا اندھا سفر ہے اور میں
ایک ان ہونی کا ڈر ہے اور میں
جانے کیا انجام ہو ناصر مرا
ایک یارِ بے خبر ہے اور میں

☆ ایک وقت میں آپ خود خوش ہو سکتے ہیں یا دوسروں کو خوش کر سکتے ہیں۔آپ دونوں کام بیک وقت کیسے انجام دیتے ہیں؟

☆☆ اوہ۔۔۔میرے نزدیک یہ دو نہیں ایک ہی کام ہے۔ یہ لاکھ کلیشے سہی مگر میں اس کو جز وایمان سمجھتا ہوں کہ اصل خوشی کا راز دوسروں کو خوش رکھنے میں ہی پوشیدہ ہے۔اور اگر برائے بحث اسے دو کام سمجھ بھی لوں تو اس کا ایک حل میں نے یوں بھی نکالا ہے:

دوست دن بھر تو میں ہوتا ہوں سبھی کا لیکن
آپ بن جاتا ہوں میں اپنا عدو رات گئے

☆ اردو شاعری پر عشق ومحبت کی بہتات کا الزام ہمیشہ سے لگتا آیا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے وقت کے ساتھ سائنس، فزکس، کیمسٹری اور عمرانیات کو بھی اردو شاعری میں جگہ پانی چاہیے؟

☆☆ یہ جو محبت یا پھر عشق کو شاعری کا محور سمجھا جاتا ہے یہ غلط تو قطعاً نہیں مگر اسے ایک فکری مغالطہ میں بدل دیا گیا ہے۔ جسے فیض کے اس مصرع نے بہت تقویت دی ہے کہ۔'' اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا:: فیض جن دکھوں کی بات کرتا ہے اس کا احساس کسی ایسے شخص کو ہو ہی نہیں سکتا جس کا اوڑھنا بچھونا محبت نہ ہو۔ جو عشق کے نشیب وفراز کو جھیل نہ رہا ہو۔فراز نے کہہ دیا ہے:

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے عنواں جاناں

☆ بظاہر چاک وچو بند اور متحرک نظر آنے والے شعرا عالم خود فراموشی کا ذکر بھی شدومد سے کیا کرتے ہیں؟

☆☆ بس وہ ''بظاہر'' ہی چاک وچو بند نظر آتے ہیں۔۔مصطفٰے زیدی نے کہا ہے۔مرا مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے۔

☆ اچھے بھلے خوشحال، خوش رو، خوش لباس بلکہ خوش خوراک شعرا کے ہاں فیشن کے طور پر جن دکھوں کا ذکر کیا جاتا ہے اُس کا تعلق اُن کی ذاتی زندگی سے ہر گز نہیں ہوتا؟

☆☆ کوئی بھی حساس شخص اپنے گردو پیش سے لاتعلق نہیں رہ سکتا پھر شعر بننے والے تو چنے ہوئے لوگ ہوتے ہیں، زمین زادوں کے دکھ اور مسائل سے کیسے لاتعلق رہ سکتے ہیں، اور یہ شاعری کوئی گنجفہ کا کھیل تو ہے نہیں جس میں لگی بندھی بازیاں (رنگ) اور محدود پتے ہوں۔ یہ کب کس وقت اور کن حالات میں شاعر کو مغلوب کر لے کچھ نہیں کہا جا سکتا، پھر بقول گرو جی (غالب) مضامین تو آتے ہی غیب سے ہیں، کہہ نہیں سکتا پھر بھی شعر میں اگر کچھ بطور فیشن نظر آئے تو وہ شعر نہیں رہے گا۔

☆ پکاسو نے زیادہ معاوضہ طلب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تصویر بنانے میں وقت کم لگا ہے مگر پکاسو بننے میں بہت وقت لگا ہے۔ ناصر علی سید کو شاعر، ادیب، کالم وڈرامہ نگار بننے میں وقت کے علاوہ اور کن عوامل کی ضرورت پڑی؟

☆☆ ناصر علی سیّد کو تو میر جی نے ایک ہی نکتہ سکھایا ہے۔اور ناصر علی سید اسی کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے:

دور بیٹھ غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

☆ جو لوگ آپ کی شاعری کو سچ پر مبنی شاعری گردانتے ہیں اُن کے اشارے کو ہم Keats کے اس بیان کی جانب اشارہ سمجھیں ''سچ خوبصورتی ہے اور خوبصورتی سچ ہے''؟

☆☆ کوئی حرج بھی نہیں ہے کہ کائنات کا حسن ہی سچ ہے، اس کا بنانے والا سچ ہے، اور شاعری اس سچ کی تلاش میں نکلی ہوئی بے چین روح ہے جسے اسی راستے میں سلوک کی منازل تک رسائی حاصل ہونے کے امکانات بھی پیدا ہوتے ہیں، اور شاعری کا منظرنامہ ہی نہیں ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔

☆ کیا آپ برٹرینڈرسل کے Sctructure of universe کی تھیوری سے اتفاق کرتے ہیں گر ہاں تو اپنی جستجو اور تلاش سے باخبر کیجیے؟

☆☆ بس اس حد تک کہ یہ کائنات ایک حیرت سرائے ہے، دیکھنے میں سامنے کی چیز مگر سوچنے میں بلا کی پیچیدہ، اور جتنا سوچئے اتنی ہی الجھانے لگتی ہے، پاس بھی بلاتی ہے مگر کسی سوال کا جواب دینے پر آمادہ بھی نہیں ہوتی۔ پرائے نظریات، مشاہدات اور تجربات کے سہارے کچھ ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے اگر بگ بینگ تک پہنچ بھی جائیں تو پھر بھی ایک بگ کوئچن مارک منہ چڑاتا نظر آتا ہے۔ بے بسی کے اس عالم میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں:

یہ چند سانسیں جو دی ہیں تو اختیار بھی دے
کہ میرے ہونے کا اب مجھ کو اعتبار بھی دے

☆ رابرٹ فراسٹ Unity of Thought میں شاعر ادیب اور تخلیق کار کو جانچنے، پرکھنے کا قائل ہے جبکہ کچھ لوگ تخلیق کار کی شخصیت و فن کو ٹکڑوں میں بانٹ کر پرکھنے کے عادی ہیں۔ آپ اپنے بارے کونسا طریقہ تجویز کریں گے؟

☆☆ میں نے کہا نا کہ قلبی اور ذہنی کیفیات میں یکسانیت نہیں رہتی اس لئے کوئی وحدت تاثر کسی ایک فن پارے میں تو ممکن ہے بھلے سے وہ کوئی ضخیم ناول ہی کیوں نہ ہو، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جہاں فن ارتقا کی منازل طے کر رہا ہوتا ہے وہاں اشیا کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے میں بھی تبدیل آتی رہتی ہے، نظریات میں فرق نہ بھی آئے تو اپروچ میں فرق آ جاتا ہے، سقراط نے کہا تھا کہ میں شاعروں کے پاس ان کی نظموں کے بارے میں پوچھنے گیا ان کو علم ہی نہ تھا۔۔۔ مان لیں بسا اوقات غیب سے آنے والے مضامین تخلیق کار سے فاصلے پر رہنا پسند کرتے ہیں۔

''اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے''

☆ ایک ناصر کاظمی تھا جس نے بحور سے موسیقی کے اسباب پیدا کیے یہاں تک بات سمجھ میں آ گئی۔ ایک ناصر علی سید ہے جس نے میڈیم کو Matter of Fact کے لہجوں سے بہرہ ور کیا۔ یہ آپ سمجھا دیجیے؟

☆☆ فکشن حقیقت کا پرتو ہوتا ہے اور انسانی زندگی کے پیچیدہ تانے بانے بنانے اور تلخ و شیریں رویّوں کو ٹریٹمنٹ دینا ایک خاص الشکل کی متقاضی ہوتا ہے یعنی جو ہے جیسا ہے پر مبنی کہانی میں ہونے نہ ہونے کی کشمکش کے لئے ''جگہ بنانا'' ہی کسی بھی تخلیق کار کا امتحان ہوتا ہے، یہ فیصلہ وقت کے پاس محفوظ ہوتا ہے کہ وہ کہاں تک کامیاب رہا۔

☆ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نظم میں ڈرامے کی تکنیک استعمال کرتے ہیں وہ اس عمل کی تعریف کر رہے ہیں یا تنقید؟

☆☆ بدھا نے کہا تھا کہ لوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانی سننا پسند کرتے ہیں، سو سارے تخلیق کار کہانی ہی سناتے ہیں، نظم اور نثر دونوں کا بنیادی حوالہ کہانی ہے، بس سنانے کی تکنیک الگ الگ ہے، کہانی غزل بھی سناتی ہے لیکن اس کا انداز مختلف ہے۔ نظم اور ڈرامہ بھی کہانی سناتا ہے، ظاہر ہے ان کا انداز مختلف بھی ہوسکتا ہے اور قدرے یکساں بھی اور اگر کسی کی بھی نظم ڈرامے کی سی ادا کے ساتھ سننے والے کو کہیں اندر سے چھو جاتی ہے تو اسے ناکامی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

☆ خاطر غزنوی مرحوم آپ کی شاعری کو داخلیت اور خارجیت کا عمدہ نمونہ گردان کر کن روّیوں کو اُجاگر کر رہے ہیں؟

☆☆ خاطر غزنوی ایک اچھے شاعر ہی نہیں عمدہ محقق و نقاد اور ایک عالم شخصیت تھے۔ انہوں نے شاعری میں جن خارجی اور داخلی عوامل کی بات کی ہے اس سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ شعر کی اساس میں انہی دو معتبر حوالوں کا امتزاج ٹھہرتا ہے۔ اسی کی روشنی میں میرے شعر کا تجزیہ انہوں نے کیا ہے اور اس امتزاج سے وہ مطمئن ہیں اسے میں ان کی محبت اور حوصلہ افزائی پر محمول کرتا ہوں۔ خود بھلا کیا تبصرہ کر سکتا ہوں۔

☆ پروفیسر محسن احسان آپ کی شاعری کو جدید حسیات کا کرشمہ بتلا کر حیرت کا ایک اور در وا کر رہے ہیں؟

☆☆ حیرت کے در وا ہونے کی بھی خوب کہی۔ یقیناً آج بھی ایسا شعر کہا جا رہا ہے جو اپنی لفظیات اور ڈکشن کے حوالے سے روایتی اور شعر برائے شعر گفتن سے زیادہ آگے کی بات نہیں کرتا۔ مگر کوئی بھی سچا شاعر گرد و پیش سے آنکھ بند کر کے شعر نہیں کہہ سکتا، اپنے دور کی حسیات کیسے ممکن ہے کہ اسے نہ چھوئیں۔ میرے شعر میں اگر میرا آج نظر نہ آئے تو میری شاعری ایک بے معنی سرگرمی بن کر رہ جائے گی۔ میرے لئے یہ بات حیرت کا باعث بنتی اگر کسی بھی جینوئن شاعر کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ وہ ابھی تک روایتی شاعری کے سحر میں گرفتار ہے۔

☆ اردو شاعری میں آپ کا مقام احمد فراز، محسن احسان، خاطر غزنوی، یوسف رجا چشتی کی صف میں بجا طور پر ہوتا ہے۔ نثر کے حوالے سے ایک محترمہ نے مرزا غالب، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ آپ کا ذکر فرما کر دبدھا میں ڈال دیا ہے؟

☆☆ سوال کے پہلے حصے میں آپ کی محبت کے لئے ممنون ہوں اور دوسرے حصے میں شاید ایک زمانے میں لکھے ہوئے میرے فکاہیہ کالموں اور انشائیوں کی شگفتہ فضا سے متاثر ہو کر ایک ایسا بیان جاری کر دیا ہے، جس پر یاس

یگانہ کی زبان میں یہی کہا جاسکتا ہے

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

☆ ایک زمانہ آپ کی شاعری کے سحر میں گرفتار ہے جبکہ یوسف عزیز صاحب اشاروں کنایوں میں آپ کی بنیاد افسانے سے جوڑ رہے ہیں؟

☆☆ یوسف عزیز زاہد خود ایک بہت ہی عمدہ اور طرحدار افسانہ نگار ہیں ،ان کا اپنا معتبر حوالہ افسانہ ہے مگر وہ بہت اچھی نظم بھی بنتے ہیں اور غزل بھی عمدہ کہتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ مشتاق شباب کے بعد جدید تر افسانہ کو پشاور میں رواج دینے میں جن دو ڈھائی لوگوں کا نام آتا ہے ان میں ہم دونوں شامل ہیں کہانی ہم دونوں کی پہلی محبت تھی مگر مجھ پر شعر نے کوئی ایسا منتر پھونکا کہ پھر کہانی کی گلی میں پھیرا بہت طویل وقفوں سے لگنے لگا ہے۔ گویا:

جبر ہے یہ موسم کا، ہم نے ان دنوں ناصر
یار کی گلی جانا فرصتوں سے باندھا ہے

☆ یہ ہی صاحب آپ کے ہاں میر و غالب سے استفادے کی جانب اشارہ فرمارہے ہیں؟

☆☆ کوئی مانے نہ مانے مگر سچ یہی ہے، یوں بھی میر و غالب کے جادو سے ان کے بعد کے زمانوں میں بھلا کون بچ سکا ہے، اور پھر میں نے تو اعتراف بھی کیا ہے

غزل میں بات نئی کتنی بھی کہیں ناصر
فقیر میر سے کچھ استفادہ ہے تو سہی

☆ اس الزام میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ حلقہ ارباب ذوق پشاور کے اجلاس میں مشاعروں کے انعقاد کے خلاف رہے ہیں؟

☆☆ یہ قصّہ بھی سن لیجئے، پشاور کے حلقہ ارباب ذوق میں ہمیں آتے جاتے کم و بیش چار دہائیاں گزر گئیں لیکن کبھی مشاعرے کا ڈول نہیں ڈالا گیا تھا، ایک بار فضل حسین صمیم کے گھر میں مجلس عاملہ کے اجلاس میں رضا ہمدانی اور فارغ بخاری کی موجودگی میں تنقیدی نشستوں اور مذاکروں کے ساتھ شعرا و ادبا کے ساتھ شام منانے اور مشاعرہ کی بات چلی تو ’’اس ماہ کی شخصیت‘‘ کے عنوان سے شام منانے کی تجویز تو مان لی گئی، مگر زعما نے شعری نشست کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ حلقہ کی تنقیدی نشستوں کے ساتھ مشاعرہ لگا نہیں کھاتا کیونکہ مشاعرہ میں ہر شعر پر بوجوہ واہ واہ کرنا پڑتی ہے، جب کہ تنقیدی نشست کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ جب تنقید کے لئے غزل پیش کی جاتی ہے تو احباب اچھے شعر پر منہ سے نکلنے والی بے ساختہ واہ کو بھی صرف اس وجہ سے روک دیتے ہیں کہ کسی شعر پر خاموشی اور کسی پر واہ واہ تو ایک طرح سے غیر رسمی تنقید ہوگی۔ سو ہم یہی تربیت لے کر چلے پشاور کا حلقہ روایات پر ہی چلتا ہے ایک دن اچانک حلقہ میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تو یہی باتیں گوش گزار کرتے ہوئے کہا کہ مشاعرہ ایک اچھا انسٹی ٹیوٹ ہے مگر چار دہائیاں قبل مشاعرے کے حوالے سے ہماری تجویز اس وقت کی مجلس عاملہ نے نہیں مانی تھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اب بھی مجلس عاملہ کا اجلاس بلا کر مشاعرہ کی اجازت لی جائے تو پھر کوئی حرج نہیں، مزے کی بات یہ ہوئی کہ وہ مشاعرہ تو ہو گیا البتہ اس کے کچھ عرصہ بعد مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا گیا، میں نے وہاں سات زعما کی موجودگی میں کہا کہ آج اچھا موقع ہے، حلقہ میں نئی روایات ڈالنے کی منظوری لی جائے پہلے میں شعر و سخن کی نشست کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ جسے منظور کر لیا گیا اور یوں حلقہ میں اب گاہے گاہے مشاعرے ہو رہے ہیں۔ اس جرم میں میں اکیلا شامل نہ تھا۔ البتہ اکیلا رہ گیا تھا۔

☆ اردو شاعری میں مشاعروں کی قدیم روایت رہی ہے مگر آج کے مشاعرے شخصی پسند و ناپسند کے باعث متنازعہ ہو گئے ہیں۔ اکثر مشاعروں میں سینئر شعرا کو نوآموز سے پہلے پڑھوایا جاتا ہے۔ دعوت ناموں میں حفظِ مراتب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ آپ کا اس حوالے سے نقطہ نظر کیا ہے؟

☆☆ میر نے کہا تھا کہ

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

اور عام آدمی تک یہ گفتگو مشاعرہ کے ذریعے پہنچتی تھی کیونکہ مشاعرے شعر کو آگے بڑھانے اور اپنے لوگوں تک پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ تھے اور ہیں، جس دور ابتلا میں ہم زندگی کر رہے ہیں اس کا پہلا نشانہ ادارے بن رہے ہیں، کوئی ادارہ محفوظ نہیں۔ یہی حال مشاعرے کے ادارے کا بھی ہے۔ تاہم جہاں تک تقدیم و تاخیر کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ سینئر دوستوں کو اتنا آخر میں بھی نہ رکھا جائے کہ جب ان کی باری آئے تو پنڈال خالی ہو چکا ہو۔ کیونکہ اب مشاعرے میں شریک کم و بیش ہر شاعر کے پاس صرف اتنا ہی وقت ہوتا ہے کہ وہ خود اپنا کلام پڑھ لے اور چلا جائے۔ یہ روش کسی طور پسندیدہ نہیں، دعوت ناموں میں ناموں کی ترتیب پر تو باقاعدہ ’’سر پھٹول‘‘ تک کی جاتی ہے۔ اس لئے منتظمین کو احتیاط برتنی چاہیے۔ ہر چند کہ مشاعروں میں بے تحاشا داد لینے والی غزلیں کاغذ پر برعکس کہانی سناتی ہیں پھر بھی اس ادارے کو چلنا چاہئے۔

☆ نثر سے آپ کا تعلق افسانہ، کالم اور ڈرامے کی اصناف سے ہے سلسلہ وار تینوں محبتوں کا ذکر اور کیفیت بیان فرما دیجئے؟

☆☆ کہانی دل کے قریب ہے، بہت بے چین رکھتی ہے، مگر بہت عزیز ہے، کتنے بھی طویل وقفوں سے اس کے پاس جاؤں، ناراض نہیں ہوتی ہلکی سی گدگدی کر کے خود کو لکھوانا شروع کر دیتی ہے۔ یہ میں کوئی افسانوی بات نہیں کر رہا ہوں، افسانہ لکھنے سے پہلے کی بے چینی کو تو میں کوئی نام دینے سے قاصر ہوں مگر میں نے آج تک کاغذ پر کسی بھی افسانے کا پہلا لفظ اتارنے سے پہلے کبھی کچھ سوچا نہیں ہوتا۔ میرے افسانہ نگار دوست اکثر کہتے ہیں کہ ’’بہت دنوں سے ایک خیال کو افسانہ بنانے کی کوشش کر رہا ہوں‘‘ میں ایسی کیفیت کے لئے ترس گیا ہوں۔ بلکہ مجھے تو علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ جو کہانی مجھ سے خود کو لکھوا رہی ہے اس نے کن وادیوں سے گزرنا ہے اور کہاں جا کر تھم جانا ہے۔ میرے لئے تو افسانے

میں آدھے سے زیادہ مرچکا ہوں

ناصر علی سید

جو لوگ ہمارے دل کے قریب ہوتے ہیں اور ہمیں عزیز ہوتے ہیں ان سے ایک ان کہا سا غیر محسوس رابطہ جاری رہتا ہے اور ان سے ’’دور رہ کر بھی ہمیشہ وہ میرے پاس رہا‘‘ قسم کا تعلق رہتا ہے۔ میرے اس طرح کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے جن سے میری ٹیلی پیتھی چلتی رہتی ہے۔ ایسے ہی ایک دوست کوہاٹ کے شاہد زمان بھی ہیں۔ شاہد زمان ایک خوبصورت شاعر اور دوستوں کے دکھ سکھ کے موسموں میں اپنی محبت اور خلوص نچھاور کرنے والے دوست ہیں۔ شعر وسخن کی محفلوں میں شرکت کے لیے پاکستان اور بیرون ملک آئے دن سفر کرنے والے یہ دوست ان دنوں ایک روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں اپنے گھر اور بستر تک محدود ہیں اور جسے ان کے معالج نے ابھی مزید کچھ ہفتے آرام کا مشورہ دیا ہے گویا ابھی کچھ دن اور وہ دوستوں کی محفلوں سے دور رہیں گے اور ابھی کچھ دن اور مشاعرے ان کی دلکش شاعری سے محروم رہیں گے۔ کیسا کیسا خوبصورت شعر کہہ رکھا ہے شاہد زمان نے:

محبت میں یہی جاگیر افضل
میں چھوٹا ہوں میرے حصے میں ماں ہے

گزشتہ رات منصورہ احمد کا ’’مونتاج‘‘ پڑھتے پڑھتے اچانک مجھے اس کا خیال آیا اور میں نے شاہد زمان کو فون کیا۔ دوستوں کے لیے ہمیشہ سے فکر مند رہنے والے شاہد زمان نے سرسری اپنی طبیعت کا حال سنایا مگر زیادہ تشویش سے انجم یوسفزئی کے بارے میں اطلاع دی کہ وہ بیمار ہے اور پشاور کے حیات آباد میڈیکل کمپلیکس میں داخل ہے اور پھر بہت ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ ’’ناصر! مجھے آج پہلی بار اپنی بیماری کا دکھ ہو رہا ہے کہ میرا یار ہسپتال میں ہے اور میں اس کی خدمت کرنے سے قاصر ہوں۔‘‘ جب وہ یہ بات کر رہا تھا تو مجھے اس کا آنسوؤں سے شرابور وہ چہرہ یاد آ رہا تھا جب اس نے حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس میں مرحوم غلام محمد قاصر کی بیماری کی خبر احباب کو دی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں ابھی اس سے رابطہ کرتا ہوں اور انشاء اللہ اس کی دلجوئی میں کوئی کمی نہیں رہنے دوں گا کہ انجم یوسف زئی بھی یاروں کا یار اور منفرد لہجے کا شاعر دوست ہے۔

مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ ابھی دس دن قبل ہی میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی اسے میرا شعری مجموعہ نہیں ملا تھا وہ شکوہ کناں تھا میں نے اسے جواد کا نمبر دیتے ہوئے کہا کہ کچھ ہی دن قبل میں نے جواد کی وساطت سے بھیجا تھا پھر اس کی جواد سے بات ہوئی تھی مگر ۲۷۔ دسمبر ۲۰۰۷ء کے ملکی سانحہ کے بعد کی ہڑتالوں نے جواد کو کوہاٹ جانے نہ دیا جس کی وجہ سے کتاب بروقت ان تک نہ پہنچی مگر آخری بات اس نے مجھ سے دوبارہ فون کر کے یہی کہی کہ ’’اب ہفتے کو جواد آئے گا تو کتاب مل جائے گی اور ساری باتوں میں نہ اس نے بتایا اور نہ ہی مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ بہت بیمار ہے اور پھر جس دن کتاب کوہاٹ پہنچی وہ پشاور آ کر ہسپتال میں تشویشناک حالت میں داخل ہو گیا۔

یہ ساری باتیں مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی تھیں جب میں نذیر تبسم اور فراز اسے دیکھنے ہسپتال جا رہے تھے نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے اکھڑتی سانسوں کے ساتھ جب بیڈ پر میں نے دیکھا اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کیسا زندہ وطرار شخص کیسی بے بسی اوڑھے ہوئے تھا ماتم زدہ سی اس کمرے کی فضا کو اس کی شریک حیات کے آنسو اس کے کمسن بیٹے کی سسکیاں اور آصف کے کپکپاتے ہونٹوں سے نکلنے والے ٹوٹے ٹوٹے لفظ بہت بوجھل بنا رہے تھے اسے ہلا کر جب میں نے آواز دی تو اس کے چہرے پر ایک خوشگوار سا تاثر انتہائی کم وقت کے لیے آیا اور بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے بلند آواز میں خوشی میں بھیگا ہوا ’’آیئے‘‘ نکلا یہی ردعمل نذیر تبسم کے لیے بھی تھا مگر جلد ہی وہ پھر آنکھیں موند کر بے ترتیب سانسوں کی کشتی کھینے لگا۔ میں بمشکل آنسو ضبط کیے خاموش کھڑا رہا جبکہ نذیر تبسم اور فراز کمرے سے نکل گئے ان کے ضبط کا بندھن ان کے قابو میں نہیں رہا تھا۔ واپسی پر ہم چپ چاپ گاڑی میں بیٹھے تھے کہ نذیر تبسم نے کہا مجھے بہت شدت سے انجم کا شعر یاد آ رہا ہے:

کبھی کبھی میں بہت دور جا نکلتا ہوں
کبھی کبھی مجھے خود کو بلانا پڑتا ہے

اس شعر کی تفسیر بنا وہ بستر پر لیٹا تھا۔ شام کے وقت عزیز اعجاز اسے ملنے گیا تو اس پر جان کنی کا عالم تھا۔ عزیز نے مجھے فون کیا اور پھر بمشکل خود کو سمیٹتے ہوئے کہا ’’ہمارا یار چل بسا‘‘ میرا حلق یکلخت نمک سے بھر گیا اور انجم کی اسی غزل کا شعر ہونٹوں پر رواں ہو گیا:

یہ اپنی ذات بڑا پُر کشش سمندر ہے
ابھر بھی آؤ تو پھر ڈوب جانا پڑتا ہے

انجم یوسفزئی جس نے ایک بہت ہی ہری بھری زندگی گزاری۔ پت جھڑ کی ایک شام روٹھ گیا جب اس کا پہلا شعری مجموعہ ’’دھوپ کی چادر‘‘ کم وبیش تیس برس قبل شائع ہوا تھا اور شوکت واسطی نے پشاور کے اکلوتے پنج ستاری ہوٹل میں اس کی تقریب رونمائی کا ڈول ڈالا تھا تو میں نے اس کتاب پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس کی چند سطریں میں ضرور شیئر کرنا چاہوں گا۔ ’’دھوپ کی چادر‘‘ کا شاعر اس بے جہت اور بے شباہت معاشرے کی بگڑتی صورتحال سے شدید خوفزدہ ہے اس لیے وہ ماضی میں پناہ ڈھونڈنے کے لیے مراجعت یا ہوم کمنگ کا شکار ہوتا نظر آ رہا ہے۔

آؤ باغوں میں تتلیاں پکڑیں
آؤ مل کر فریب کھا لیں ذرا

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ کیجیے

بیکسی کے موسم میں

ڈاکٹر ریاض مجید
(فیصل آباد)

ناصر علی سید کے ہاں وقت کا استعارہ کئی صورتوں میں ظاہر ہوا ہے ان کے مجموعۂ کلام کے عنوان ''شامیں فریب دیتی ہیں'' میں شام بھی وقت کی اکائی ہوتے ہوتے پورے وقت کا استعارہ ہے۔ لمحہ، ساعت، دن رات گزرتے ہوئے ماہ و سال کی اکائیاں ہیں جو قسط در قسط اور تجربہ در تجربہ پہلے شاعر کی حیات میں اُتری ہیں اور پھر اُس کی ہڈیوں میں آگ لگاتی ہوئی کاغذ پر اُتری ہیں۔ بظاہر مجلسی زندگی میں ان شعر پاروں کے خالق کا تصور ایک شگفتہ مزاج شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے لیکن بہ باطن اس شخصیت کے اندر دکھ اور اُداسی کے دو عناصر ہیں جو اس کی تخلیقی تنہائیوں میں صفحات پر ہی ظاہر ہوتے ہیں۔

باہر پھول بہت ہیں لیکن
ویرانہ ہے اندر سائیں
میرے اندر شور مچائے
چُپ کا ایک سمندر سائیں
نہیں ہے ساتھ کوئی بے کسی کے موسم میں
سو رو رہا ہوں مگر میری آنکھ تر بھی نہیں

یہ شعر اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں جہاں پھیلتے ہوئے شہروں کے اندر روز بروز گھٹتی ہوئی تخلیقی تنہائیوں میں زندہ رہنے والے شاعر بے کسی کے موسم میں اپنے اندر کے خاموش سمندروں کو لفظوں کا روپ بخشنے میں مصروف کار رہتے ہیں۔

یہ کارِ ہنر اس انداز میں روتے ہوئے کرنا ہوتا ہے کہ اس میں اس کی پلکیں تر نہیں ہوتیں نہ اس کی عادت ہے نہ اجازت۔

تخلیق شعر کے ساعتوں میں آنسو فنکار کے اندر گرتے ہیں باہر نہیں۔ اندر کی دنیا کا یہ سفر جو بندھے پاؤں کرنا پڑتا ہے شاعر کے وہ تجربے ہوتے ہیں جو شاعر سے اپنے آپ کو کہلوا لیتے ہیں۔ شہر ہنر میں کسی بریدہ دوست کا یہ عمل بقول ناصر فکر کو تجسیم کرنے کا عمل ہے ایک ایسا عمل ہے، جس میں دکھ تحریر تو ہو جاتے ہیں مگر شاعر اس عمل کے کسی مرحلے پر خود کہیں تحلیل ہو جاتا ہے بقول میر تقی میر:

گل میں اس کی کیا کھو گیا نہ لوٹا میر
میں میر میر کہہ ا کو بہت پکار رہا

''شامیں فریب دیتی ہیں'' کی تخلیق کسی ایسے جادو نگر میں ہوئی جہاں کہیں ہنستا کھیلتا ناصر کھو گیا۔ اب کسی شہر مدفون سے بچ نکلنے والا کوئی اور فنکار ظہور پذیر ہوا۔ جواب دل میں غم اور آنکھ میں نم لے کر پھر رہا ہے اور اب جس کی گفتگو میں اسرار ہیں۔

ناصر نے غزلوں اور نظموں دونوں اصناف میں اپنے اُن دکھوں کا اظہار کیا ہے، جنہیں اس نے اپنے معاشرے سے کشید کیا ہے۔ اس کا شعری شعور Poetic consiciouness اپنے اور اپنے اردگرد کے مسائل کو قلمبند کرنے کے لیے اپنی ذات کی نفی بھی کرتا ہے اور اس کا اظہار بھی۔

ناصر علی سید کا مجموعۂ کلام تخلیقی تنوع (Creative Diversity) پر مشتمل ہے۔ ان کی غزل نئی اردو غزل کے مرکزی دھارے کے حوالے سے اپنی معنویت کا اظہار کرتی ہے ان کا لب ولہجہ اگرچہ غزل کی کلاسیکی شائستگی کی بنیادوں پر استوار ہے مگر اس میں غزل کا تازہ تر اظہار (Expression) اور اندازِ زبان (Diction) موجود ہے۔ نئے استعارے جدید علامتیں انگریزی الفاظ کا فطری استعمال اور ایک تازہ تر ماحولیاتی نظام جس میں آج کی غزل پھل پھول رہی ہے ناصر کے ہاں نظر آتی ہے۔

ناصر کی نظموں کے اندر زیادہ تنوع ہے۔ موضوع کا ہیئت کا اور بیان کا۔ ان کا صوتیاتی نظام بھی زیادہ وسیع اور جداگانہ مطالعے کا متقاضی ہے۔ ان کی نظموں میں بیانیہ، رزمیہ، مکالماتی اور وصفیہ کم و بیش تمام مروجہ اسالیب ملتے ہیں۔ ان کی درج ذیل عنوانات کی حامل نظمیں ان اسالیب کی مظہر ہیں۔

انسپریشن، ڈراپ سین، بستی نجام الدین، روٹین، ہائیکو، سین ریو، اردو ٹپے، گلزار کے لیے، کراچی، کیپ گاڈ، پشاور ریڈیو کے لیے ایک نظم وغیرہ۔

یہ نظمیں اپنے اندر موضوعاتی، ہیئتی اور اسلوبیاتی تنوع رکھتی ہیں۔

میری ذاتی رائے میں (میں اس رائے پر اصرار نہیں کرتا) ناصر کی انفرادیت ان کی غزل کی نسبت ان کی غیر غزلیہ شاعری میں زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور اس کا اظہار زیادہ انفرادیت کے ساتھ صفحہ پر اُترا ہے یا یوں کہیے کہ ان تجربات و مشاہدات نے ترسیل فکر کے مراحل زیادہ تازہ کاری سے طے کئے ہیں محفوظ کل کے لیے ایک دعا ناصر کی زندہ رہنے والی نظموں میں سے نمایاں نظم ہے۔ یہ نظم ذات سے شروع ہوتی ہوئی اپنے علاقائی بہاؤ اور استعاراتی وسعتوں میں ملکی اور بین الاقوامی سطح کی ایسی نظم بن جاتی ہے جس کا انگریزی ترجمہ نہ صرف شاعر بلکہ اردو شاعری کے وقار اور اعتبار میں اضافہ کر سکتا ہے۔

یہ نظم تہہ دار معنویت کی حامل ہوتے ہوئے قاری تک اپنے ابلاغ کا رابطہ مکمل کرتی ہے۔ شاعری میں ایسی نظموں کی بہت ضرورت ہے جو انتشار اور بے یقینی کے گرد باد سے آئی ہوئی مصاحر رویوں کی فضا میں ایک بابرکت دن کے طلوع اور ایک یقین آثار تازہ جھونکے کی طرح ہوں۔

یہ نظم اپنے استعاراتی بہاؤ میں ہمیں ایک ایسے گھر کا مکین بنا دیتی ہے جو ہمارا گھر ہوتے ہوئے پوری دنیا کی جگہ لے لیتا ہے۔ میں اپنے تاثرات کا اختتام اس نظم کی اختتامی سطور پر کرتا ہوں۔

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

تلخ نوائی

محمد اظہار الحق

(راولپنڈی)

ناصر علی سید کو میں جب بھی دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ نکتہ اٹھتا ہے کہ پشاور میں ناصر علی سید کی وہی اہمیت ہے اور وہی کردار ہے جو کسی زمانے میں لاہور کے حوالے سے صوفی تبسم، ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری اور اس سے بھی پہلے محمد حسین آزاد کا تھا۔ یہ جو پشاور کی کہکشاں ہے جس کے ستاروں میں محسن احسان، عزیز اعجاز، سجاد بابر، ڈاکٹر نذیر تبسم کا نام آتا ہے (افسوس! غلام محمد قاصر اور یوسف رجا چشتی بچھڑ کر بہت دور چلے گئے ہیں اور محسن احسان برطانیہ جا بسے ہیں) اور اس سے بھی پہلے خاطر غزنوی کا نام تھا تو ناصر علی سید اس کہکشاں کا تابندہ اور کیا ہی رخشندہ ستارہ ہے۔ پشاور کے ادبی اور تہذیبی خاکے میں دل آویز رنگ بھرنے والوں میں وہ ایک نابغہ ہے۔ شہر شہر سنگدل ہوتا ہے اور ہر شہر، شہر ناپرساں ہوتا ہے۔ یہ شاعر اور ادیب ہوتے ہیں جو شہر کو پتھروں کے شہر سے انسانوں کا شہر بناتے ہیں۔ اسی لیے تو شاعر نے کہا تھا:

کوئی رومی کوئی حالی کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی ان کے میناروں سے ہوتی ہے

اہل پشاور کو تبریک کہ ان کے شہر کو اونچے مینار میسر ہیں۔ ان میناروں پر روشنی ہے اور ناصر علی سید ان میں ایک بڑا مینار ہے۔ ''شامیں فریب دیتی ہیں'' جہاں متاثر کرتی ہے اور محظوظ کرتی ہے وہاں پریشان بھی کرتی ہے اور پڑھنے والا اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ ناصر علی سید محبت اور معاملات کا شاعر ہے یا عوام کے مسائل کا۔ یوں لگتا ہے جیسے ناصر علی سید محبت کی طرف بڑھتا ہے تو اسے پیچھے سے خلق خدا کی سسکیوں کی آواز آتی ہے۔ وہ مڑتا ہے لیکن ابھی دو چار قدم ہی اٹھاتا ہے کہ محبت کا کوہ ندا واپس بلا لیتا ہے۔ وہ جو احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

تو ذرا چند گھڑی پار افق پر ستا
میں ذرا دن سے نمٹ کر شب تار آتا ہوں

تو یہی حال ناصر علی سید کا ہے۔ وہ جیسے ہی کہتا ہے:

گھبرا کے مرے شانے پہ وہ جھک سا گیا تھا
جب چاند دریچے کے برابر میں رکا تھا

تو اسے معیشت کے بڑھتے ہوئے گرتھ ریٹ میں عوام کی بدحالی یاد آتی ہے اور وہ کہتا ہے:

ہونٹوں پر مرے دھوپ نے جب پیاس لکھی تھی
اس وقت میں دریا کے کنارے پہ کھڑا تھا

وہ ایک طرف چھت پر لہراتے بادلوں کے ساون بھادوں کا خواب دیکھتا ہے تو دوسری طرف:

ملے گا کچھ بھی نہ تم کو بجز پشیمانی
یہ دور ایسا ہے سب اپنے خواب رہنے دو

لیکن انصاف یہ ہے کہ ناصر نے جہاں محبت اور معاملات کے شعر کہے وہاں مسحور کر کے رکھ دیا اور جہاں زندگی کی حقیقتوں کے پردے چاک کیے وہاں تلخ سنجیدگی لانے میں پوری طرح کامیاب رہا۔ اس نے تغزل کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا:

اس نے میرا بھی حال پوچھا تھا
میں بھی عزت مآب تھا کل شب

ورق کچھ ڈائری میں رہ گئے ہیں
جوانی کو دوبارہ ڈھونڈتا ہوں

وقت کی شاخ سے جھڑے لمحے
ان میں تھا ایک میرا پہلا دن

چلو میں بھول جاتا ہوں چلو تم یاد مت کرنا
چلو اب زعم میں اپنی انا کے سانس لیتے ہیں

تقریب تیری یاد کے کمرے میں بپا بھی
میں صدر بھی سامع بھی تھا خود بول رہا تھا

حیرت ہوتی ہے کہ عشق کی چادر اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر یہی ناصر علی سید جب زندگی کے ہنگاموں میں اترتا ہے تو جیسے دوسرا جنم لیتا ہے دیکھئے اقتدار کے زوال کا کیا نقشہ کھینچتا ہے کیا تیور ہیں اور کیا طنز ہے:

کل تو کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہ دیا
آج لیکن مری سرکار ذرا آہستہ

وقت نے دیکھ لے کیا حال کیا ہے تیرا
اے مرے دوست مرے یار ذرا آہستہ

عالمی سیاست جب سے یونی پولر ہوئی ہے پوری دنیا اٹلانٹک کے اس پار کنٹرول ہو رہی ہے۔ ملکوں کے تاجدار ایک ہی دہلیز پر سر بسجود ہیں۔ قوموں کی تقدیر کے فیصلے کولمبس کی نئی دنیا سے ہو رہے ہیں۔ اس عالمی استبداد کا نشانہ ہم بھی ہیں۔ ہمارا شاعر ان تلخ زمینی حقائق کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور تلخی میں شاعری کی نزاکتوں اور روح فن کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔

دکھاتا دور سے ہے دودھ اور شہد کی نہریں
مگر ان تک پہنچنے کے کبھی ویزے نہیں دیتا

عجب اک زعم ہے اس کو زمینوں پر خدائی کا
مری بستی میں مجھ کو پھولنے پھلنے نہیں دیتا

غریب شہر کا دشمن فقیہ شہر بھی تو ہے
کوئی فتویٰ امیر شہر کے ڈر سے نہیں دیتا

غریب شہر،فقیہ شہراور امیر شہر،تینوں ترکیبوں کا استعمال ایک شعر میں ہوا ہے اور شعر بوجھل نہیں ہوا۔المیہ یہ ہے کہ میں پیشہ ور نقاد نہیں اور میرے کھیسے میں وہ اوزار نہیں جو ہمارے نقاد کاندھے پر رکھے گلی گلی،''منجی پیڑھی ٹھکالو'' کی آوازیں لگاتے ہیں اور میرے پاس زیور طباعت سے آراستہ وہ فارم بھی نہیں جن پر سب کچھ لکھا ہوتا ہے اور صرف خالی جگہوں پر مصنف اور کتاب کا نام بھرنا ہوتا ہے۔اسی لیے اگر آپ کو میرے اس مضمون میں ایسے فقرے نہیں سنائی دے رہے جو آپ کے سر کے اوپر سے گزر جائیں اور جن میں الفاظ کئی کئی من بھاری ہوں تو میں بصد ادب و عجز اعتذار کرتا ہوں اور آخری نکتہ بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ محبت یا سیاست،معاشرت یا معاملات،ناصر علی سید شاعری کرنا جانتا ہے۔لیکن سخن گسترانہ بات یہ ہے کہ اچھا شاعر،اچھا کیوں ہوتا ہے؟یہ آج تک کوئی نہیں بتا سکا۔جس طرح رحم مادر میں پرورش پانے والے بچے کو یہ سمجھانا ممکن نہیں ہوتا کہ دنیا کیسی ہے جس طرح بیٹی سے محروم شخص کو یہ باور کرانا ناممکن ہے کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔جس طرح لغت یہ بیان کرنے سے قاصر ہے کہ پوتے،پوتیاں،نواسے،نواسیاں کس قدر عزیز ہوتے ہیں جس طرح خارج از وزن شعر پڑھنے والے کو دنیا کی کوئی طاقت موزوں انداز میں پڑھانا نہیں سکھا سکتی،دنیا کی پوری تاریخ میں ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ شعر کو وزن میں پڑھنا سکھانے کے لیے یا نا شاعر کو شاعر بنانے کے لیے کوئی مکتب کوئی مدرسہ کوئی ادارہ بنا ہو،اسی طرح میرے لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ ناصر علی سید کے جو شعر میں آخر میں سنانے لگا ہوں وہ مجھے کیوں اچھے لگتے ہیں۔بس یہ اشعار دامن دل کھینچتے ہیں۔ان میں لفظیات،بندش،چُستی،بُنت،مضمون کا ترفع،تغزل سب کچھ ہے اور وہ کچھ بھی ہے،جس کا نام ہی نہیں۔

اپنی سب دعاؤں کو لکھ دیا ہے ساحل پر
اور ٹوٹی کشتی کو پانیوں سے باندھا ہے
خواب کے جزیروں میں بے اماں ہواؤں نے
کج ادا چراغوں کو وحشتوں سے باندھا ہے
مضطرب سے لمحوں میں ہم نے دل کی ٹہنی پر
ایک زرد سا پتہ انگلوں سے باندھا ہے
کس جیت کی امید پہ زندہ رہے کوئی
ہے کار محبت میں خسارہ ہی خسارہ

جوں جوں یہ شعری مجموعہ ہم پڑھتے ہیں نشہ ہے کہ گہرا ہی ہوتا جاتا ہے۔بند قبا ہیں کہ کھلتے ہی چلتے جاتے ہیں۔

- بقیہ -

ادب کے اطراف

شاعر و ادیب،ادب کے اُستاد اور ادب کے قاری ہونے کے ناطے وہ خود کو محض میدانِ ادب تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ادب کے ساتھ ساتھ وہ پورے ماحول،معاشرے،سماج،مذہب،سیاست،معیشت،تعلیم،سائنس،تاریخ غرض ہر موضوع پر خاص عبور رکھتے ہیں اور کسی موضوع پر ان کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی بلکہ یہ تمام موضوعات ان کے کالموں میں تازہ پھولوں کی پتیوں کی مانند بکھرے پڑے ہیں۔وہ تمام موضوعات پر ایک بیدار مغز،بیدار حواس اور شاطر فنکار کی طرح گہری نظر رکھتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کو تجربات کی بھٹی میں نکھار اور سنوار کر ادب کے رنگین غلاف میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں جو آج کے قاری کے ذہن کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی مانند ثابت ہو کر ان کے فکر و وجدان میں گہرے غور و فکر کی زبردست لہر دوڑا دیتے ہیں۔

''لیکن ہمارا قصہ بدل رہا ہے'' میں وہ فرماتے ہیں:

''جب عشق جذباتیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تہذیب کے دیئے جلانے لگتا ہے تو بسا اوقات انسان کی چیخیں نکل جاتی ہیں مگر اس چیخ کی آواز نہیں ہوتی کیونکہ چیخ اس گنبد میں گونجتی ہے جس کے سارے دروازے انسان کے اندر کی طرف کھلتے ہیں۔''

''دکھ کے وقت نے کرتب مداریوں والے'' میں کہتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ اپنے حصے کا کام مکمل کر کے عزت و آبرو سے گھر لوٹ آنا ایک آبرومندانہ عمل ہے۔''

اور اس طرح کے بے شمار انمول فکری زاویے اُن کے اس گلشن میں بکھرے پڑے ہیں۔اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے میں یہ ضرور کہوں گی کہ چند دہائیاں پہلے ادب و صحافت کے بیگانگی کے جو غلط تصورات بعض لکھاریوں نے قائم کیے تھے یہ کتاب نہ صرف اُن بے معنی تصورات کا زبردست توڑ ہے بلکہ اس کتاب نے ادب و صحافت کے مابین جو سچا پکا اور خالص رشتہ قائم کیا ہے وہ رہتی دنیا تک ادب و صحافت کی تاریخ میں ناصر علی سید کے اس کارنامے کو سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

ناصر کی نثر کا بنیادی عنصر

واصف حسین واصف

(نیویارک)

میں نے ناصر علی سید کے چند کالم کبھی پڑھے تھے۔ان رسالوں کے نام بھول گیا جن میں یہ کالم شائع ہوئے تھے مگر ناصر کا اندازِ تحریر یاد رہ گیا۔ اب ناصر سے ملاقات ہوگئی ہے تو ان کے اندازِ تحریر کی طرح ناصر بھی یاد آ جائیں گے۔ابراہیم جلیل جب حسرت موہانی سے ملے تو انہوں نے سوچا تھا کہ ایسے ہوتے ہیں حسرت موہانی؟اور جب میں ناصر سے ملا تو میں نے سوچا کہ ناصر علی سید ایسے ہی ہوتے ہیں ایسے ہی ہونا چاہیے۔جیسے اپنے کالموں کے اندر ہیں۔ قصص الاولیاء کے مصنف کی طرح میرے اندر بھی ایک مائی تھالوجی ہے۔میں نے اس مائی تھالوجی سے رجوع کیا تو میرے ذہن میں ایک واقعہ اُبھر آیا کہ خدا نے جبرائیل کو طلب کیا اور فرمایا کہ ہم نے کائنات تخلیق کر دی ہے اور اس کائنات میں ایک گروہ کو شاعر اور ادیب ہونے کی ذمہ داری سونپ دی ہے۔یہ کرب لے جاؤ اور یہ ''کرب'' اس گروہ میں بانٹ دو۔جبرائیل ''کرب'' لے کر اس گروہ میں آئے اور اس گروہ میں تقسیم کر دیا۔اس گروہ کے کچھ لوگ کرب لے کر ہی اس دنیا میں آئے اور کچھ اپنے حصے کا کرب وہیں چھوڑ آئے۔ناصر نے نہ صرف اپنے حصے کا کرب اٹھایا بلکہ وہ کرب میں مبتلا ہوئے بغیر لکھتے ہیں۔یہ جو کرب میں مبتلا ہو کر لکھتے ہیں وہ بھی دو قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ایک گروہ نے اس بات پر سوچا کہ یہ کائنات جو بگڑ بگڑ کر بنتی ہے اس میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔اور جون ایلیا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کائنات جو چھ دن اور چھ راتوں میں بنی ہے اتنی عجلت میں یہی ممکن تھا دوسرے گروہ نے دکھ کے مارے انسانوں کے آنسوؤں کو پونچھنے والوں کو اپنی آنکھیں بھی پرنم رکھنی ہوتی ہیں ناصر علی سید کا تعلق اسی قبیلے سے ہے۔وہ شریک غم ہو تو غمزدہ بھی ہوتا ہے۔میں نے کوہاٹ کی Mcqueen Lines میں دو سال نظم و ضبط کی زندگی سے آشنائی میں گزارے ہیں اس وقت مجھے اپنی وہ آوارگی بہت یاد آئی جو راولپنڈی نے زمانہ طالب علمی میں مجھے دکھائی تھی۔گورنمنٹ کالج کوہاٹ کے ایک پروفیسر نے مجھے بتایا کہ کوہاٹ میں بزم آرائی کو شاید جگہ نہ ملے مگر ایک قلم ساز کے ڈیرے پر کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں جو اردو بولتے ہیں۔میں نے جب راولپنڈی کو خیر باد کہا تو میں اپنا اش اورق وہیں بھول آیا۔پنجاب میں لوگ لفظ کے پھول سے دو پنکھڑیاں توڑ دیتے ہیں قلم ساز کے ڈیرہ پر وہ لوگ ملے جو لفظ کو اتنا سنبھال کر بولتے کہ پھول سے ریشم بھی نہیں گرتی تھی۔ان سنگلاخ زمین کے باسیوں کو یہ احتیاط کہاں سے ملی ہے اس کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہوں مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ناصر علی سید لفظ کو پھول کی طرح برتتے ہیں اس کی شبنم جمع کرتے ہیں اپنے آنسو ملاتے ہیں۔اور پھر اس محلول میں اپنا قلم ڈبوتے ہیں اور لکھتے ہیں تبھی تو مجھے ایسا لگا کہ ناصر کی تحریر میں پھولوں کی باس شبنم کی خنکی اور غم کی لہریں موجود ہیں۔لفظ کو غم اور محبت سے ڈبو کر استعمال کرنے والا ناصر علی سید صاحب اسلوب ادیب ہے اس کی خبر جن کو ہے وہ یہ بات ضرور کہیں گے کہ لاہور کو عطاء الحق قاسمی مبارک ہو۔ناصر علی سید عجیب انسان ہے اس جگہ کھڑا ہو جاتا ہے جہاں دیوار گری ہو اور روتا ہے روتا ہے کہ دیوار کے تلے سایہ دب کر مر گیا۔پھر اور روتا ہے کہ دیوار کے ملبے کے نیچے سائے کے متلاشی مسافروں کے آسرے بھی دفن ہو گئے۔شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ سخن فہمی محفلوں کی واہ واہ سے آگے نہیں بڑھتی حالانکہ اس بات پر غور ہونا چاہیے کہ کسی تخلیق کار نے کوئی شعر اور ادب پارہ کس کیفیت میں تخلیق کیا۔میں اس بات پر غور کرتا ہوں کہ ناصر علی سید کیوں لکھتا ہے اور کیسے لکھتا ہے تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ زمانہ اگر اپنی عمومی رفتار سے آگے چل کر بدل جائے تو یہ تبدیلی کسک دیتی ہے اس تبدیلی کو نیرنگی زمانہ بھی کہتے ہیں لیکن جب ہم اپنی رفتار کو زمانے کی رفتار سے بڑھاتے ہیں تو بہت سی چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں اور خاص طور پر اقدار۔اس انقلاب پر جو ہم اپنے ہاتھوں سے لے کر آتے ہیں اس پر رونا بہت ضروری ہو جاتا ہے اور ناصر اس ضروری کام کو کرنے میں کبھی دیر نہیں لگاتا اسی لیے ناصر نے بچپن میں تلوار کی نوک پر ہاتھ رکھا اور پھر اپنی زندگی اس تلوار کی دھار پر چل کر گزاری جو وقت کی رفتار کو بدلنے والوں نے بنائی تھی سو اگر آپ صاحب دل ہیں اور اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہم وقت کی رفتار سے تیز بھاگ رہے ہیں تو پھر ناصر کے کالم ضرور پڑھیے اور محسوس کیجیے کہ ناصر علی سید کا سلیقہ چاہیے۔اردو میں تدریسی تنقید میں شاعر اور ادیب کو ٹکڑوں میں کاٹ کر اور حصوں میں بانٹ کر پرکھا جاتا ہے مگر رابرٹ فراسٹ Unity of Thought میں تلاش کو تنقید کا اہم حصہ قرار دیتا ہے۔یہ سوال ناصر علی سید سے نہ پوچھا جائے کہ وہ کیوں لکھتا ہے اس سوال کا جواب تنقید نگار کو تلاش کرنا ہوتا ہے محفل میں اگر ڈاکٹر اشرف سہیل موجود ہوں تو فلسفے کو ہاتھ لگاتے ہوئے انگلیاں جلنے لگتی ہیں۔لہٰذا برٹرینڈ رسل کے حوالے سے بات کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہوں رسل کہتا ہے تخلیق کار یزداں کے اس خیال کی تلاش میں ہے جو Sctructure of Universe کو مکمل کرتا ہے سو شاعر اور ادیب دراصل اس خیال یزداں کی تلاش میں ہیں جو کائنات کو مکمل کر دے اسی وجہ سے شاعر اور ادیب کا اپنے زمانے اپنے Environment سے اختلاف ہوتا ہے۔ناصر علی سید کا بھی اپنے زمانے اور اپنے Environment سے اختلاف ہے۔اس اختلاف کا تعلق ماضی،حال اور مستقبل کے حصے سے ہو سکتا ہے جو نظر آ جاتا ہے۔ناصر علی سید نے بحیثیت کالم نگار حال کو چن لیا ہے۔کالم نگار عام طور پر حال میں ہی گفتگو کرتا مگر ناصر علی سید کو معلوم ہے کہ لوگ ان چیزوں کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں جو بدلی نہیں جا سکتیں اور ان کو نہیں بدلتے جو بدلی جا سکتی ہیں۔لہٰذا ناصر کے تمام کالموں میں حال اس کار حیات سے گفتگو ہے جو بدلی

جاسکتی ہے اور Durable ہے ناصر کی تمام تحریریں جن کو کالم کہا گیا ہے اسی نقطے کے گرد گھومتی ہیں۔ ادب کے اطراف میں جناب محمود شام نے جو کچھ لکھا اس نے خاص طور پر مجھے متوجہ کیا۔ محمود شام نے کالموں کو ان کی اصلی روح سے الگ کر کے تدریسی تنقید کے اصولوں کے تحت تحریر کو کاٹ کر اور بانٹ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ صحافی ہمیشہ عجلت میں رہتا ہے دن کی خبروں کو اور شام کی خبر شام کو دیتا ہے مگر دن کی تپتی خبر اور شام کی سسکتی خبر کے اطراف میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس پر بعد میں سوچتا ہے اس دوران خبر دفن ہو چکی ہوتی ہے مگر تحریر خبر نہیں ہوتی ہے تحریر میں شاعر یا ادیب کا خون شامل ہوتا ہے اس خون کی Chemistry کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ خون میں روح کی خلش کے کتنے دکھ گردش کر رہے ہیں۔ گوپی چند نارنگ کی طرح محمود شام نے بھی کتاب میں زمین کی خوشبو تلاش کی ہے حالانکہ دنیا کا کوئی تخلیق کار اپنی مٹی سے جڑے بغیر کچھ تخلیق نہیں کرتا اور وہ جو اپنی مٹی سے جڑا ہوا اس کے اندر مٹی کے وہ دکھ تلاش کرنا بہت ضروری ہوتے ہیں جو تخلیق کار کو بے چین کیے رکھتے ہیں۔ اب اگر ناصر علی سید معاشرے کے اس رویے سے پریشان ہے کہ ماؤں کو اپنے سوالوں کے جواب کس طرح ملتے ہیں وہی سوال جو ماؤں نے خود کھولے اور ناصر علی سید یہ کیوں لکھتا ہے کہ نوجوانی میں لوگ اپنی بیوی کے وفادار رہنا چاہتے ہیں مگر رہ نہیں سکتے بڑھاپے میں بیوی کا وفادار نہیں رہنا چاہیے مگر بے وفائی کر نہیں سکتے ان گتھیوں کو سلجھانا تنقید نگار کے لیے ضروری اور اہم ہو جاتا ہے۔ تنقید نگار کتاب میں وہ پڑھتا ہے جو پس کتاب ہوتا ہے۔ فراز جس کو Teen Agers کا شاعر کہا گیا ہے میں نے کلام فراز دیکھا تو مجھے محسوس ہوا فراز ہجر کا شاعر ہے اور اسے خود اپنا وصل بھی محسوس نہیں ہوا اور ٹی وی پر انور مقصود نے جب فراز کے مجموعہ کلام ''تنہا تنہا'' کو لہرا کر یہ کہا کہ میں نے ان کو کبھی تنہا نہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ مجھے انور مقصود کی بصیرت اور بصارت دونوں کو شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ لوگ اپنے بچوں کے نام سوچ سمجھ کر رکھتے ہیں ناصر علی سید نے اپنے کالموں کے عنوان بہت سوچ کر رکھے ہیں۔ کالم کے عنوان اور کالم کے Material کے درمیان فاصلہ نہیں رکھا۔ کہیں بین السطور کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بین السطور لکھا مگر وہ کبھی نہیں لکھا جو پیشانی پر شکنیں ابھار دے۔ ادب کے اطراف میں کہیں مولانا فضل الرحمٰن اور ضیاء الحق کا ذکر بھی آیا مگر ذہن پر یا لبوں پر ناگزار کے دست آزر کو بت تراشنے کے لیے سنگ مرمر تو ہم نے دیا تھا۔ ادب کے اطراف میں آخر آخر ناصر علی سید نے ٹی وی ڈراموں کا ذکر کیا ہے جس سے وہ خود بھی متعلق رہے۔ ان ڈراموں اور ان سے متعلق افراد کا ذکر کرتے کرتے ناصر علی سید کے قلم سے یہ جملہ بھی نکل گیا ڈراموں سے بے زاری بڑھتی جا رہی ہے مجھے نہیں معلوم کہ اس کی خبر اصغر ندیم سید کو ہے یا نہیں یا حسینہ اس خبر پر کیا تبصرہ کرے گی مگر بات سچ ہے اور تجزیے کو پیش کرنے میں تردد کیسا کہ ڈرامہ نگار نے جب لفظ فروخت کرنا شروع کر دیے تو معیار کی قربانی دینی پڑی۔ ناصر علی سید نے ادب کے اطراف میں ملی صف میں رفتگاں اور گزشتگاں کو بٹھایا ہے ان کا تذکرہ بہت محبت سے کیا ہے دوستی کے بھرم قائم رکھے ہیں۔ یہ سارے کالم رفتگاں اور گذشتگاں کی محبت میں ہی نہیں بلکہ کچھ اس احساس کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ ان مرحومین کی ادبی فعالیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ خاطر غزنوی، محسن احسان، فارغ بخاری، فراز اور دیگر اصحاب کی وہ کہکشاں ہے جو اپنے زمانے کا غرور تھے۔ ناصر کی ادب دوستی اور ادیب دوستی اس کی تحریر سے عیاں ہے۔ پچھلے اجلاس میں ناصر علی سید نے دو غزلیں سنا کر اپنے قد کاٹھ کا اعلان کر دیا تھا میری خواہش تھی کہ ان کا کلام ملتا تو شاعر اور شاعری پر گفتگو ہوتی۔ ناصر نے ادب کے اطراف میں جابجا اشعار کا خوبصورت استعمال کر کے اپنے ذوق شعری کا اعلان بھی کیا ہے۔ نثر نگاری میں احساس کی جو شدت نظر آتی ہے یقیناً ان کی غزل میں بھی اس کا دخل ہوگا۔ مگر نثر نگاری میں جمالیات کو ناصر علی سید نے بہت جانفشانی سے برتا ہے۔ اردو ادب میں صاحب اسلوب نثر نگار نہیں ملتے یا کم ملتے ہیں۔ یہ شعر نثری شاعری سے کم نہیں ہیں۔ ناصر علی سید نے اپنا خون دل صرف کیا ہے اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ نثر لکھنے میں ناصر نے دلوں کے لہجے میں گفتگو کی ہے مٹھاس اور دردمندی کے ساتھ۔

ڈراپ سین

ہرلڑکی کا اپنا موسم
اپنے بادل
اپنی بارش
اپنے دکھ سُکھ
ہرلڑکی کا اپنا میت
ہرلڑکی کا اپنا آنگن
اپنی اُلجھن
اپنی سلجھن
اپنی سوچیں
اپنی باتیں
اپنی رَسمیں رِیت
ہرلڑکی کا اپنا کمرہ،
اپنا تکیہ اپنے خواب

○

ادب کے اطراف میں

پروفیسر خالدہ ظہور

(نیویارک)

تقریب تیری یاد کی کمرے میں بپا تھی
میں صدر بھی، سامع بھی تھا، خود بول رہا تھا

اس شعر کے خالق ناصرؔعلی سید کا کمال ہر بات کو نئے زاویے سے دیکھنا اور نئے مفہوم اخذ کرنا ہے۔شاعر، کالم نگار، افسانہ نگار، استاد اور دانشور ناصر علی سید کے کالموں کی کتاب ادب کے اطراف میں خوبصورت اور برجستہ نثر کا نمونہ ہے۔کتاب ہاتھ میں لیتے ہی قاری اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ناصر علی سید کی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ان کے ہر گرم وسرد کا ساتھی بن کر دبستان پشاور کی تخلیقی فضاؤں میں اڑتا چلا جاتا ہے۔یوں بھی حرف کا رشتہ دنیا کے سارے لکھنے والوں کو یکجا کر دیتا ہے۔اس لیے تو بہت دور سے آیا یہ مہمان بہت مانوس ہے اور شناسا لگتا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کے اور ہمارے دکھ سکھ سانجھے ہیں یہ بھی ضرور صبح کاذب کے نور لمحوں میں جاگتا ہوگا اور رات کے پچھلے پہر کسی ان دیکھی بیقراری سے خوابوں سے ہمکلام ہوتا ہوگا ان کا تعارف ان کی عزیز اور شاعری ہے جو شخص ناصرؔعلی سید سے ملنا چاہتا ہے وہ ان کی کتابیں پڑھ کر ان سے ملاقات کر سکتا ہے جو ان کی شخصیت کا بہت موثر اور سچا اظہار ہے۔ناصرعلی سید نے ہی ایک جگہ لکھا ہے کہ جب احمد فراز انگریزی کے جواں مرگ شاعر جان کیٹس کی قبر پر گئے تو ان کی آنکھیں بھر آئیں اور انہوں نے کہا:

کیٹس کی قبر پہ پہنچا تو بھر آئیں آنکھیں
اس جواں مرگ سے جیسے تھی شناسائی بہت

قلم ہاتھ میں رکھنے والوں کے درمیان خود بخود محبت و یگانگت کا ایسا رشتہ وجود میں آ جاتا ہے کہ سب ایک ہی قبیلے کے افراد لگنے لگتے ہیں۔ناصرؔعلی سید کی تحریروں کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں شروع سے آخر تک ایک شاعر بولتا دکھائی دیتا ہے وہ سیاسی اور سماجی حوالوں کو بھی شاعرانہ نفاست کی چادر اوڑھا دیتے ہیں اس چادر سے بہت سی تلخ اور ناگوار باتوں کا چہرہ چھپ جاتا ہے اور قاری ایک خوشگوار ماحول میں ان کی تحریر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اپنے آبائی شہر پشاور جو کہ ان کا جان وجگر ہے کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لفظوں کا انتخاب دیکھئے۔

جب بھی آندھی چلتی ہے یا دو بوندیں بادلوں کی چھاگلوں میں سے چھلک پڑتی ہیں تو ماضی کا یہ طرحدار شہر گڈی کاغذ کی مثال بن جاتا ہے اور شہر کے حاکموں کے اخباری بیانات کاغذ کی کشتیوں کی طرح یہاں وہاں تیرنے لگتے ہیں۔

ایک اور کالم میں اپنے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھے ہیں۔

''ان دنوں ابھی دھوپ نے آنکھیں دکھائی نہیں ہوتیں کہ مہربان ہوائیں کہیں سے بادل لے آتی ہیں اور پھر تازہ ہوا بہار کی دل کا ملال لے گئی والی کیفیت چھا جاتی ہے ابھی ہوائیں خوشبوؤں سے لدی ہوئی ہیں اور چاروں اور سبزہ آنکھوں میں خواب بھرنے پر مامور نظر آتا ہے۔مگر یہ سب کچھ انجوائے کرنے نہ گردش دوراں دیتی ہے نہ فکر جاں کہ غم جاناں میں گندھی ہوئی ہے پھر بھی کبھی کبھی اچھے موسموں میں شہر سے باہر جانا مشامِ جاں میں تازگی بھر دیتا ہے۔

ناصرؔعلی سید کی ایسی کئی تحریریں ہیں جن کو پڑھ کر قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کا شاعرانہ وژن کہیں بھی ان کے کندھے سے ہاتھ نہیں اٹھاتا۔وہ جو کچھ دیکھتے ہیں ایک شاعر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ بیان کرتے ہیں۔ایک شاعر کے قلم سے بیان کرتے ہیں۔یوں بھی ناصرؔعلی سید کے کالموں میں اشعار کی فراوانی ان کے سلجھے ہوئے نفیس شعری ذوق کی عکاسی کرتی ہے اساتذہ کا کلام ہو یا لہجے کی شاعری دونوں ان کے نوک قلم پر ہیں۔ناصرؔعلی سید کی تحریر کی پرتیں جب کھلتی جاتیں ہیں تو ادب کا اچھا قاری جان لیتا ہے کہ پس تحریر ایک افسانہ نگار بھی چھپا بیٹھا ہے۔خوبصورت لفظوں سے لبجے مرصع فقرے ناصر صاحب کچھ اس طرح لکھتے ہیں۔

ادھ کھلے دروازے کا فائدہ یہ ہوا کہ جب نور کا تڑکا لگا تو سب سے پہلے کمرے کے باہر کے لان میں موجود ایک بہت ہی خوبصورت سفید گلاب نظر آیا جس نے میری صبح کو خوبصورت بنا دیا۔مجھے وہ گلاب کا پھول یاد آیا ہے جسے رات گئے ناصرؔعلی کاظمی اور اے حمید نے دیکھا تھا اور جس کی وجہ سے اردو ادب کو ایک خوبصورت افسانہ اور عمدہ غزل میسر آ گئی ہے اس غزل کو نور جہاں نے گا کر مزید یادگار اور دوآتشہ بنا دیا اور جو ایبٹ آباد سے نتھیا گلی تک میرے اندر دھمال ڈالتی رہی۔

بیٹھ کر سایہ گل میں ناصرؔ
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

بے شمار لوگ لان میں کھلے پھولوں کو دیکھتے ہیں مگر ان کے پاس ناصرؔ علی سید کی نگاہ نہیں ہوتی وہ لطیف حسیات نہیں ہوتیں جو اندر کی دنیا میں دھمال ڈال دیں ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔''جب میں اداس ہوتا ہوں تو میرے چاروں طرف ایک مہربان سی دھند چھا جاتی ہے۔آنکھوں میں دھواں بھر جاتا ہے۔''روزمرہ کے معمولی واقعات میں رمزیت اور تہہ داری تلاش کرنا اور ان کو افسانوی انداز میں بیان کرنا بڑی ریاضت اور تپسیا مانگتا ہے۔ایک مرتبہ کسی خاتون نے مشہور مصور ''پبلو پکاسو'' سے کہا میری بڑی خواہش ہے کہ آپ میری تصویر یا سکیچ بنائیں۔پکاسو نے فوراً پنسل کاغذ لیا اور تصویر بنا کر خاتون کے سامنے رکھ دی اور بھاری

معاوضہ طلب کیا خاتون نے کہا تصویر بنانے میں تو بہت کم عرصہ لگا معاوضہ اتنا زیادہ کیوں؟ پکاسو نے جواب دیا تصویر بنانے میں تو بے شک چند منٹ لگے ہیں مگر پکاسو بننے میں بہت وقت لگا۔

ناصؔر علی سید کالم کے مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے ایک داستان گو کی سحر طرازی بھی رکھتے ہیں۔ کبھی کبھار یوں لگتا ہے کہ عہد کا یہ لکھاری کسی الف لیلوی داستان کا وہ کردار ہے جو ماضی کی غلام گردشوں میں گھوم رہا ہے یا پھر ہم پر امن کی ''باغ و بہار'' کے فقرے، جملے پڑھ رہے ہیں۔ مثلاً ایک کالم میں لکھتے ہیں۔ ''سوان دن جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر تھی سب احباب نے میجر عامر کے پرسکون کاشانے کے صدر دروازے پر ایک دوسرے کو الوداع کیا۔ آسمان پر مبارک مہینے رجب کی تیسری رات کا چاند مسکرا رہا تھا۔'' ایک اور نمونہ تحریر دیکھئے۔

''نامعلوم کی سمت کا چوتھا کھونٹ سفر کو محض اس وقت نامعتبر بناتا ہے جب مسافر چپ سادھ لیتا ہے۔ یہی چپ مسافر کو پتھر اور سفر کو لاحاصل بناتے ہوئے منزل کھوٹی کر دیا کرتی ہے۔'' ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بس پشاور کے چاروں اور پشاور ہی پایا جاتا ہے۔''

اس قسم کے جملے لکھنے کا ہنر صرف وہ شخص جان سکتا ہے جو ہمارے کلاسیکی ادب کی پوری روایت سے واقف ہو اور ہمارے ادبی کلچر کی نس نس سے آشنا ہو۔ اسی لیے ناصؔر علی سید کے کالم اپنے قاری سے پختہ ادبی شعور کا تقاضا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہیرے کی قدر ایک جوہری ہی جان سکتا ہے ایک باذوق قاری بھی ان کے جملوں کی کاٹ اور ہنرمندی کی داد دے سکتا ہے۔ بقول مرزا رفیع سودا:

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے سے

ناصؔر علی سید کے کالم صرف اپنی ادبی قدر و قیمت کے اعتبار سے ہی اہم نہیں ان میں عصر حاضر کا گہرا ادراک اور سیاسی شعور بدرجہ اتم موجود ہے وہ فسطائی طاقتوں کے جابرانہ رویوں کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہتے ہیں۔ عالمی نظام کی بدلتی ہوئی اقدار کے حوالے سے وطنِ عزیز میں جو تحفظات پائے جاتے ہیں ناصر صاحب کا قلم بڑے نڈر انداز میں ان کی نمائندگی کر رہا ہے۔ موضوعات کا تنوع ناصؔر علی سید کے ہاں کثرت سے ہے۔ دنیا کا کوئی بھی موضوع خواہ وہ شعر و ادب ہوں سیاست کے خارزار ہوں یا سماجی معاملات ان کا دریائے ادب ہمیشہ طغیانی پر رہتا ہے اور اس میں تلاطم بپا رہتا ہے اپنے ایک کالم میں بھانت بھانت کے ٹی وی چینلز کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''اخبارات کا لہجہ لاکھ دھیما سہی مگر برقی کھڑکیوں پر شور بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کوئی ایسی خبر چلائی جائے کوئی ایسا ٹاک شو ترتیب دیا جائے جس کا شور روئے زمین تمام ہو کی سی خاصیت رکھتا ہو۔ مگر یہ طے ہے کہ اس ملک خداداد پاکستان کے بارے میں لوگوں کی رائے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ کیونکہ داغستان کے شاعر رسول حمزہ توف نے کہا تھا کہ جب کسی شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ تو وہ اپنا شناختی کارڈ اور اپنی سفری دستاویز پیش کرتا ہے مگر جب کسی سماج کسی قوم سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کون ہے تو وہ اپنے دانشور، اپنے فنکار اور اپنے سیاستدان پیش کرتی ہے کہ یہ میری شناخت ہیں۔ یہ میرا چہرہ ہیں۔ اور ہمارا یہ چہرہ ان برقی کھڑکیوں کی بدولت بہت بگڑ چکا ہے۔''

ناصؔر علی سید پشاور کی ادبی محفلوں کے روح رواں ہیں جان محفل ہیں بطور استاد اپنے شاگردوں میں بہت مقبول ہیں۔ دوستوں کی تخلیقی سرگرمیوں کی داد یا داد دل کھول کر دیتے ہیں اور اپنا فیض عام کرتے رہتے ہیں ان کی ایک نظم ''بشرط استواری'' کی آخری سطریں ہیں۔

محبت وقت اور موسموں کی ترتیب سے آزاد ہوتی ہے
بہت برباد کرتی ہے تو خود آباد ہوتی ہے

آج کل لکھے جانے والے بیشتر کالم ان غنچوں کی طرح ہوتے ہیں جو بن کھلے مرجھا جاتے ہیں۔ ان کالموں کی بہار جانفزا بھی خبروں کی طرح ایک ہی دن کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن ناصؔر علی سید کی شگفتہ نگاری، ادبی معیار اور کلاسیکی روایت سے مکمل آگہی نے ان کے کالموں کو صحافت کی بجائے ادب کا حصہ بنا دیا ہے۔ وہ دبستان پشاور کی انٹلکچوئل طاقت کے بھرپور نمائندہ ہیں اور ''ادب کے اطراف میں'' سرخرو کھڑے ہیں۔

سراپا محبت

ناصر علی سید کے بارے میں اس قدر کہہ سکتی ہوں کہ گھر میں بھی وہ اس طرح وقت گزارتے ہیں جیسے کوئی پکنک پر نکلا ہوا ہو۔ ایک اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور اس سے زیادہ اچھے دوست خصوصاً بچوں کے ساتھ ان کی دوستی اور فرینکنس کا ذکر اکثر ان کے دوست اور فیملی فرینڈز کرتے ہیں۔ بچوں کی ذرا سی طبیعت کی خرابی میں علی کی پریشانی ایک باپ سے زیادہ ماں والی ہوتی ہے۔ کسی بھی محفل میں جانے کے لیے انہیں گھر میں اکثر دیر ہو جاتی ہے مگر محفل سے آنے والے آخری آدمی بھی یہی ہوتے ہیں۔ غرض علی سراپا محبت اور شرافت ہیں۔ گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔

رفعت علی رسید

''میرے ہونے کا استعارہ''

ڈاکٹر طاہر تونسوی

(ملتان)

مجھے اپنی بات اس اعتراف کے ساتھ شروع کرنا ہے کہ میں نے ناصر علی سید کے شعری اظہارات کے مجموعے ''شامیں فریب دیتی ہیں'' کا مطالعہ اس کی غزل کے مکالمے سے اور پھر نظم کے معانقے سے کیا یہی وجہ ہے کہ محولا بالا اقتباس کی صورت پہلے غزل اور پھر نظم کا منظر نامہ تشکیل دیتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک تخلیقی عمل کی بہترین شکل غزل ہی ہے اور بعد میں اس کا دوسرا فیز نظم کا ہیولیٰ بنتا ہے۔ اس حوالے سے ناصر علی سید کی نظم اور پھر غزل کا جائزہ لیں تو سب سے پہلی خوبی جو واضح طور پر دکھائی دیتی ہے وہ انفرادی اسلوب اور لب ولہجے کی ہے اور پھر دوسری خوبی یہ ہے کہ اس نے بڑے سے بڑے موضوع کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ پوری لطافت اور رعنائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یوں زبان وبیان کی چاشنی صاف ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس کا ذائقہ محسوس بھی ہوتا ہے لذت آگیں اور لذت آفریں صورتِ حال دل پر منقش ہو کر رہ جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ناصر علی سید اپنے نرم وملائم لہجے میں شیریں لفظوں کے ساتھ آپ کے دل ودماغ کو سحر انگیزی کی جانب لا رہا ہے اور آپ ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے بھی جاتے ہیں اور اس کی تخلیقی فضاؤں میں اڑتے بھی چلے جاتے ہیں اور اس طرح ہر اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو غزل کی باریک بینی اور نظم کی بیروں بینی کے تناظر میں مسرت کے گلاب کھلنے والی کیفیات سے روشناس ہوتے ہیں اور پھر وہ آپ سب کو اپنے دیکھے اور ان دیکھے خوابوں میں بھی شریک کرتا ہے ایسے خواب جن کے دیکھنے کی خواہش آپ میں بھی ہوتی ہے۔ رات کو دیکھنے والے خوابوں کی بھی اور دن میں جاگتے ہوئے خواب دیکھنے کی تمنا بھی۔۔۔ اسی طرح یوں لگتا ہے کہ ناصر علی سید آپ کو آپ سب کی بیتی سنا رہا ہے اور اس کی کتھا اور رام کہانی آپ سب کی بھی تو ہے یہی وجہ ہے کہ آپ ''شامیں فریب دیتی ہیں'' کو برابر اور مسلسل پڑھے جا رہے ہیں اور یہ سب ناصر علی سید کے اسلوب وبیان کا اعجاز ہی تو ہے کہ سوچ وفکر کے حوالے سے آپ نہ صرف اس میں کھبے ہوئے ہیں بلکہ کھُبتے چلے جا رہے ہیں اور فعل حال جاریہ کی یہ کاریگری ناصر علی سید کے دست کوزہ گر کا کمال ہے اس کی صناعیت اور اس کی کرافٹنگ کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے تخلیقی شعور کی رو کی چند مثالیں دیکھیے:

نہ جانے کون سا موسم مجھے ہرا کر دے
نمو کے واسطے بے تاب ہوں شجر میں ہوں

یہ دوستی بھی عجب چوب خشک ہے ناصؔر
نبھا رہا ہوں مگر ٹوٹنے کے ڈر میں ہوں

سوائے دربدری اور کون جانے ہے
کہ میرے شہر کے نقشے میں میرا گھر بھی نہیں
نہیں ہے ساتھ کوئی بے کسی کا موسم ہے
سو رو رہا ہوں مگر میری آنکھ تر بھی نہیں

مجھے آواز اب دو بھی تو کیا ہے
کہ میں بستی سے باہر آ چکا ہوں
وہ خال وخد بھی اب بجھنے لگے ہیں
میں جن سے روشنی لیتا رہا ہوں

تم ہی کچھ حرف محبت کے عطا کر دیتے
میری جادو بھری تحریر تمہاری ہوتی
نیلی آنکھوں کی فسوں کاری اشارہ کرتی
دل کی ویران یہ جاگیر تمہاری ہوتی
ڈر جو رسوائی کا ہوتا نہ کبھی جانِ غزل
ایک اک شعر میں تصویر تمہاری ہوتی
تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں گر سو سکتا
میرے ہر خواب کی تعبیر تمہاری ہوتی
قوس اور دائرے ہونٹوں کے ترے لکھ سکتا
میرے اشعار میں تاثیر تمہاری ہوتی

وہ جو اک لفظ کہ خسارہ ہے
میرے ہونے کا استعارہ ہے
اک دریچے نے ہم کو بتلایا
اس گلی میں کوئی ہمارا ہے

نئے سورج کے اُگنے سے
میں پہلے ہی سفر آغاز کرتا ہوں
کہ خود سے روٹھنے کو
اور فسانے کو
کہ خود سے بات کرنے کو
کئی قصے سنانے کو

گذرتی رات اور دن کے
اُجالے کے حسیں سنگم سے بہتر
کون لمحہ ہے

(روٹین)

چلو اٹھو
کہ اپنے فیصلے خود آپ کرنے کی گھڑی آئی
ہمیں اب
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
یک جان ہونا ہے
ہمیں اپنے سروں پہ ہاتھ رکھ کر
خود ہی اپنے آپ سے اک حلف لینا ہے
نیا ایک عہد کرنا ہے

(نیا عہد نامہ)

میں نے ناصر علی سید کی ان تخلیقات کا انتخاب بھی ایک خاص حوالے سے کیا ہے اور وہ حوالہ میرے مضمون کے عنوان میں بھی موجود ہے یعنی مکالمہ۔۔۔اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ناصر علی سید نے اپنے کلام میں کبھی اپنے آپ سے مکالمہ کیا ہے تو کبھی اس سے بات کی ہے کبھی اشارے کنایوں میں گفتگو کی ہے تو کبھی خود کلامی کی شکل پیدا کی ہے۔کبھی خوابوں سے ہم کلام ہوئے ہیں تو کبھی ان کی تعبیریں پانے کے لیے سرگوشیاں کی ہیں کبھی شعر میں جانِ غزل کی تصویر اتار کر اس سے پوچھا ہے اور کبھی آواز نہ دینے کا اعلان نامہ جاری کیا ہے تو کبھی نئے عہد کا نیا عہد نامہ۔ یہ ساری کیفیتیں ناصر علی سید کی غزل اور نظم دونوں میں متشکل ہوتی ہیں اور وہ لفظوں سے جو تصویریں بناتے ہیں وہ ہم رنگ بھی ہیں اور ہم جہت بھی اور ان کی جمالیاتی پیکر تراشی ان کے فکر و فن اور نظریۂ فن کا وضاحت نامہ بن کر ہمارے سامنے ابھرنے لگتا ہے کہ ان میں تجسس اور تحیر کی فضا بھی ہے جو غزل اور نظم کے لب و لہجہ میں تاثریت کے اضافے کا باعث ٹھہرتی ہے اور اس میں جو بے پناہ اعتماد کی ہے وہ ناصر علی سید کے تخلیقی جہان فن کو اور نمو بخشتی ہے۔ناصر علی سید کے ہاں موضوعات کی فراہمی ہے اور الفاظ ایک ایسا ذخیرہ ہے کہ اس سے ایک لغت تیار کی جاسکتی ہے ایک اور وصف جو ناصر علی سید کی غزلوں اور نظموں دونوں میں پایا جاتا ہے وہ اپنے عصر کا ادراک ہے وہ آنکھیں بند کر کے نہیں بلکہ آنکھیں کھول کر دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر اسے شعر کی زبان میں بیان کر دیتے ہیں ان کے ہاں سیاسی شعور بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ کائنات میں پھیلے ہوئے ہر خطے کی صورتِ حال اور اس میں بسنے والے لوگوں کے احوال سے واقف ہیں بڑی طاقتوں کی سازشوں سے وہ پوری طرح باخبر ہیں خاص طور پر وہ امریکی عزائم کو کھلے لفظوں میں بے نقاب کرتے ہیں اور اس کے فسطائی رویے کے خلاف قلمی جہاد کرتے ہیں اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی مذمت بھی کرتے ہیں اس نازک موضوع کو انہوں نے نہایت سلیقے اور قرینے سے نظم کی بجائے غزل کے پیرائے میں بڑے ہنر مندانہ اور فنکارانہ طریق سے پیش منظر پر لائے ہیں ان کا کمال دیکھئے:

وہ دیواریں اُگاتا ہے پہ دروازے نہیں دیتا
کسی کو اپنے گھر میں بھی تو وہ بسنے نہیں دیتا
دکھاتا دور سے ہے دودھ کی اور شہد کی نہریں
مگر ان تک پہنچنے کے کبھی ویزے نہیں دیتا
عجیب اک زعم ہے اس کو زمینوں پر خدائی کا
مری بستی میں مجھ کو پھولنے پھلنے نہیں دیتا
مرا رزقِ کشادہ تنگ کر دیتا ہے وہ پل میں
خلاف اپنے ہوا تک کو بھی جو چلنے نہیں دیتا
کسی کو دوست کہتا ہے تو وہ بھی کانپ جاتا ہے
کہ منزل تو دکھاتا ہے مگر رستے نہیں دیتا
غریب شہر کا دشمن فقیہ شہر بھی تو ہے
کوئی فتویٰ امیر شہر کے ڈر سے نہیں دیتا
اک ایسا خوف اس پہ موت کا طاری ہوا ناصر
کسی کو عالمی گاؤں میں اب بسنے نہیں دیتا

اس میں جو علامتیں اور استعارے استعمال ہوئے ہیں یا جس عالمی صورت حال کے بارے میں اشارے کیے گئے ہیں وہ اپنی جگہ خوب ہیں اور جس انداز سے ناصر علی سید نے بات کی یا اپنا مافی الضمیر بیان کیا ہے یا جس طرح وہ اپنے دل کی بات زبان پر لائے ہیں یا جس طرح ان کے اندر کا حساس انسان بول پڑا ہے وہ ہر اعتبار سے اہم بھی ہے اور فنکارانہ مہارت کی دلیل روشن بھی۔۔۔اس تناظر میں اس کے اپنے لکھے ہوئے دو صفحے"بیتی شاموں کا خسارہ" اس کی حساسیت اور بیتی زندگی کے شب و روز کی طرف سے گذرے ہوئے یادوں کے دریچوں کا منظر نامہ پیش کرتا ہے وہ اس میں جن بیتے دنوں کی کہانی بیان کر رہے ہیں اور اپنے سفر کی روداد سنا رہے ہیں وہ بظاہر خسارے کی بات کرتے ہیں مگر میرے نزدیک اس میں بھی وہ منافع میں رہے ہیں اور شعری مجموعے"شامیں فریب دیتی ہیں" کی ایک الگ خصوصیت سامنے آئی ہے کہ انہوں نے تو خود شاموں کو فریب دیا ہے اس کی چند سطریں دیکھئے:

"اگر اس سفر کی کہانی پڑھتے ہوئے کسی موڑ پر بچھڑے ہوئے کسی بہت ہی اپنے کی یاد سے آپ کی آنکھوں میں کوئی منظر دھندلا جائے تو جان لیجیے کہ جس طرح گاؤں کی اجلی صبحوں سے بے اختیار کئے جانے والوں نے شہر کی سانولی سلونی شاموں میں رونق کے رنگ بھر دیئے ہیں تو بالکل اسی طرح کے اُجڑے اور بے آسرا لوگوں نے ہی اس آباد دنیا کے باسیوں کو جینے کا ہنر اور سلیقہ سکھایا ہے۔"

''ادب کے اطراف''

بی بی حلیمہ بشریٰ
(کوہاٹ)

پروفیسر ناصر علی سید گول مٹول سے، بھرا بھرا چہرہ، کلین شیو میں پُر جمال صورت، کشادہ مگر تھوڑی سی اُبھری ہوئی پیشانی سخاوت کی نشانی، ہلکے ہلکے آبرو، آنکھیں اردو کے کلاسیکی شاعری کے محبوب کی طرح بڑی بڑی اور آ ہونما، ان آنکھوں میں زمانے کے گرم و سرد سمونے کے بعد قدرے چھوٹی لیکن غیر معمولی ذہانت و فطانت اور شوخی و شرارت سے ایک دم لبریز، ناک مختصر سی مگر نتھنوں تک پہنچتے پہنچتے تھوڑی بیٹھ سی جاتی، دہن ہمہ وقت تبسم اور قہقہوں کی وجہ سے شگفتہ رہتا جس سے ہر وقت مزاحیہ فقرے اور پھڑ کتے اشعار تازہ پھولوں کی مانند جھڑتے ہیں، چھوٹے چھوٹے موتی نُما چمکدار دانت اُوپر والے دو دانتوں کے درمیان واضح خلاء، چھوٹے بچوں کی طرح پھولے پھولے سے گال، زہے نصیب۔۔۔صحتمندی نے اُن کے قد کو ذرا دبا سا دیا ہے مگر علم و ادب، شعر و سخن، تحقیق و تنقید، صحافت و ثقافت، ٹیلی وژن، ریڈیو، ڈرامہ غرض ہر میدان میں وہ ایک غیر معمولی قد اور سندر کھتے ہیں۔

یوں تو ناصر علی سید نے افسانہ، ڈرامہ، ٹیلی وژن، تحقیق و تنقید، ہر میدان میں اپنے کمال کا لوہا منوایا مگر شاعری اور صحافت اُن کے خاص میدان ہیں۔اب اگر بات اُن کی شاعری کی ہو تو احمد فراز، یوسف رجا چشتی، رضا ہمدانی، محسن احسان اور خاطر غزنوی جیسے بین الاقوامی سطح کی بڑی بڑی ہمعصر آوازوں میں اُن کی آواز کی ایک خاص پہچان ہے۔اُن کی نثر نگاری کو دیکھا جائے تو ''ادب کے اطراف میں'' کا تاج محل حسام حُر کے انتخاب کردہ کچھ بہترین کالموں کے سنگ وخشت سے تیار کیا گیا ہے۔

جب میں ''ادب کے اطراف میں'' کے ترو تازہ گلشن میں داخل ہوتی ہوں تو ہر سُو ذہانت اور علم و ادراک کے اعلیٰ نمونے صفحہ قرطاس پر بکھرے نظر آتے ہیں یہ اُن کے کالموں کا مجموعہ ہے جس میں قلم قبیلے کے بڑے دور کے عظیم تخلیق کاروں کی جھلکیاں نظر آتیں ہیں جو اُنہوں نے ایک خاص وقت میں معروف اخبار آج کے لیے وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔

''ادب کے اطراف میں'' کسی عام روایتی کالم نگار کے عام روایتی کالموں کا مجموعہ نہیں بلکہ فنی، فکری، اسلوبیاتی، موضوعاتی، علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی، سماجی غرض ہر سطح پر اعلیٰ پایے کی تخلیق ہے اور میرے اس دعوے کی مکمل تائید یقیناً ہر وہ ذی فہم، اہلِ نظر اور پڑھا لکھا شخص کرے گا جس کی نظر سے یہ کتاب گزری ہو۔

اور سب سے پہلے ہر صاحبِ ذوق کی نظر اس کے غیر معمولی مسحور کُن اور دل آویز ادبی اسلوب پر پڑے گی کیونکہ ان کالموں میں شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ناصر علی سید، صحافی ناصر علی سید پر اول سے آخر تک مکمل طور پر حاوی ہے۔زبان و بیان پر زبردست قدرت، غیر معمولی لسانی شعور، اعلیٰ ذوق، مطالعے کی وسعت، قلمی چابکدستی اور موضوع پر مکمل گرفت اُن کی تحریروں کو یونیک بناتی ہے وہ فقرے تحریر نہیں کرتے بلکہ پٹاخے چھوڑتے اور انار چلاتے ہیں۔۔۔کالم جیسی عام تحریر میں چھوٹے چھوٹے مختصر فقرے، تاثراتی طرز تحریر اور ڈرامائی فضا کی تشکیل قاری کو مکمل طور پر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور یہ کیفیت تقریباً اُن کے ہر کالم میں پائی جاتی ہے۔۔۔''خدا کرے صف سردارگاں نہ ہو خالی'' میں کہتے ہیں:

''ان ناگفتہ بہ حالات میں کسی سے کوئی کیا شیئر کرے، کسی کو کیا دلاسہ دے، کسی کو کیسے گلے لگائے، کس کی آنکھ کے آنسو پونچھے، کس سے تعزیت کرے، آہوں چیخوں اور سسکیوں میں ڈوبے ہوئے لمحات کی تصویر بھلا کون بنا سکتا ہے کوئی اپنے کلیجے کو تھامے کہ دوسرے کے دل پر ہاتھ رکھے، دوسروں کے دل پر ہاتھ رکھے، دوسرے کے ڈھلکے ہوئے سروں کو کندھا دے کر اپنے سر کے لیے کاندھا تلاش کرے، کسی کونے میں بیٹھ کر خود سے باتیں کرے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر سڑکوں پر نکل آئے، کوئی جانے والے کو روئے کہ زندہ لوگوں کی خیر منائے، خود کو سنبھالے یا دوسرے کا آسرا بنے۔''

چہچہاتے ہوئے پنچھی کو اڑا دیتے ہیں
کسی سر میں کوئی سودا نہیں رہنے دیتے

اور یہ کیفیت اُس وقت اور بھی مسحور کُن اور دل افروز بنتی ہے جب وہ منظر کشی کرتے ہیں۔۔۔الفاظ کے ذریعے قاری کی آنکھوں میں مختلف مناظر کی باریکیوں کا سُرمہ لگا لگا کر کالم بُنتے ہیں۔۔۔اور تمثیل نگاری کی بہترین مثال اُن کا مضمون ''جب ہماری یاد آئے گی'' ہے۔

یونہی تنہائیوں میں جب ہماری یاد آئے گی
اندھیرے چھا رہے ہوں گے کہ بجلی کوند جائے گی

اُن کی تحریریں محض عام اخباری کالم نہیں بلکہ کسی معروف ناول، اعلیٰ افسانے یا خوبصورت ڈرامے کے اقتباسات معلوم ہوتے ہیں ہر تصویر مکمل اور واضح، ہر صورت خوش کُن اور دلفریب اور ہر مشاہدہ گہرا اور عمیق۔

اس کے علاوہ ہر ہر صفحے پر موقع و محل اور موضوع کے عین مطابق مچلتے ہوئے مصرعے، پھڑکتے ہوئے اشعار اور جھومتے ہوئے قطعات دیدہ و دل کو ٹھنڈک بخشتے ہیں اور سب سے حیران کُن بات یہ کہ چند ایک کالموں کے علاوہ ان کے تمام کالموں کے عنوانات کسی نہ کسی شعر کے مکمل مصرعے یا اُن کے ٹکڑے ہیں۔ اور پھر کالم کے آخر تک پہنچتے پہنچتے بیچ میں اُردو، فارسی، ہندکو اور پشتو کے ایسے ایسے اشعار، مصرعے اور قطعات ٹانک دیتے ہیں کہ نہ صرف اُس موضوع کو چار چاند لگ جاتے ہیں بلکہ قاری بار بار کالم پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اس کی قامت سے اسے جان گئے لوگ فراز
جو لبادہ بھی وہ چالاک پہن کر نکلے

یہ نہ صرف ان کے اعلیٰ ذوق کا کمال ہے بلکہ مطالعے کی غیر معمولی وسعت، حافظے کے قوی پن اور شعر و سخن سے بے پناہ آگہی کا واضح ثبوت ہے۔ اشعار کے علاوہ وہ جا بجا مختلف زبانوں کے مشہور ضرب الامثال، کہاوتیں اور محاورات کے موتی بھی اپنی تحریروں کے آنچل میں بڑی مہارت سے ٹانکتے ہیں۔۔۔ ایک اور اہم عنصر جو ان کی تحریروں میں نمایاں ہے وہ خالص مزاح کا عنصر ہے جو انکی ذہنی ذکاوت کا مرہون منت ہے۔ مزاح کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

"عظیم ادیبوں کی تحریروں میں تبسم زیرِ لب ملتا ہے بتیسی دکھانے والے تو مسخرے ہوتے ہیں۔"

ایک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

"مرد خوبصورت ہوتا ہے اور عورت کو خوبصورت نظر آنے کے لیے سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔"

"غرباء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس وقت مرغی کھاتے ہیں جب وہ خود بیمار ہوں یا پھر گھر میں پالی ہوئی مرغی بیمار ہو۔"

"رمضان میں لوگ بلا کے مہمان نواز ہوتے ہیں اور ہر ملاقاتی سے یہی کہتے ہیں معافی چاہتا ہوں روزہ ہے آپ کی سیوہ نہیں کر سکا اور بے چارہ مہمان اس فقیر کی طرح تلملا جاتا ہے جس نے جب ایک دروازے پر فقیرانہ صدا لگائی تو جواب آیا معاف کرنا بھائی ہم اس وقت اوپری منزل میں ہیں۔۔۔ جواباً فقیر نے کہہ دیا کہ بھائی جب آپ نچلی منزل پر تھے تو کب کونسا تیر مارا تھا۔۔۔"

اُن کی تحریروں میں مسلسل زیرِ لب تبسم کی ہلکی ہلکی پھوار میں اُن کا قاری بھیگتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے ہاں قولِ محال کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

"یخ بستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر شعر بُننے میں اور جون جولائی کی جھلستی ہوئی دوپہروں میں گرم تنور میں آدھے سے زیادہ جھک کر روٹی لگانے کے بعد نرم و نازک پھواروں کی سی شبنمی شاعری میں کتنا فرق ہوتا ہے۔"

"پولیس یکہ توت کی ہو کہ کوتوالی کی دونوں مجرموں کا سراغ نہ لگا سکنے میں یکساں مہارت رکھتی ہوں گی۔"

"پاس یوں تو ہر حل کے لیے ایک بنا بنایا مسئلہ موجود ہوتا ہے مگر اس سوال کا جواب وہ ایک نرم سی مسکراہٹ سے دیتے ہیں۔"

یہ بات یاد رہے کہ اُردو شاعری میں غالب اور نثر میں رشید احمد صدیقی اور مشتاق یوسفی کے علاوہ کوئی بھی اس حربے کا صحیح حق ادا نہ کر سکا مگر ناصر علی سید کے کالموں میں اس حربے کی متعدد کامیاب مثالیں موجود ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے معاشرے میں کج رویوں اور کوتاہیوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور اسے بلا جھجک بیان بھی کرتے ہیں۔ میدان ادب کا ہو یا سیاست کا، کجروی ادیبوں کی ہو یا سیاستدانوں کی، کوتاہی تعلیمی میدانوں میں ہو یا حکومتی ایوانوں میں، مصلحت پسندی مذہبی ٹھیکیداروں کی ہو یا مفاد پرستی امیرانِ شہر کی، کھلواڑ کہیں بھی کھیلا جائے اُن کا قلم ان ناسوروں میں طنز کے زبردست نشتر چبھو چبھو کر ان فاسد مادوں کو بہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ لیکن اس دوران سنجیدگی، شرافت اور تہذیب کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا۔

"لندن ساٹھ سال قبل تک بھی ہمارے سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا تھا۔"

اُن کی تحریروں کی جو سب سے بڑی خصوصیت ہے وہ عموماً قومی اور بین الاقوامی سطح کے ادبی حلقوں اور خصوصاً خیبر پختونخواہ کے نئے اور پُرانے ادبی حلقوں کے پس منظر، احوال، اُن کی فعالیت، اہمیت، وقتاً فوقتاً اُن کے اتار چڑھاؤ ان کے شرکاء ان کے روحِ رواں اور ان کی کاروائیوں کا کہیں مفصل تو کہیں مجمل حال ہے جن میں حلقہ اربابِ ذوق، بزمِ خیام، تخلیق انٹرنیشنل، ملاقات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی، پشتو، ہندکو، فارسی، عربی زبان کے شعراء ادباء ان کی تخلیقات، ان کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کو چند ایک اقتباسات اور اکثر دو تین فقروں میں سمیٹ کر اس انداز میں بیان کر دیتے ہیں کہ گویا:

"اب مجھے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر"

والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

"زہے نصیب کہ پھولوں کی زندگی کم ہے" میں کہتے ہیں کہ:

"سعدی نے بغداد، ابن بدرون نے غرناطہ اور انتظار حسین نے برصغیر کے قصباتی کلچر پر جس طرح کے آنسو بہائے ہیں، عینی آپا کا دکھ بھی اس ماضی کا مرثیہ تھا لیکن عینی آپا کا اندازِ نگارش کچھ ایسا دلکش تھا کہ پڑھنے والے بیک وقت اس کے ساتھ آنسو بہاتے بہاتے اس کی فضا کے حسن سے بھی لطف لینے لگتے۔"

"اسلام آباد میں مجھے چند لمحوں کے لیے اپنی کہانیوں میں حیرانیاں بھرنے والے افسانہ نگار مظہر الاسلام سے ملنا تھا۔ مظہر اپنی کہانی کے کرداروں کی طرح اپنی ذات میں بھی عجائبات کی ایک دُنیا بسائے رکھتا ہے۔"

"پشتو غزل کے عمومی مزاج سے وہ بیت ہٹ کے ہے، بابا کی جدیدیت محض ایک نعرہ یا دوسروں کی دیکھا دیکھی نہیں ہے یہ ان کی ذات اور روح میں رچی بسی ہے۔ اسی سے ان کا طرزِ احساس اور اندازِ فکر دائمی حیثیت اختیار کر جاتا ہے وہ ایک اپنے منصب سے آگاہ شاعر ہے۔"

اس کے علاوہ اپنے مضامین میں اُنھوں نے اجمل نیازی، ساحر مصطفائی، مختار علی منیر، حمزہ شنواری، جوہر میر، غلام محمد قاصر، غضنفر ہاشمی، عزیز اعجاز، نذیر تبسم اور بشریٰ فرخ وغیرہ کے فکر و فن پر رائے پیش کی ہے۔

"ادب کے اطراف میں" ادبی حلقوں کے ہنگامے، شعراء و ادباء کی چلتی پھرتی تصویریں، اُن کے ادبی فتوحات گویا ایک خاص دور کی مکمل ادبی انسائیکلو پیڈیا ہے۔

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ کیجیے

ہلکہ ورغ بہ لیونے شے

سعداللہ جان برق
(پشاور)

یہ تو ہمیں معلوم نہیں ہے کہ شامیں فریب دیتی ہیں یا صبحیں دھوکہ باز ہوتی ہیں کیونکہ ہم نے تو آج تک ایسی کسی بھی چیز کو نہ دیکھا نہ پایا نہ سنا جو دھوکہ باز نہ ہو۔ اپنے خیال کو روک لیجیے ہم سیاست کی طرف نہیں جا رہے ہیں کیونکہ کسی کالے کو ہر وقت کالا کالا کہنا اچھا نہیں لگتا اور پھر ایسے کالے جو دل والے بھی نہیں ہوتے اس لیے دھوکہ دہی فریب دہی اور نوسربازی صرف سیاست ہی سے مخصوص نہیں ہے اور بھی ایسے لوگ اور مقامات بلکہ اوقات بھی ہوتے ہیں جو فریب دیا کرتے ہیں جیسا کہ ناصر علی سید کے بقول ''شامیں فریب دیتی ہیں'' حالانکہ ہمارے خیال میں ناصر علی سید بھی دھوکہ دینے میں کسی شام سے کم نہیں ہیں۔ وہ آج تک ہمیں یہی دھوکہ دیتے رہے کہ وہ صرف اردو پشتو اور ہندکو کے ایک اچھے مقرر اور کمپیئر ہیں خصوصاً ادبی تقریبات کسی بھی زبان کی ہوں ناصر علی سید ان میں میزبان کمپیئر اور سٹیج سیکرٹری تینوں ہوتے ہیں۔ اردو، ہندکو، پشتو۔۔۔ میزبان کمپیئر اور سٹیج سیکرٹری۔۔۔ گو تھری ان ون۔۔۔ اور ضرب تھری ان ون لیکن بات یہاں تک بھی ٹھیک تھی بہت سے لوگوں کو تین کا ہندسہ پسند ہوتا ہے سوائے طلاق کے جو خدا اور انسان دونوں کو پسند نہیں لیکن ناصر علی سید ڈبل تھری ان ون سے بھی مطمئن نہیں ہوتے اور ایک چوتھی یا ساتویں حرکت بھی کر گئے جسے نازیبا تو نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ ہم خود بھی اس ''عادت بد'' میں مبتلا ہیں لیکن کم از کم ہمارے لیے غیر متوقع ضرور ہے۔ یہ ساتویں حرکت وہ اپنے مجموعہ کلام کی صورت میں کر گئے جس کا نام ہے ''شامیں فریب دیتی ہیں''۔ معلوم نہیں ان کو کسی شام نے فریب دیا یا شام کے وقت کسی اور نے فریب دیا ہے لیکن مجموعہ کلام کا نام رکھتے ہوئے کسی شام کوئی دھوکہ دہی کی واردات ضرور ہوئی ہے بلکہ وارداتیں کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن ہم تو اس کتاب کو دیکھتے ہی اس نتیجے پر پہنچے کہ شامیں فریب دیتی ہوں یا نہیں لیکن ناصر علی سید نے ہمیں ضرور فریب دیا ہے بلکہ کافی عرصہ سے دے رہے ہیں ہمیں باور کراتے رہے کہ وہ صرف نثار بلکہ ''ناثر'' ہیں اور بیچ میں شاعر نکلے۔ اس پر ہمیں اس فوجی کا قصہ یاد آیا جو برما کے جنگلوں میں ایک محاذ پر اسے پیش آیا تھا۔ اسے ایک زخمی سپاہی نے بتایا کہ میری ٹانگ کٹ گئی ہے مہربانی کر کے مجھے ہسپتال پہنچا دو فوجی نے اسے پیٹھ پر لاد لیا اندھیرا جنگل اور اوپر سے بمباری بے چارا گرتا پڑتا اپنے علاقے میں پہنچا تو وہاں گارڈ نے ہالٹ کہہ کر شناخت مانگی اس نے نام نمبر وغیرہ بتایا اور کہا کہ میں اس زخمی کو ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ گارڈ نے ٹارچ کی روشنی میں اس پر لدے ہوئے زخمی کو دیکھا تو اس کا سر ہی موجود نہیں تھا در اصل راستے میں گرتے پڑتے اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا اور کسی بم یا توپ کے گولے نے زخمی کا سر اڑا دیا تھا۔ گارڈ بولا اس کا تو سر ہی نہیں ہے فوجی نے کہا اچھا پھر فوراً لاش کو پھینکتے ہوئے بولا یہ تو بڑا جھوٹا ہے اس نے تو کہا تھا کہ میری ٹانگ کٹی ہوئی ہے، مجھ سے یہ بات چھپائی کہ میرا سر کٹا ہوا ہے۔ ناصر علی سید بھی تقریبات میں دوسروں کے بہت زیادہ اشعار سناتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کی ڈکشنری اپنے دماغ میں رکھتے تھے اور یہ بات ہم سے چھپائے رکھی کہ میں خود بھی شعر کہتا ہوں۔ اب جبکہ کتاب ہاتھ لگی اور شاعری پڑھی تو کچھ زیادہ دوشی بھی ہم انہیں نہیں ٹھہرا سکتے یہ چیز تھی ہی چھپانے کی۔ یہاں لفظ ''چھپانے'' سے آپ وہ مراد نہ لیں جو آپ کے ذہن میں آ رہا ہے بلکہ وہ مطلب اخذ کیجیے جو ہم بتانے والے ہیں اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم بھی شعر کی زبان بولیں یعنی:

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

شعر کا دوسرا بلکہ پہلا مصرعہ آپ خود وضع کر لیں مطلب یہ کہ ناصر علی سید بھی اپنا قیمتی اثاثہ چھپائے ہوئے تھے ممکن ہے ان کے دل میں وہ کہانی بھی کہیں موجود رہی ہو کہ ایک شخص کو ایک کیچڑ میں ایک ہیرا ملا تو اسے دریا میں دھونے لگا دھوتے دھوتے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دریا کی گہرائی میں ڈوب گیا۔ بے چارے کو اتنا صدمہ ہوا کہ باقی زندگی صرف ایک ہی جملہ بولنے لگا کہ دھونے سے نہ دھونا ہی اچھا تھا۔ لیکن ناصر علی سید کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ انہیں یہ ہیرا کیچڑ میں نہیں ملا ہے بلکہ دل کا خون پلا پلا کر اسے تراشا بنایا اور چمکایا بلکہ یہ ایک ہیرا ابھی نہیں ہے ہیروں کی پوٹلی ہے اتنا ظالم تو دریا بھی نہیں ہو سکتا کہ ساری پوٹلی ہی کو ہڑپ کر جائے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

شامیں فریب دیتی ہیں یا نہیں اس کا تو ہمیں تجربہ نہیں ہے کیونکہ ہمیں ''صبحوں'' نے اتنے دھوکے دیئے ہیں کہ دوپہروں تک اعتبار نہیں رہا ہے تو شاموں کے دھوکے میں کیسے آئیں گے ویسے ایک شاعر ٹرانسپورٹ کا یہ شعر ہم نے بچپن ہی میں پڑھ لیا تھا کہ:

حسن والے حسن کا انجام دیکھ
ڈوبتے سورج کو وقت شام دیکھ

جب حسن والوں کو ''شام'' سے ڈرایا جا سکتا ہے کہ ہم کس ''بنارس'' کی صبح ہیں جو شام اودھ کے ساتھ یارانہ گانٹھیں۔ ویسے پشتو میں شام کو تو نہیں لیکن شام سے ذرا پہلے کے وقت مازیگر (عصر) سے ضرور خبردار کرنے کی نصیحت کی گئی ہے کہ:

ہلکہ ورغ بہ لیونے شے
کہ دکودر مازیگرے دے اولید نہ

یعنی نوجوان خبردار پاگل ہو جاؤ گے اگر کہیں تم نے ''پنگھٹ'' کا ''مازیگر'' دیکھ لیا۔ شاموں کے بارے میں ویسے ہم ناصر علی سید سے اصولی طور پر اتفاق کرتے ہیں کیونکہ شامیں بڑی منافق ہوتی ہیں نہ یہ رات میں شام ہوتی ہیں نہ دن میں روشن ہوتی ہیں نہ تاریک کچھ عجیب ''سیاسی'' سا وقت ہے کہ نہ ادھر کا نہ اُدھر کا

اور کہیے تو ادھر کا بھی ہوتا ہے اور اُدھر کا بھی بلکہ آج تک کسی گنجے کے چہرے اور سر کی طرح کسی پٹواری سے یہ تعین بلکہ حد برداری تک نہیں ہوسکتی ہے کہ دن کہاں پر ختم ہوتا ہے شام کہاں سے کہاں تک ہوتی ہے اور شام وشب کی سرحد کہاں قائم کی جاسکتی ہے۔اب ایسی نوسر باز بلکہ بہروپیے قسم کی چیز یا وقت نے ناصر علی سید کو فریب دیئے ہیں تو اس میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا ہے البتہ اس پر بات کی جاسکتی ہے کہ یہ فریب کس نوعیت کے ہیں دلی، جسمانی یا مالی۔لیکن اس کا فیصلہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے کسی شاعر کے پاس ''دل'' کے علاوہ اور ہوتا ہی کیا ہے۔یہی ایک دل ہی تو اس کا کل اثاثہ ہوتا ہے اور وہ بھی کھلاڈھلا ہاتھ میں لیے ہوئے ہوتا ہے بلکہ اچھالتا ہوا پھرتا ہے۔

آپ شاید سوچیں کہ ہم ناصر علی سید کے اس مجموعہ کلام سے اشعار کیوں نقل نہیں کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم نے پڑھا نہیں ہے اتنے زیادہ تجربہ کار تبصرہ نگار یا مقدمہ باز ہم نہیں ہیں کہ بغیر پڑھے کسی کتاب پر کچھ لکھ مار سکیں اس کے لیے بہت زیادہ تجربہ اور نہایت تیز قوت شامہ درکار ہوتی ہے کہ صرف سونگھ کر کچھ بتا سکیں ایسا ہوتا تو ہم آج یوں نکھے نہ پھر رہے ہوتے اور سابق فوجیوں کی اس کمپنی میں بھرتی ہو چکے ہوتے جو چور اور چوری کا سراغ لگاتے ہیں چنانچہ پوری کتاب پڑھنا ہماری مجبوری ہے۔بلکہ کچھ کم فہم ہونے کی وجہ سے بار بار پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ ''شامیں فریب دیتی ہیں'' ایک مرتبہ تو کتاب ملتے ہی شہر سے گھر آتے ہوئے دورانِ سفر پڑھ ڈالی پھر دو چار روز بعد دوبارہ پڑھی۔اور اب جب تبصرہ کرنا تھا تو تیسری مرتبہ ذرا دل جمعی سے پڑھی لیکن اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے دراصل ناصر علی سید نے کتاب اتنی خوبصورت چھاپی ہے کہ پڑھنے میں ویسے ہی مزا آتا ہے جیسا کہ کسی خوبصورت انسان کو بار بار دیکھنے اس سے باتیں کرنے بلکہ بار بار کرتے رہنے کو من کرتا ہے۔لیکن اصل وجہ نمونہ کلام نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ صرف چھکنے سے جی کہاں بھرتا ہے کیونکہ ''شامیں فریب دیتی ہیں'' ہمارے خیال میں پشاور کے کسی ایسے شاعر کا پہلا مجموعہ کلام ہے جس نے اردو، پشتو اور ہندکو کو تینوں زبانون کی شاعری کا ''فلیور'' اپنے کلام میں سمویا ہے۔

بقیہ: میں آدھے سے زیادہ مر چکا ہوں

جب انجم اپنے لیے اس طرح کے یوٹوپیا تراش رہا ہے تو یہ قصور اس کا نہیں یہ چاروں اور پھیلی بے یقینی کی دین ہے، یہ اس بے چہرگی کا خوف ہے جو دھوپ کی چادر انجم کے دامن گیر ہے جس کا اقرار وہ خود کچھ اس طرح کرتا ہے:

نہ جانے کون تعاقب میں ہے میرے انجم
گزر رہی ہے میری زندگی اس ڈر سے

اور یہی خوف اس کی شاعری کا مزاج بن گیا۔

یہ تبصرہ کم وبیش تیس سال پرانا ہے اس دوران انجم نے شاعری میں کئی ایک نئے اُفق تلاشے اور تراشے ہیں جو اس کے چند برس ادھر چھپنے والے دوسرے شعری مجموعے ''شباہت کے سفر'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ آئینے کی سیاست سمجھ میں نہ آ سکی
ہر ایک روز یہ کہتا ہے دوسرا ہوں میں
میں اس کے بعد بھی تو جی رہا ہوں
اکیلا بھی تو بچہ کھیلتا ہے

انجم یوسفزئی پاکستان بھر کے شاعروں میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا اور جس محفل شعروسخن میں جا پہنچتا وہاں سے احباب کو اپنا گرویدہ بنا لیتا۔جس دن وہ رزمک کیڈٹ کالج سے بطور پرنسپل اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر کوہاٹ واپس آیا تھا ،اسی دن شام کو مجھے ادبی صفحہ میں شائع کرنے کے لیے اپنی تین مصرعوں کی نظم ''ساٹھویں سالگرہ'' فون پر لکھوائی تھی:

بجھائی آخری جب موم بتی
ساعت میں بدن چپکے سے گونجا
میں آدھے سے زیادہ مر چکا ہوں

اور اس نظم کے آٹھ برس بعد ہی وہ زندگی کا نا تمام سفر پورا کر کے احباب کو دکھی کر گیا۔شاید احباب کی طرح خود اسے بھی آخری لمحوں میں اس سانحہ کا ادراک ہوا تھا کیونکہ اس نے کہا تھا:

میں روز ڈوبتے سورج کو دیکھتا تھا مگر
مری نگاہ سے اوجھل رہا زوال اپنا

اطراف نما

ارشادعلی صدیقی
(یوایس اے)

نیو میکسیکو کے صحرا سے نکل کر نیویارک آنا یوں لگتا ہے جیسے اچانک کوئی محبوب نخلستان دونوں بانہیں وا کئے منتظر ہو۔ وہ نخلستان عتیق احمد صدیقی صاحب ہے جن کی محبت بار بار کھینچ رہی ہے۔ بلکہ پا بجولاں لاتی ہے۔ ہماری روایتی سوسائٹی کا ماحول یہ ہے کہ جب کسی دعوت پر جائیں تو اپنا مرغا باندھ کر جائیں جب ہم عتیق صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ آپ کب نیو میکسیکو آئیں گے تو تکلف برطرف صاف گوئی سے کہہ دیتے ہیں کہ Who wants to go to that god forsaken place? اس موضوع پر کسی دوسرے وقت حساب دوستاں بیان کریں گے۔ آج ہم جناب ناصر علی سید کی کتاب کی رونمائی میں شامل ہیں کہا جاتا ہے کہ کتاب پڑھنے سے پہلے اگر صاحبِ کتاب سے تھوڑی سی آشنائی ہو تو کتاب کے معانی سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ہم اسی فارمولے کو اپناتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے عزیز عتیق صاحب نے کہا کہ آپ کو بھی کچھ پڑھنا ہوگا۔ یہ دو دن کی بات ہے ساتھ ہی ناصر علی سید کی کتاب ''ادب کے اطراف میں'' ہمارے حوالے کردی ہم کتاب دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور دل بھی ڈوبتا گیا۔ یہ ۳۴۲ صفحات کی کتاب ہے جس میں ۱۳۸ کالم شامل ہیں۔ جس کے اداریے اور فلیپ جدا ہیں۔ ہر کالم کا عنوان ایک مصرعہ ہے ان کالموں میں کیا ہے یہ الگ بات ہے۔ عتیق صاحب کے دل میں کیا ہے وہ بھی ایک بات ہے۔ کیونکہ عتیق صاحب کے بارے میں میں اکثر کہا گیا ہے کہ ''دل دریا سمندروں ڈونگے کونڑ دلاں دیاں جانڑے ہو'' ناصر صاحب البتہ قابل غور اور قابل تحقیق شخص ہے۔ ان کا تعلق پشاور سے ہے اور جس کا تعلق پشاور سے ہو وہ رگ جاں کے قریں ہوتا ہے ان کی اعلیٰ و ارفع خاصیت یہ ہے کہ پشاور کے دبستان ادب وسیاست میں آباد ہیں یا ان سے دبستانِ ادب وسیاست آباد ہے۔ وہ یوسف خان ہوں (جن کا نام دلیپ کمار مشہور ہے) یا پرویز مشرف ان کے اجتماعات ناصر علی سید کی MC کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتے۔ نظر بددور وہ پروفیسر ہیں، کالم نگار ہیں، افسانہ نویس ہیں، TV کے ڈرامے لکھتے ہیں اور پروڈیوسر ہیں، شاعری بھی کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اس دھڑلے سے کہ وہ اردو، پشتو، ہندی، ہندکو میں شعر کہتے ہیں اور خوب شعر کہتے ہیں۔ اپنا ادبی پرچہ بھی نکالتے ہیں۔ اور کیا کیا کرتے ہیں جن کا ہمیں پتہ نہیں لیکن یقین ہے کہ وہ اور بھی بہت کچھ کرتے ہوں گے۔

ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ جب مشاعروں میں ناصر علی سید کو پکارا جاتا ہے تو منتظمین مائک آف کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں کہ وہ انہیں سننا نہیں چاہتے، سب انہیں دل و جان سے سننا چاہتے ہیں آپ بھی یہ کرشمہ سازی دیکھ لیں گے (نہ جانے عتیق صاحب نے یہ Instruction طاہر خان کو دی ہیں یا نہیں؟) ان کے تکلم میں جو قدرتی HiF موجود ہے وہ مائیک کا محتاج نہیں۔ مائیک کی بات تو ہم نے کردی اب سنئے کہ کہتے کیا ہیں۔

محبوب کے طرف داروں میں عشاق کے سینے کے داغوں کی طرح روز بہ روز اضافہ ہوا جاتا ہے۔ آئے دن ایک نیا مسئلہ ایک نئی کھنڈت عشاق کی منزل کھوٹی کرنے کے لیے ایجاد ہوتی ہے۔ جس سے کارِ محبت میں بقا پیدا ہوتا ہے۔ اچھا بھلا سلسلہ بحث جاری تھا کہ نیل آرم سٹرانگ چاند پر جا پہنچا کسی نے نہ پوچھا کہ بھائی کیا زمین کے سارے مسائل حل ہو چکے تھے کہ تم چندا سدھارے۔ اگر چلے ہی ہو تو کیا یہ لازمی تھا کہ واپسی پر چاند کی جلی ہوئی مٹی لے آتے۔ جلی ہوئی سرمئی رنگت اور جلا ہوا چہرہ ہی چاندنی کی کل کائنات سے لیجیے۔ وہ جس کا محبوب کو چاند چاند کہتے منہ خشک ہو جاتا تھا اب وہ منہ چھپائے پھر رہے ہیں۔ بازارِ عشق میں چلنے والا سکہ کھوٹا نکلا۔

اس پر مجھے فراز کا شعر یاد آرہا ہے:

بستیاں چاند ستاروں میں بسانے والو
کرہ عرض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

پطرس کے مزاحیہ مضمون ''سویرے جب میری آنکھ کھلی'' میں تحریر ہے کہ جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں تو اس کتاب کے نوجوان مولفین یہ سوچتے ہوئے دل ہی دل میں ہنسے کہ بھلا دیواریں بھی چوبی ہوتی ہیں اس کی تصیح یوں کی گئی کہ جب کمرے کے چوبی دروازے لرز گئے۔ ساحر لدھیانوی کی مثال ہی لے لیجیے، رات گئے جب محفل سے سارے دوست اپنے اپنے کمروں کو لوٹ گئے تو جذبات سے مغلوب ہو کر ساحر نے چند سطریں کہیں:

تم آباد گھروں کے باسی
ہم آوارہ اور بدنام
میرے ساتھی خالی جام

یہ تو ہوئی ساحر لدھیانوی کی بات، اب ذرا پشاور کی طرف آئیے۔

ہم نے سن رکھا ہے کہ جب پشاور میں کوئی ادبی محفل یا مشاعرہ اختتام کو آتا ہے اور جب لوگ پنڈال سے نکل جاتے ہیں تو باہر سڑک کے کنارے ایک اور ''محفل استادہ'' ہوتی ہے اور بڑے بڑے ہر شعر پر فقرے اچھالے جاتے ہیں۔ شاعروں کے اشعار یا پوری کی پوری غزل جس کو شاعر نے کمال محنت اور محبت کے ساتھ بخیہ گری کی ہو سڑک کے کنارے اس کی بخیہ دری کی جاتی ہے۔ سڑک کی دوسری طرف قہوہ خانے کے سامنے بان کی چارپائی پر آخر شب کا جرعہ، ناب ہاتھ میں لئے ہمہ تن گوش اگر کسی کو سڑک کے اس پار سے سڑک کے اس پار سن سکتے ہیں تو وہ ناصر علی سید ہیں۔

''فیصلے کی گھڑی''

(ناصر علی سید کی نظموں سے کشید)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

نیا عہد نامہ

چلو اٹھو
کہ اپنے فیصلے خود آپ کرنے کی گھڑی آئی
ہمیں اب
''نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر''
یکجان ہونا ہے
ہمیں اپنے سروں پر ہاتھ رکھ کر
خود ہی اپنے آپ سے اِک حلف لینا ہے
نیا اِک عہد کرنا ہے

○

چوتھی ہجرت

محبت اَپسرا بن کر
جب اُس کا دل لبھاتی تھی
ہوا بھی خوشبوؤں کے بوجھ سے
رُک رُک کے چلتی اور ٹھہرتی
اُس کو تکتی تھی
مگر وہ بے خبر ان
بورژوا سوچوں سے بھی کوسوں پرے
حدِ نظر سے بھی ذرا آگے
کسی کی بھیگی پلکوں کے لیے
کچھ خواب چننے خارزاروں پر

○

قائد اعظم کے لیے

جو تیرے نام کا سورج اُجال رکھتے ہیں
ہم اپنے گھر کی سجاوٹ کمال رکھتے ہیں

الگ سمجھتے ہیں جو فرض کو عبادت سے
ہم اُن کے سامنے تیری مثال رکھتے ہیں

○

یومِ کشمیر

ہمیں اک دوسرے کے ہاتھ میں اب ہاتھ دے کر
اک نئی زنجیر کی صورت بنانی ہے
بہت تکیہ کیا اقوام عالم کے ادارے پر
کہ جس کو اک بڑی طاقت کے زخموں کو
رَفو کرنے سے فرصت ہی نہیں ملتی
(جسے کچھ بھی نہ کرنے کے صلے میں اُمن کا اعزاز ملتا ہے)
سو ہم کو خود لہو میں تر کشیدہ قامتوں کے
سُرخ خوابوں کو ہری تعبیر دینی ہے
ہمیں دنیا کے نقشے کو نئی صورت نئی تصویر دینی ہے
ہمیں تاریخ کے نامہرباں موسم میں
شفقت سے بھرے کچھ مہرباں لمحوں کو خود ہی کاشت کرنا ہے
اذّیت کے سفر میں راستوں کو خون سے قندیل کرنا ہے
ہمیں جغرافیہ......تبدیل کرنا ہے

احمد فراز کے لیے

کب کہا تھا کہ مجھے وہم و گماں کھینچتا ہے
ہاں ترا ہجر، مسلسل مری جاں کھینچتا ہے

تو کہ اُس وادیِ حیراں میں الگ مجھ سے ہوا
نیلے پربت کو جہاں زرد دھواں کھینچتا ہے

جھیل اور چاند کے منظر میں اکیلا ہوں کھڑا
یاد ہے تو نے کہا تھا یہ سماں کھینچتا ہے

کن خرابوں میں محبت تری لے آئی ہے
دل مجھے روکتا ہے کارِ جہاں کھینچتا ہے

آج آئینہ نے مجھ سے یہ عجب بات کہی
چہرہ بجھتا ہے تو پھر کارِ زیاں کھینچتا ہے

میں تو بس ایک ہی لحہ کا یہاں ہو جاتا
کشتیِ جاں کو مگر وقت رواں کھینچتا ہے

پابجولاں میں چلا آیا تو ہوں محفل میں
دیکھ دیوانے کو اب کون، کہاں کھینچتا ہے

○

اردو ٹپے

محبتوں کا یہ سفر ہے
ہر اک قدم پہ نئی منزلیں دکھائے

ساری دنیا سے چھپ چھپا کے
وہ ننگے پاؤں میرے پاس دوڑی آئے

اُس کے گھر پانی آ گیا ہے
میں ہوں پنگھٹ پہ دیئے آس کے جلائے

اُس نے جب لال جوڑا پہنا
تو میرے دل میں کئی وسوسے سے آئے

وہ اگر مجھ کو چاہتی ہے
تو میرا نام ہتھیلی سے کیوں مٹائے

میں اندھی شب کا مسافر ہوں
مرے اعصاب پہ وہ چاند بن کے چھائے

جھٹک دے رُخ سے وہ جب زلفیں
تو بدلیوں میں حسیں چاند بھی چھپ جائے

اُسے تو یاد بھی نہیں ہے
میں جھوٹے وعدے پہ اب تک ہوں گھر سجائے

تو نے کھڑکی جو بند کر لی
یہ کم نصیب ترے در سے کہاں جائے

تُو پھیر لے جو مجھ سے آنکھیں
تو اِک ستارہ سا پلکوں پہ جھلملائے

○

گیت

حُسن کے اونچے سنگھاسن پر گوری تیرا روپ
تو ہے صبح کی شیتل چھایا تو جاڑے کی دھوپ

تجھ سے موسم خوشبو مانگیں تجھ ہی سے وہ رنگ
اِس دھرتی آکاش کے سارے جادو تیرے سنگ

تیرے ماتھے جھلمل بندی، کاجل اوڑھیں نین
جیسے سُندر جیسے مُوہن پُورن ماشی رین

جب تو اپنی چھت پر جا کر بالوں کو لہرائے
ساون بھادوں کوئی بھی رُت ہو جل تھل مینہ برسائے

تیری باتیں دو سُخنے ہیں کون مجھے سمجھائے
تیرا بھیتر ایک بجھارت جو بوجھے سو پائے

○

انسپیریشن

آنکھیں جب تک
تیرا چہرہ سوچ نہ لیں
اور
سوچیں تیری جادوئی مسکانیں
جب تک اوڑھ نہ لیں
سچ کہتا ہوں
غزلیں، نظمیں اور افسانے
مجھ سے روٹھے ہی رہتے ہیں

○

ہائیکو

شام کے کُہرے میں
جب بے دم مرغابی گری
نیچے جھیل نہ تھی

ہجر کی بارش تو
کیچڑ سا کر دیتی ہے
اُجلے خوابوں

سگنل سبز تو ہے
آگے بڑھتا کوئی نہیں
سڑکیں خالی ہیں

پھول ہمارے ہیں
پَر بت، جھرنے، ندیا بھی
پر ہم کب اپنے

کُتا بیٹھا ہے
بلی کے بھاگوں چھینکا
ٹوٹا بھی تو کیا

رستہ روکا ہے
سانپ کی نانی نے
گھر میں بین بجا

چاند کی نگری سے
تاروں کی بارات چلی
نیچے نہ آ جائے

○

- ڈرامہ -

زندگی

ناصرعلی سید

سین نمبرا

وقت سہ پہر ریاض کا بیڈ روم: (منظر اوپن ہوتا ہے تو بیڈ پر ریاض اور اس کا دس گیارہ سالہ بیٹا علی ریسلنگ کرتے نظر آتے ہیں، علی ریسلنگ کے اناؤنسر کی طرح پہلے اناؤنس کرتا ہے اور پھر باپ پر مختلف داؤ آزماتا ہے، مگر ریاض اسے زیر کر کے اپنا ہاتھ جیتنے والوں کی طرح اٹھا دیتا ہے، تو علی کہتا ہے)

علی: پاپا آپ ہاتھ نیچے کریں تو پھر میں آپ کا ہاتھ اٹھاؤں گا تو آپ کی Win اناؤنس کروں گا۔

ریاض: اوکے (ہاتھ نیچے کر دیتا ہے جسے علی پکڑ کر نیچے دباتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھا دیتا ہے)

علی: آئی ون، آئی ون

ریاض: اویو چیٹر (پھر اُسے پکڑتا ہے تو علی ریاض کو گدگدی کر کے خود کو چھڑا لیتا ہے اور ایک نئے داؤ سے ریاض کو زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کمرے میں گل (گیارہ بارہ سال کی بیٹی) داخل ہوتی ہے۔

گل: پاپا چائے کے لیے آئیں نا (مسکراتی ہے)

ریاض: ادھر ہی لے آؤ کمرے میں۔ میں ذرا اس چیٹر کی خبر لے لوں۔

گل: توبہ پاپا اس کی چیٹنگز؟ اس کی چیٹنگز تو لڈو کھیلتے وقت دیکھیں۔

علی: ہوں۔ پاپا دس بار میں ایک بار بھی چھکا نہیں آتا اس کا

گل: تمہاری طرح چیٹنگز کروں تو ہر بار آئے گا (باہر سے نازو کی آواز آتی ہے)

آواز: گل۔ گل

گل: آئی امی۔۔۔ پاپا میں چائے لاتی ہوں (جاتی ہے)

(ریسلنگ بدستور جاری ہے)

علی: چلیں یہ بتائیں کہ آج چائے کے ساتھ کھانے کیلئے کیا ہوگا۔

ریاض: (سوچتے ہوئے) شامی کباب؟

علی: او۔۔۔ ہوں

ریاض: کٹلس؟

علی: جی نہیں (چائے کی ٹرالی لے کر نازو اور گل آتی ہیں)

ریاض: اوہ تو پھر گرما گرم پکوڑے (گل پلیٹ اٹھا کر

گل: جی نہیں میٹھے میٹھے پوڑے

ریاض: Wow علی ابھی لیتے ہیں ہم

علی: ایک چھوٹا سا بریک، سوڈونٹ گو اوے مما اینڈ گل

نازو: (مسکراتے ہوئے) لگتا ہے کہ دفتر کی تھکن آپ علی کے ساتھ ریسلنگ کھیل کر اتارتے ہیں۔

ریاض: (ہنستا ہے) پتہ ہے جس دن اسے میں ڈانٹتا ہوں اس دن یہ ضرور ریسلنگ کرتا ہے۔

نازو: (مسکرا کر) کیا مطلب (گل کی انسرشن)

ریاض: جناب ریسلنگ کے بہانے یہ میری خوب خبر لیتا ہے اور اگر خدانخواستہ کسی دن اسے پیار سے ہلکا سا تھپڑ ماروں تو پھر (ہنستا ہے) باقاعدہ میری پٹائی کرتا ہے (پوڑا لیتا ہے)

علی: اوں ہوں۔۔۔ پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔ (پوڑا پاپا کے منہ میں ڈالتا ہے)

نازو: یہ چائے لیں (کپ ریاض کو دیتی ہے)

ریاض: پوڑے بڑے کلاس کے ہیں۔

گل: تھینک یو پاپا

ریاض: کیا مطلب میری شہزادی نے بنائے ہیں؟

علی: جی ہاں۔ (باپ کے کالر پکڑ کر) شہزادے کی فرمائش پر۔

نازو: شہنشاہ معظم جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

ریاض: آپ حکم کریں۔۔۔ ملکہ عالیہ۔۔۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

نازو: حضور جلدی سے چائے پئیں۔۔۔ چینج کر۔۔۔ میں نے آج امجد بھائی کی طرف جانا ہے۔

ریاض: اوہ، مجھے تو واللہ یاد ہی نہیں۔ چلو ون ٹو تھری گو (جلدی جلدی علی گل اور ریاض پوڑے کھاتے ہیں، نازو مسکرا کر انہیں دیکھتی ہے)

سین نمبر۲

آوٹ ڈور کسی سٹیڈیم کی سیڑھیاں (کیمرہ سٹیڈیم کو دکھاتا ہوا سیڑھیوں پر آتا ہے۔ خالی فریم میں نازو اور ریاض اوپر چڑھتے نظر آتے ہیں، کیمرہ اکارڈنگلی اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے) جہاں کیمرہ مین اور فنکار ایک ہی سیڑھی پر رکتے ہیں وہاں نازو سیڑھی پر بیٹھ جاتی ہے اور ریاض ایک سیڑھی اوپر بیٹھ جاتا ہے)

ریاض: کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو میں۔۔۔

نازو: ایک بہت ہی کامیاب انسان ہوتا (شرارتی انداز میں)

ریاض: جی نہیں۔ کامیاب تو میں اب ہوں۔ اور تم ہی نے تو بہاروں سے میرا تعارف کروایا ہے۔

نازو: بہار میری وجہ سے نہیں میرے چمن کے (شاٹ میں علی اور گل سٹیڈیم میں کھیلتے ہوئے انکلوڈ ہوتے ہیں) ان پھولوں کی وجہ سے ہے (اشارہ کرتے

- افسانہ -

ایک محتاط کہانی

ناصرعلی سید

وہ جاتی بہار کی ایک عام سی شام تھی جب میں لان میں کرسی پر بیٹھا ایک پھول کو بوڑھے ہوتے دیکھ رہا تھا وہ چپکے سے میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی میں نے اسے آتے اور کھڑے ہوتے نہیں دیکھا مگر اس کے آنے کے فوراً بعد ہی میں نے مڑ کر اسے دیکھا اس کی مسکراہٹ کسی کھلنڈرے بچے کی سی تھی میں اتنی دیر سے کھڑی ہوں ''تم کہاں کھوئے ہوئے تھے'' وقت کو ناپنے کے اس کے اپنے پیمانے تھے اس لیے میں نے اس کے سوال کا پہلا حصہ اپنے پاس محفوظ کرلیا اور اسے کہا کہ ذرا اس پھول کو دیکھو کیسے اکیلا اور تنہا سا رہ گیا ہے اور کتنی تیزی سے بوڑھا ہورہا ہے۔

''پھول اور بوڑھا'' اس نے ایک ایسا قہقہہ لگایا کہ ایک لمحے کو تو پھول کے چہرے پر بھی نکھار آ گیا جیسے کلی سے دامن چھڑائے اسے زیادہ دیر نہ ہوئی ہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی پھر اپنے لیے چائے بنانے لگی تھی میں اسے دیکھتا رہا۔ بالوں کی ایک جھالرسی اب اس کے چہرے اور میری آنکھوں کے درمیان حائل تھی اور میں اس انتظار میں تھا کہ کب وہ کپ ہاتھ میں اٹھائے اور میں اسے دیکھوں وقت رک سا گیا تھا پھر نہ جانے کتنے ہی ماہ وسال یوں ہی اسی شام کی دہلیز پر سر رکھے سوتے رہے تو پھر میری کہانی کے بارے میں کیا سوچا ''سوچ رہا ہوں کہ کہاں سے شروع کروں'' کیا مطلب؟ آغاز سے اور کہاں سے مگر ابھی آغاز ہوا ہی کہاں ہے تو پھر اختتام سے شروع کردو۔ اس نے پھر قہقہہ لگایا اور بوڑھے ہوتے پھول نے جیسے پھر ایک انگڑائی لی۔ اختتام سے تو مردہ کہانی شروع ہوتی ہے یا کم از کم بوڑھی کہانی جان کنی کے عالم میں تو کھانستی کانپتی اور لرزتی کہانی ہی لکھی جاسکتی ہے کیا مطلب تم میری کہانی یوں لکھوگے یہ کہتے ہوئے وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور میرے لاکھ روکنے پر بھی نہ رکی۔ میں نے بے بسی سے پھول کی طرف دیکھا تو وہ جیسے شکستوں سے چور پتی پتی بکھرنے کی تیاری کررہا تھا تب میں نے ارادہ کیا کہ اسے منانے کے لیے میں اس کی کہانی ضرور لکھوں گا لیکن میں اس شرط کا کیا کرتا جو اس نے لگائی تھی۔ کہانی تو میری ہو مگر میں اس میں نظر نہ آؤں ''کہانی کے اپنے سو(۱۰۰) پردے ہوتے ہیں مگر جس کی کہانی ہو وہ کیسے نظر نہ آئے پھر میں نے کتنی ہی راتیں اسے سوچا اور کہانی لکھنا چاہی مگر کاغذ پر لفظوں کا پہلا پھول بھی نہ کھلا پایا لیکن میری ریاضت میں کمی نہ آئی میں مسلسل یہ سعی ناکام کرتا رہا اور کل شام جب خزاں سے پہلے پھول نے میرے آنگن میں آنکھ کھولی تو جیسے مجھے اس کی کہانی کی الجھی ڈور کا سرا نظر آیا اور تب میں فوراً کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا اسے منانے کے بہانے میں شرابور میں ساری رات اس کی کہانی لکھتا رہا میں نے اس کی جھیل سی نیلی آنکھوں کا ذکر کیا مگر اس کا نام نہیں لکھا۔ میں نے اس کے چہرے پر گری آوارہ اور کھلنڈری زلفوں کی تصویریں بنائیں مگر چہرہ چھپائے رکھا میں نے اس کے جوش جذبات میں کپکپاتے ہوئے رس بھرے ہونٹوں کا مزہ کاغذ پر اتارا مگر لفٹ میں تنہائی کے لمحات کی مستی میز کی دراز میں رکھ دی میں نے قم باذنی کا ورد کرتی مسکراہٹ کا جادو الفاظ میں ڈھالا مگر زندگی پانے والے روگیوں سے آنکھیں پھیر لیں۔ صبح تک یہ کہانی مکمل ہوگئی تھی ایک پردہ دار کہانی لکھنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا مجھے لگا کہ شاید اب میں کبھی کہانی نہیں لکھ پاؤں گا کہانی کی دیوی مجھ سے روٹھ جائے گی کیونکہ میں نے دیانتداری سے کہانی نہیں لکھی مگر وہ تو مان جائے گی اور یہ سودا مہنگا نہیں ہے کہانی لے کر میں اسے منانے چل پڑا۔۔۔تب میں نے اُس کے پاس جا کر اُسے کہانی دی اور کہا دیکھو میں نے کہانی لکھ لی ہے۔۔۔اس نے جیسے سرگوشی سی کی۔۔۔پڑھ کر سنا بھی دو مجھے ٹھیک سے نظر۔۔۔ اور پھر اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔۔۔تو میں لوٹ آیا میرے گھر کے آنگن میں خزاں کے پھولوں کی بہار تھی۔ میں نے چپکے سے ایک کیاری میں وہ کہانی دفنا دی۔ اب اگر بہار کے کسی پہلے شگوفے پر اُس کا نام ابھر آئے تو میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی طرف سے تو بہت احتیاط کی ہے۔

- بقیہ -

بیکسی کے موسم میں

یہ گھر معتبر بھی ہے اور مستند بھی
کہ ہیں اس کی دہلیز پر سر جھکائے۔۔۔ازل بھی ابد بھی
تو اے۔۔۔اس کے اجلے سویروں،
سہانی سی شاموں کے مالک مجھے وہ ہنر دے
کہ میں اپنے گھر کے مکینوں کی آنکھوں کو وہ روشنی دوں
کہ جس سے وہ اپنے ہر اک دکھ کو سکھ میں بدل دیں
کہ وہ بے کل و مضمحل آج کو
ایک مضبوط اور محفوظ کل دیں

یہاں نظم ختم ہوجاتی ہے اور لبوں پر واہ واہ کی بجائے آمین کے لفظ آ جاتے ہیں۔ یہ دعائیہ انداز نظم کی فضا کو ایک گہری سنجیدہ Higher Seriousness عطا کرتا ہے اور ان کی گہری سنجیدگی جو اچھی شاعری کی تخلیق کی بنیاد بھی ہے، جواز بھی اور حاصل بھی!

ہوئے)

ریاض: بے شک ان کی وجہ سے بھی میری زندگی سکھی ہے۔لیکن نازو سچ کہوں تو میرے جیسے بکھرے ہوئے شخص کو سمیٹنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

نازو: کس نے کس کو کمپوز کیا،سمیٹا اس کا حساب تو منزلوں پر بھی نہیں کیا جاتا۔اور ہم تو ابھی چار قدم نہیں چلے ریاض جی۔

ریاض: کہتے ہیں کہ ارادے مضبوط ہوں اور نیتیں صاف ہوں تو پہلے ہی قدم کے ساتھ انسان آدھے سے زیادہ سفر طے کر لیتا ہے اور ہم تو پھر بھی چار قدم آگے آ گئے ہیں۔

نازو: کچھ بھی کہیں،ان باتوں کے لیے ابھی بہت سا وقت پڑا ہے۔

ریاض: لیکن میں نے سنا ہے کہ ارد گرد محبت ہو تو وقت کو بھی پر لگ جاتے ہیں۔

نازو: لیکن میری خواہش ہے کہ محبت کہ یہ دن رک رک کر گزریں۔کاش ان لمحوں کے جگنوؤں کو انسان اپنی مٹھی میں بند کر سکتا۔

ریاض: پاگل نہ ہو تو لمحوں کو کون روک سکتا ہے۔محبت کے دنوں میں سے تو جو بھی ہاتھ آ جائے غنیمت ہے(جونہی ہاتھ پھیلاتا ہے فٹ بال ہاتھ میں آ جاتا ہے،بے اختیار ہنس پڑتا ہے،نازو کی انسرشن ہنستی ہے۔ریاض علی کی طرف واپس بال اچھال دیتا ہے وہ اسے نہیں پکڑ سکتا اور بال سیڑھیوں پر لڑھک جاتا ہے۔کیمرہ بال کو فالو کرتا ہے)

سین نمبر۳

وقت صبح ریاض کا ڈرائنگ روم/ڈائننگ

(ناشتہ کی ٹیبل پر سین اوپن ہوتا ہے کیمرہ ریاض کے ہاتھ میں پکڑے اخبار کے ٹائیٹ شاٹ سے زوم آؤٹ ہوتا ہوا ٹوٹل شاٹ دکھاتا ہے،ریاض کے بائیں طرف نازو اور دائیں طرف گل اور پھر علی بیٹھا ہے۔گل اخبار میں جیسے کوئی خبر پڑھ رہی ہے۔ناشتہ بھی جاری ہے،علی گل کی پلیٹ سے انڈا لے کر آہستگی سے اپنی پلیٹ میں ڈال لیتا ہے۔گل کے ہاتھ میں نوالہ ہے وہ اخبار سے جونہی فارغ ہوتی ہے اور نوالہ اپنی پلیٹ کی طرف بڑھاتی ہے تو علی بولتا ہے)

علی: لگتا ہے اب پلیٹ کھانے کی باری ہے۔

نازو: کیا؟ کیا بات ہے علی(گل کی انسرشن۔لمبی سانس لیتی ہے)

علی: امی انڈا ختم کر کے شاید اب پلیٹ کھا رہی ہے۔

گل: پاپا(روہانسی ہو کر)دیکھیں آج پھر علی میری پلیٹ سے انڈا اٹھا کر کھا گیا ہے۔

ریاض: (مسکرا کر)واپس(اشارہ کرتے ہوئے)(علی جلدی جلدی نوالہ لیتا ہے)

علی: یہ میرا اپنا حصہ ہے پاپا۔

نازو: (مسکرا کر)علی تیرا حصہ تو میری پلیٹ میں آ گیا ہے غلطی سے(علی نازو سے پلیٹ لے لیتا ہے اور گل کو اپنی پلیٹ دے دیتا ہے)

گل: (اپنی پلیٹ نازو کی طرف بڑھاتے ہوئے)آپ کھائیں نا امی۔

نازو: نہیں۔بس میرا دل نہیں ہے تم لو(خالی پلیٹ اپنے قریب رکھتی ہے)

ریاض: آپ کا دل مجھے پتہ ہے کہاں گیا ہے۔

نازو: نجومی صاحب آپ بتا دیں(ریاض اخبار چھوڑ کر اپنی پلیٹ سے آملیٹ نازو کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے)

ریاض: آپ کا دل میری پلیٹ سے انڈا لینے کے لیے آیا ہوا ہے(نازو اسے روکتی ہے)

نازو: آپ کھائیں جی

علی: او کے او کے(گل کو آملیٹ واپس کر دیتا ہے)گل تم امی کا انڈا واپس کر دو اور امی آپ پاپا کا۔

ریاض: اور مجھے دے دو،ہیں نا

علی: (ہنس کر)خیال تو یہ بھی برا نہیں،لیکن میں لنچ بریک میں اپنا حصہ کھا لوں گا۔

ریاض: اوہ نو۔۔۔

نازو: خیریت؟

ریاض: جلدی کرو،علی تیار ہو جاؤ۔

گل: پاپا خیریت تو ہے نا۔

ریاض: لنچ بریک سے یاد آیا کہ آج ہم نے ڈائریکٹر صاحب کو فیئر ویل پارٹی دینا ہے اور سارے(جلدی جلدی چائے کی چسکی لیتے ہوئے)انتظامات میں نے کرنے ہیں۔

علی: تو پھر اپنے ساتھ لنچ باکس نہ لے جاؤں(شرارتی انداز میں)

ریاض: لنچ بکس نا لے جاؤں،چلو جلدی کرو(خود کلامی)

سین نمبر۴

وقت دن کسی ہوٹل/کوٹھی کا پورچ(ریاض اپنے ڈائریکٹر نیازی کو گاڑی تک چھوڑنے آتا ہے ساتھ ہی ساتھ چار پانچ ویل ڈریسڈ مختلف عمروں کے لوگ بھی ہیں)دو چار قدم چل کر یہ گروپ گاڑی تک آتا ہے،ڈرائیور گاڑی کے دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے)۔

نیازی: بہت شکریہ مسٹر ریاض آپ کا اور سب دوستوں کا تھینک یو ویری مچ

ریاض: سر ہم تو ہمیشہ آپ کی محبتوں کے مقروض رہے ہیں اور ساری عمر رہیں گے۔

ایک شخص: ریاض صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں(نیازی کا انسرشن)

دوسرا: آپ نے تو دفتر کو بالکل ایک گھر کا سا ماحول دیا ہے۔

نیازی: اب بھی ایسا ہی ماحول رہے گا،اتنا اچھا ماحول آپ جیسے اچھے دوستوں کی وجہ سے ہی ممکن ہوا ہے۔بہر حال آپ ہیڈ آفس میرے پاس بے

تکلفی سے آسکتے ہیں یہ میں کوئی رسمی جملہ نہیں بول رہا ہوں۔

ریاض: ہمیں معلوم ہے سر(نیازی گاڑی کے قریب آتا ہے) ڈرائیور دروازہ کھولتا ہے نیازی سب سے باری باری ملتا ہے، آخر میں ریاض سے ملتے ہوئے)

نیازی: آئی ہوپ رابطہ رہے گا،تو یہ میری خوشی ہوگی۔

ریاض: شیور سر(نیازی گاڑی میں بیٹھتا ہے شیشہ نیچے کرتا ہے گاڑی سٹارٹ ہوکر روانہ ہوتی ہے، نیازی ہاتھ ہلاتا ہے، گاڑی کے ساتھ کھڑے سب لوگ ہاتھ ہلاتے ہیں، کیمرہ گاڑی کو دور تک جاتے دکھاتا ہے۔)

سین نمبر۵

علی کا کمرہ۔ وقت شام(ایک بیڈ، سٹڈی ٹیبل، کمپیوٹر، دیوار پر ریسلنگ کی تصاویر، ایک دو فلور کشنز، منظر مانیٹر سے شروع ہوتا ہے، کچھ دیر کے بعد علی فریم میں شامل ہوتا ہے، جو ریسلرز کے انداز میں ہاتھ ہلا رہا ہے، تھوڑی دیر بعد گل کمرے میں داخل ہوتی ہے اور علی کی حرکات پر مسکراتی ہے اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے علی کے قریب آجاتی ہے)

گل: علی

علی: (دیکھے بغیر) یس۔

یہ بند کرو اور ذرا ''جیا'' کے گھر سے میرے انگلش نوٹس تو لے کر آؤ۔

علی: تمہاری نوٹ بک جیا کے گھر مہمان گئی ہوتی ہے(شرارتی انداز میں)

گل: جی نہیں۔کل وہ اسکول نہیں آئی تھی اور اُسے کل کا کلاس ورک کاپی کرنا تھا۔

علی: آپ کے سکول میں کسی نے آپ کو ابھی تک نہیں بتایا کہ نقل کرنا اچھی عادت نہیں۔

گل: تو میرے ساتھ فضول بحث کرنے کی بجائے اگر نوٹ بک لے آؤ تو زیادہ بہتر ہوگا۔

علی: زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں یہ CD دیکھوں کہ اس کے بعد شان مائیکل اور انڈرٹیکر کی ریسلنگ ہے۔

(نازو آکر دروازے میں کھڑی ہوجاتی ہے)

گل: شان مائیکل سی ڈی سے نکل کر غائب نہیں ہوسکتا۔نوٹ بک لے آؤ اور پھر دیکھتے رہو۔

علی: تو جیا کو کہہ دو کہ وہ سعدی کے ہاتھ نوٹ بک بھجوا دے۔

گل: بس بس دیکھو میں نے ہی تمہارا فیور کیا ہے۔

علی: میرا فیور!(ماں اندر آتی ہے)

گل کیوں، وہ سڑے ہوئے سلائس پر جیم لگا کر مجھے نہیں دیا تھا، مما کو بتلا دیتی تو!

علی: مما مجھے کچھ نہیں کہتیں

نازو: جی ہاں مما کے چہیتے(دونوں یک دم کہتے ہیں) مما کچھ نہیں کہتی (کان پکڑتی ہے)

علی: مما السلام علیکم(گھبرا کر)

نازو: (مسکرا کر)وعلیکم السلام،گل کیا بات ہے۔

گل: مما وہ جیا کے پاس میری انگلش کی نوٹ بک ہے۔

علی: میں یہ گیا اور دو منٹوں میں نوٹ بک لے کر واپس آیا، گل تم ذرا یہ سی ڈی بند کر کے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر دو۔

نازو: گڈ۔کتنا خیال رکھتا ہے اپنی بہن کا۔

علی: مما میں تو پہلے ہی جا رہا تھا لیکن کہتی ہے کہ شان مائیکل اور انڈرٹیکر کی ریسلنگ دیکھ کر جانا۔

گل: (چیختی ہے) کیا،کیا۔۔۔کس نے کہا۔۔۔بتاتو۔

علی: (منہ چڑا کر) میری پیاری پیاری بہن نے۔اور کس نے(بھاگ جاتا ہے)

گل: مما(نازو مسکراتی ہے)

نازو: مجھے معلوم ہے، ذرا اس کو واپس آجانے دو(علی یکدم دروازے سے پھر داخل ہوتا ہے)

علی: کس نے مجھے آواز دی ہے۔

نازو: اچھا تم ابھی تک گئے نہیں(نازو قدم آگے بڑھاتی ہے تو علی بھاگ جاتا ہے)

سین نمبر۶

ریاض کا بیڈروم/وقت رات(ریاض بیڈ پر لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔سائیڈ ٹیبل پر ٹیپ پر وائلن کی کیسٹ چلے ہورہی ہے۔کیمرہ وہ کتاب کے ٹائٹل(مرجانی جزیروں کی سرزمین) کے منظر سے اوپن کرتا ہے، چند لمحوں کے بعد قہوہ دو کپ میں لے کر نازو آتی ہے۔کپ میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھتی ہے۔

نازو: ہیلو۔۔۔ہیلو۔۔۔(ریاض بیٹھتے ہوئے کتاب رکھتا ہے) یہ آپ کون سے جزیروں میں پہنچے ہوئے ہیں!

ریاض: ہم نے کہاں جانا ہے ہم تو خود آپ کی محبت کے سمندر میں گرفتار ایک جزیرہ ہیں۔

نازو: لیکن گرفتار لوگ تو ہمیشہ رہائی کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں(قہوہ دیتی ہے)

ریاض: جی نہیں، یہ فیصلہ ہمارے دل کی عدالت نے کیا ہے اور اس جیسے فیصلوں کے قیدی ''اب رہائی ملے بھی تو مر جائیں گے'' کے زیادہ قائل ہوتے ہیں۔

نازو: (کتاب اٹھاتے ہوئے) مگر مرجانی جزیروں کی سرزمین کی اپنی

ایک کشش ہے یہ کوئی آسٹریلیا کے جزیرے تو نہیں!

ریاض: نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ یہ مالدیپ کا سفرنامہ ہے کہتے ہیں کہ مالدیپ پہنچو تو ایسا لگتا ہے نیلا نیلا آسماں زمین پر آ گیا ہے یا پھر حد نظر تک فیروزے کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

نازو: wow (کتاب رکھتی ہے) پھر تو اس کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی (ہنستی ہے) کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ ''فیروزہ'' میری کمزوری ہے۔

ریاض: اسی لیے تو ہم مرجانی جزیروں میں سانس لیتے رہتے ہیں۔

نازو: جی ہاں کہتے ہیں (کیسٹ بند ہو جاتی ہے تو الٹ دیتی ہے) آپ کا ڈائریکٹر آ گیا ہے کوئی۔

ریاض: ایک آدھ دن میں پہنچنے والی ہے۔

نازو: پہنچنے والی ہے؟ کیا کوئی خاتون ہے؟

ریاض: جی۔۔۔جی۔۔۔شہناز ہمایوں۔

نازو: ہیڈ آفس سے آ رہی ہے؟

ریاض: آ۔۔۔ہاں۔۔۔ویسے کچھ دن پہلے ہمارے فن لینڈ کے آفس سے آئی ہے۔

نازو: پھر اس کا یہاں کیا دل لگے گا۔

ریاض: میں نے بھی سنا ہے کہ تھوڑے سے عرصے کے لیے آ رہی ہے۔۔۔ بچے کہاں ہیں؟

نازو: گل سٹڈی کر رہی ہے اور علی منکے اور کشن کے ساتھ ریسلنگ کھیل رہا ہے۔

ریاض: توبہ۔۔۔کل کہہ رہا تھا کہ پاپا آج تک ایک منکا بھی میرے سے نہیں جیت سکا۔

نازو: (ہنستی ہے) پہلے دن رات ویڈیو گیمز تھیں اور اب ریسلنگ کا جنون چڑھا ہوا ہے۔

ریاض: یہ اچھا ہے کہ نمبر اچھے آتے ہیں، تم ذرا اسے بلاؤ (نازو مسکرا کر جاتی ہے) اسے کہنا ہے کہ اپنے منکے وغیرہ بھی اپنے ساتھ لیتا آئے (نازو مسکرا کر لک دیتی ہے)

نازو: اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔(نکلتی ہے) کیمرہ ریاض پر وہ دوبارہ کتاب اٹھاتا ہے۔

سین نمبر ۲

امجد کے گھر کا لان/سہ پہر (نزہت کپ میں چائے ڈالتی ہے)

نزہت: کل بھی امجد آپ کا پوچھ رہا تھا کہہ رہا تھا کہ رات نازو کی طرف چلیں گے اور پھر دس بجے گھر واپس آئیں گے۔

نازو: اس کا تو جیسے دوستوں میں سانس ہے، شادی سے پہلے بھی اس کا یہی حال تھا۔

نزہت: تو شادی کے بعد بھی میں نے پابندی نہیں لگائی۔

نازو: (ہنستی ہے) وہ کس کی مانتا ہے۔

نزہت: شروع شروع میں تو آغا جی کو خدا بخشے ڈانٹ دیتے تھے مگر لو بڑی عمر ہے وہ آ گئے (نزہت کے پوائنٹ آف ویو سے امجد کی گاڑی گیٹ میں داخل ہو کر پورچ میں کھڑی ہوتی ہے، امجد گاڑی سے نکل کر لان میں آتے ہیں)

نازو: چلو آج تو کم از کم وقت پر آ گئے (رازدرانہ لہجے میں) آؤ تھوڑا اسے تنگ کرتے ہیں۔

نزہت: جی کہیں پھر ڈنر کا پروگرام نہ بنا ہو (امجد آتا ہے)

نازو: گھر حاضری لگا کر پھر وہی امجد اور پھر وہی دوست، تو ٹھیک کہتی ہے نزہت!

امجد: السلام علیکم! خیر کے ساتھ۔۔۔خیر کے ساتھ آئیں۔ لگتا ہے کہ نزہت نے کوئی شکایت لگائی ہے۔

نزہت: شکایت کا بھاری پتھر میں نے بہت پہلے چوم کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔ ہے نا نازو! (ہنستی ہے)

نازو: بالکل۔۔۔بالکل۔۔۔امجد میرے بھائی تمہیں اتنا وقت نہیں ملتا، ذرا چکر لگاؤ۔ چلو بہن نہیں بھائی اور بھانجا اور بھانجی بھی یاد نہیں آتے۔

امجد: لو۔۔۔بہنیں بھی یاد آتی ہیں (ہنستا ہے) بہنوئی بھی، بھانجا بھی اور بھانجی بھی، کل واللہ میں نے نزہت سے کہا رات باجی کی طرف چلیں، کیوں نزہت۔

نزہت: (شرارتی انداز میں) کل نہیں مجھے یاد نہیں، آپ نے تو بہت دن ہوئے باجی کا ذکر بھی نہیں کیا۔

امجد: اری چالاک۔۔۔(ہنستا ہے) واللہ ویسے ہی چالاکی کر رہی ہے باجی، میں سچ کہتا ہوں، یہ ویسے ہی۔

نازو: سچ کہہ رہی ہے نا، کہا ہوتا تو آ نا جاتے۔

نزہت: ہوں۔۔۔صحیح۔۔۔صحیح۔۔۔(سر ہلاتی ہے)

امجد: خاموش۔۔۔جاؤ میرے لیے گرم گرم چائے لے کر تو آؤ۔

نزہت: چائے گرم ہے میں نے ابھی گھونٹ بھی نہیں لیا، آپ لے لیں، ویسے گرم چائے کی بجائے لگتا ہے کہ آپ کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے۔

امجد: کوئی بات نہیں۔۔۔باجی نے آخر اپنے گھر تو جانا ہے نا (مصنوعی غصہ)

نازو: شاباش ہے تمہارا۔۔۔ابھی آئی نہیں ہوں اور واپسی کا تم نے سوچ لیا ہے۔ چل نزہت اللہ حافظ میں جاتی ہوں (کھڑی ہونے کی کوشش کرتی ہے نزہت بٹھا لیتی ہے)

نزہت: یہ گھر آپ کا ہے، صرف بھائی کا نہیں آپ کی بھابھی کا بھی ہے (ہنس پڑتی ہے)

امجد: مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ نے میرے خلاف محاذ تیار کیا ہوا ہے۔۔۔بچے ساتھ نہیں آئے۔

نازو: ان کا استاد آیا ہوا تھا، مجھے ریاض ڈراپ کر گئے ہیں، ان کی کوئی میٹنگ ہے۔

امجد: اس وقت؟

نازو: ہاں۔ان کی کوئی نئی ڈائریکٹر آئی ہے، ان کو شاید بریف کرنا ہے۔

امجد: اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔آپ چائے تو لیں (کپ اٹھاتی ہے)

سین نمبر ۸

ریاض کا دفتر/ شام کے وقت (ایک کمپیوٹر آپریٹر کام کر رہا ہے، ریاض مانیٹر پر انگلی رکھتے ہوئے)

ریاض: یہاں تک کی رپورٹ ہم نے بھیجی ہوئی ہے۔انور آگے جاؤ

انور: یس سر (مانیٹر پر کچھ اور فائل کھلتی ہیں)

ریاض: یہ سب سٹیٹمنٹ ابھی پراسس میں ہیں، ان کو ہم ایڈٹ بھی کر سکتے ہیں، باقی آپ جس طرح کہیں۔

(اب کیمرہ شہناز کو انکلوڈ کرتا ہے جو کھڑی مگ میں چائے پی رہی ہے)

شہناز: دیکھو مسٹر ریاض (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) مجھے ریکارڈ پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ کار کچھ مناسب نہیں (بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہے)

ریاض: تھینک یو میڈم آپ اگر تھوڑا سا آئیڈیا دے دیں تو انشاء اللہ اسی طرح کام ہونگے۔

شہناز: او کے اصل میں باہر اس طرح کے کاموں میں آسانیاں پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ہم سب کام کو ایک پہیلی بنا لیتے ہیں۔اور پھر جب تک کوئی ایکسپرٹ نہ ملے تو کام ٹھپ ہو جاتا ہے۔آخر کمپیوٹر کا کیا فائدہ ہے۔

ریاض: یہ تو میں مانتا ہوں کہ ہم لکیر کے فقیر ہونے میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔

شہناز: اس سب کچھ کا احساس انسان کو باہر زیادہ ہوتا ہے آپ شاید کبھی باہر نہیں گئے ہیں۔

ریاض: (مسکرا کر) ابھی تک دانہ پانی یہیں پر لکھا ہوا ہے۔

شہناز: خوب۔۔۔ویسے دانہ پانی کیلئے دور جانا پڑے تو اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

انور: سر اور چیک کریں گے (ریاض شہناز کی طرف دیکھتا ہے)

شہناز: او۔کے

سین نمبر ۹

علی کا کمرہ (علی اور گل لڈو کھیل رہے ہیں) علی پانسہ چھین لیتا ہے اور پھر گن کر خانے چلتا ہے جو نہی گوٹی رکھتا ہے)

گل: پھر۔۔۔پھر۔۔۔ذرا گنو (علی گنتا ہے) یہاں کیوں، تمہاری گوٹی کہاں پڑی ہے۔

علی: کیوں۔یہاں ہی پڑی تھی۔

گل: جی نہیں۔تمہارا تین آیا تو یہ۔۔۔ایک دو تین، یہاں۔ پیچھے لاؤ گوٹی۔

علی: کیوں اس سے پہلے دو نہیں آیا تھا۔

گل: وہ تو تم نے دوسری بار گوٹی کو آگے بڑھایا تھا (علی آہستہ سے ایک گوٹی اٹھاتا ہے)

علی: خوش ہو جاؤ (گوٹی پیچھے کرتا ہے) (گل پانسہ پھینکتے پھینکتے)

گل: ہیں، یہاں سے تمہاری گوٹی کہاں گئی (دوسری کی طرف اشارہ کرتی ہے)

علی: یہ کیا پڑی ہوئی ہے۔

گل: جی نہیں۔۔۔جو وہاں پڑی ہوئی تھی۔

علی: کیا خواب دیکھ رہی ہو۔۔۔وہ تو کب کی نکلی ہوئی ہے۔

گل: یہاں رکھو گوٹی۔نہیں تو میں نہیں کھیلتی۔

علی: تم روتی ہو تو میں رکھ لیتا ہوں (ہارن کی آواز آتی ہے) لگتا ہے پاپا آ گئے (اٹھتا ہے)

سین نمبر ۱۰

ریاض کا بیڈروم: نازو کرسی پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے کہ ریاض داخل ہوتا ہے، سلام کرتا ہے نازو جواب دیتی ہے۔

نازو: خیر سے آ گئے ہیں۔

ریاض: جی، لگتا تو یوں ہی ہے کہ خیر کے ساتھ آ گیا ہوں۔ (بیڈ پر بیٹھ کر بوٹ اتارتا ہے، پھر ٹائی کھولتا ہے)

نازو: کیا مطلب؟

ریاض: نئی ڈائریکٹر کو دیکھ کر تو مجھے ''بال کی کھال نکالنا'' کے معنی سمجھ آ گئے ہیں، باہر یوں ہوتا ہے، باہر اس طرح کام ہوتے ہیں، یہ کام تو باہر نہیں ہوتا، وہ ہر کام کو باہر کی عینک سے دیکھتی ہے۔

نازو: خیر ہے۔ ہر نیا آدمی اپنی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ایسے ہی کرتا ہے۔آپ چینج کریں میں کھانا لگاتی ہوں۔

ریاض: نہیں کھانے کو تو دل نہیں کرتا، آپ نے کھانا کھا لیا ہے نا۔

نازو: جی بچوں نے کھا لیا ہے۔

ریاض: اور تم نے؟ (نازو انکار میں سر ہلاتے ہوئے)

ریاض: اوہو۔۔۔میں نے اسی لیے فون کر دیا تھا کہ آپ کھا لیں۔

نازو: میں نے کچھ کہا تو نہیں ہے نا آج تک آپ کے بغیر کھایا ہے کبھی۔

ریاض: اچھا جاؤ لے آؤ۔۔۔کھا لیتے ہیں۔۔۔میں تو تھکا ہوا ہوں۔اس لیے کہا ہے کہ میں ایک کپ چائے پی لوں گا۔

نازو: ٹھیک ہے میں چائے بنا لیتی ہوں۔

ریاض: نہیں اب موڈ بن گیا ہے، تم جاؤ کھانا لے آؤ۔ بڑا چھوٹا سا دل ہے(جانے لگتی ہے)

نازو: جب اچھی طرح پتہ ہے تو پھر(دروازے سے ہٹ کر کہتی ہے)

ریاض: سوری بابا۔۔۔آئی ایم سوری(نازو مسکرا کر چلی جاتی ہے)

سین نمبر ۱۱

ریاض کا ڈائننگ (نازو گل کے ساتھ کھڑی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہی ہے اور اس کا ربن ٹھیک کر رہی ہے گل اپنا بیگ کھولتی ہے کتابیں دیکھتی ہے، اتنے میں ہارن کی آواز آتی ہے)

گل: مما۔۔۔میں ایک منٹ میں آئی۔

نازو: گل پاپا ہارن دے رہے ہیں جلدی کرو اور علی کو بھی بلاؤ۔

گل: بس آئی امی(بھاگتی ہوئی اندر جاتی ہے۔علی آتا ہے)

نازو: علی جلدی کرو بیٹے۔۔۔لو ابھی تک لیسز نہیں باندھے۔

علی: بس ایک منٹ(ہارن پھر بجتا ہے)آج میرا خیال ہے، پاپا کو جلدی ہے۔

نازو: جی نہیں آپ کو دیر ہو گئی ہے۔(گل کتاب لے کر آتی ہے، بیگ میں رکھتی ہے اور پھر بیگ اٹھاتی ہے)

(ہارن کی آواز)چلو بیٹے جلدی کرو(علی لیسز باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، نازو دونوں کو پیار کرتی ہے، بچے سلام کرتے ہیں، نازو جواب دیتی ہے) خدا حافظ(ہاتھ ہلاتی ہے)

سین نمبر ۱۲

ریاض کا دفتر: سٹینو بیٹھی فائل کو جیسے پڑھ رہی ہے کہ بزر ہوتی ہے (فون اٹھاتی ہے)

سٹینو: جی میڈم، ریاض صاحب تو ابھی تک نہیں آئے۔۔۔جی بہتر۔۔۔جی(فون رکھتی ہے تو ریاض آتے ہیں)میڈم آپ کو یاد کر رہی تھیں۔

ریاض: ہوں، اوکے۔(ریاض دروازہ کھول کر اندر جاتا ہے، اندر شہناز اخبار پڑھ رہی ہے)

شہناز: مسٹر ریاض آپ آج دیر سے آئے ہیں(مسکراتی ہے) یا میں جلدی آ گئی ہوں۔

ریاض: جلد یا دیر سے آنے کے فیصلے اب ہمارے اختیار میں نہیں رہے۔

شہناز: کیا مطلب۔

ریاض: میرا مطلب ہے یہ فیصلے اب سڑکوں پر ٹریفک کے اختیار میں ہیں، کبھی کبھی تو سب چوراہوں پر آپ کو سبز سگنل سے واسطہ پڑتا ہے اور کبھی کبھی ہر ایک چوراہے میں لال بتی آپ کے وقت کے سارے پیمانے درہم برہم کر دیتی ہے۔

شہناز: ٹریفک تو باہر بھی بہت ہے، اور لال بتی ہر چوراہے پر ہے مگر وہاں لوگ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت کرتے ہیں۔۔۔خیر۔۔۔آج ہم نے سائٹ دیکھنے جانا ہے۔

ریاض: جی بالکل۔۔۔آپ جس وقت چاہیں۔

شہناز: میں یہاں بہت تھوڑے عرصے کے لیے آئی ہوں، میری خواہش ہے کہ تھوڑے عرصے میں بہت سارے کام نمٹا لوں۔شاید اسی لیے میں آفس جلدی آ جاتی ہوں۔

ریاض: یا پھر عادت ہے، وہاں لوگوں کے پاس پیسہ زیادہ اور وقت کم ہے اور ہمارے پاس پیسہ کم اور وقت زیادہ ہے، چلیں پھر چلتے ہیں۔

سین نمبر ۱۳

ریاض کا ڈرائنگ روم (نازو فون پر نمبر ملاتی ہے)

نازو: ہیلو۔۔۔ریاض صاحب سے بات کرا دیں۔۔۔ ہوں۔۔۔اچھا۔۔۔کوئی اندازہ ہے کب تک آ جائیں گے۔۔۔آ جائیں تو ذرا بتا دیجیے گا۔شکریہ۔۔۔او کے۔

(ریسور رکھتی ہے) لو جی وہ تو اپنے ڈائریکٹر صاحب کے ساتھ سائٹ دیکھنے گئے ہیں۔

(اب نزہت بھی شامل ہو جاتی ہے)

نزہت: لو۔۔۔تو میں ابھی تک اس غلط فہمی میں تھی کہ آپ ان کی ڈائریکٹر ہیں۔۔۔(ہنستی ہے) موبائل پر بات کر لیں نا۔میرا مطلب ہے اجازت لے لیں۔

نازو: نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔بس ٹھیک ہے بچوں کے آنے تک ہم واپس آ جائیں گے نا۔

نزہت: کیوں نہیں۔۔۔اس وقت رش نہیں ہوتی۔۔۔اور پھر ہم نے ایک دکان تک ہی تو جانا ہے(کھڑی ہو جاتی ہے)

سین نمبر ۱۴

آؤٹ ڈور(گاڑی میں شہناز اور ریاض کو ایک دو سڑکوں سے گزرتے دکھایا جاتا ہے) پھر گاڑی شہر سے باہر ایک کھلے میدان کے پاس رک جاتی ہے۔دونوں گاڑی سے اترتے ہیں۔

ریاض: اسی جگہ کے بارے میں بات چیت چل رہی ہے، لیکن یہ شہر سے ذرا دور ہے۔

شہناز: مجھے آپ کی طرح فلسفیانہ گفتگو تو نہیں آتی مگر وقت کی طرح فاصلوں کے پیمانے بھی اب کچھ اور ہو گئے ہیں۔

ریاض: جی ہاں۔۔۔دنیا اب سمٹتی جا رہی ہے۔

شہناز: اور لوگ ایک دوسرے سے قریب آ رہے ہیں، ہے نا ریاض صاحب۔

ریاض: جی؟۔۔۔جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔آپ کہتی ہیں تو میں بات فائنل کر دیتا ہوں۔

ریاض: میرا مطلب ہے اس جگہ کی ڈیل۔

شہناز: ہوں۔۔۔ہاں۔۔۔ہاں۔

ریاض: چلیں آپ کو دوسرا پراجیکٹ بھی دکھادوں (دونوں آتے ہیں گاڑی میں بیٹھتے ہیں کیمرہ فالو کرتا ہے)

سین نمبر ۱۵

ریاض کا ڈرائنگ روم: (علی اپنا زو باکس میز پر رکھے مختلف جانوروں کے ساتھ یوں کھیل رہا جیسے کوئی کہانی چل رہی ہے، خود ہی بڑبڑا رہا ہے)

علی: ہوں۔ میں جنگل کا بادشاہ ہوں۔ پیش کرو ہاتھی کو اور بارہ سنگھے کو۔ دونوں کی ریسلنگ کراؤ (دونوں کو آپس میں لڑا کر کبھی ایک کبھی دوسرے کو نیچے گراتا ہے۔ نازو ٹرالی لے کر آتی ہے، پیچھے پیچھے گل بھی ہے)

نازو: علی۔ پھر تمہارا ''زو'' ڈرائنگ روم میں آ گیا ہے۔

گل: تو پھر کہے گا میرا ایلی فنٹ کہاں چلا گیا۔ مما کل کہہ رہا تھا۔ میں ایلی فنٹ ہوں (ہنستی ہے)

علی: نہیں۔ ایلی فنٹ ریسلنگ میں ہار گیا اور وہ بھی بارہ سنگھے سے۔ آج میں بارہ سنگھا ہوں۔

نازو: یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ کبھی ہارنے والے کا ساتھ بھی دینا چاہیے (بچے مسکراتے ہیں)

گل: مما۔ پاپا کے کام کچھ زیادہ نہیں ہو گئے۔ رات کو بھی دیر سے آئے تھے۔

علی: بالکل۔۔۔ میں نے بھی بہت دن ہو گئے پاپا کے ساتھ ڈشوں ڈشوں نہیں کیا، آج رات ریسلنگ ضرور دیکھئے۔ علی ورسز پاپا۔

نازو: اگر وقت پر آ گئے۔

سین نمبر ۱۶

(کم روشنی والے ایک رستوران میں شہناز اور ریاض بیٹھے ہیں)

شہناز: وقت بچپن کی سہیلی کی طرح ہوتا ہے جس کے کانوں میں آپ سرگوشی بھی کر سکتے ہیں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دریا کی ٹھنڈی ریت پر ننگے پاؤں دوڑ بھی سکتے ہیں۔۔۔لہرا لہرا کر ہنس بھی سکتے ہیں اور ضرورت پڑے تو اس کے کندھوں پر سر رکھ کر رو بھی سکتے ہو۔

ریاض: ویری رومینٹک (مسکرا کر) میم وقت کی تتلی پکڑنے کی کوشش میں کبھی کبھی انسان اپنوں سے بچھڑ بھی جاتا ہے بس مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔

شہناز: یہ تو ایک مفروضہ ہے، ایک پرسیپشن، آسمان کو ہاتھ لگانے کی خواہش تو بچپن سے انسان کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی ہے۔

ریاض: آسماں کو چھونے کی کوشش میں زمین سے پیر نہ ہٹیں تو کوئی حرج نہیں، ہمارے پیروں میں بہت ساری زنجیریں پڑی ہیں۔ کہیں سفر میں پیر تھک جائیں تو کوئی بات نہیں، مگر بعض سفر ایسے ہوتے ہیں جن میں پیر تو نہیں دل تھک جاتے ہیں۔

شہناز: کچھ فیصلے دماغ سے بھی کرنے چاہئیں۔ دل کے فیصلوں پر پچھتاوے کا امکان ہوتا ہے۔ دماغ کے پاس ایسے فیصلوں کے لیے سو دلیلیں ہیں۔

ریاض: تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ چاروں طرف سے ایک مضبوط اور محفوظ باکس میں بند ہوتا ہے۔

شہناز: اس دن تم نے لال لائٹ پر رکنے کا گلہ کیا تھا، مجھے یقین ہے کہ تم اب سبز سگنل پر زیادہ دیر رکنے کا رسک نہیں لو گے، نہیں تو پیچھے آنے والوں کے ہارن تمہارے کانوں کے پردے پھاڑ دیں گے۔

ریاض: (مسکرا کر) فی الحال تو باہر جانے یا نا جانے کے فیصلے کے دباؤ کے نیچے میرے دل کی رگیں پھٹ رہی ہیں۔

شہناز: مائی ڈیئر۔ دل کو اس سارے کھیل سے مائنس کرنا پڑے گا۔

ریاض: یہ بات دل پر ہاتھ رکھ کر شائد کوئی بھی نا کہہ سکے گا۔

شہناز: جی۔۔۔؟اوہ۔۔۔آ۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔اچھا مکالمہ ہے۔

ریاض: پھر اس کے انعام میں اگر چھٹی مل جائے تو چلیں۔

شہناز: (مسکرا کر) آپ درخواست دے دیں Let us see

سین نمبر ۱۷

ریاض کا بیڈ روم/ وقت رات (نازو ایک کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھی ہے۔ پڑھتی ہے، بند کرتی ہے، پھر کھولتی ہے، پھر پڑھتی ہے بند کرتی ہے، پھر اٹھ کر کمرے میں پھرتی ہے، پھر بیٹھ کر کتاب اٹھاتی ہے، کچھ دیر بعد ہارن کی آواز آتی ہے تو کھڑکی کے پاس جا کر پردہ ہٹا کر نیچے دیکھتی ہے۔ Cut اس کے پوائنٹ آف ویو سے ٹاپ شاٹ میں گاڑی گیٹ سے اندر آتی نظر آتی ہے۔

سین نمبر ۱۸

ریاض کا ڈرائنگ روم/ وقت دن (گل اور ریاض صوفے پر بیٹھے ہیں، گل اپنی نوٹ بک ریاض کو دکھا رہی ہے، ریاض سر ہلا کر خوشی کا اظہار کر رہا ہے)

ریاض: ویری گڈ۔۔۔ان تمام لسٹوں میں تمہارے نمبر اچھے ہیں مگر یہ یہ کم ہیں۔

گل: پاپا 91% مارکس کم ہیں۔ فرسٹ آئی ہوں کلاس میں۔

ریاض: نہیں ویسے تو بہت ہیں مگر 95% سے کم ہیں۔
گل: وہ تو پاپا (مسکراتی ہے) مگر آپ کو پتہ ہے کہ سیکنڈ آئی ہے صدف اور اس کے مارکس ہیں 83%
ریاض: اوکے۔۔۔اوکے میں تو مذاق کر رہا تھا، لیکن وہ شہزادہ کہا ہے (علی آتا ہے)
علی: شہزادہ حاضر ہے۔
ریاض: تم کہاں تھے۔
علی: مما کے ساتھ کچن میں
ریاض: گڈ۔۔۔مما کے ساتھ کام کرنے کے لیے۔
گل: کام تو ہے پاپا جس دن مما کڑھی کے لیے پکوڑے بناتی ہے علی کچن سے نہیں ہلتا۔
علی: جی نہیں، میں نے تو ہاٹ پاٹ پکڑا ہوا تھا اور مما اس میں پکوڑے رکھ رہی تھیں۔
ریاض: (گل کی طرف دیکھتے ہوئے) میرا شہزادہ پکوڑے نہیں کھاتا (پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر رازدرانہ لہجے میں علی منہ پر پکوڑہ لگا ہوا ہے صاف کر لو جونہی علی منہ صاف کرتا ہے گل اور ریاض ہنسنے لگتے ہیں)
ہاں جی۔۔۔کیسی ٹرک تھی۔۔۔اب ہو گیا نا ایک پوائنٹ
علی: یہ پوائنٹ تو میں ابھی ختم کر دیتا ہوں (گل مسکراتی ہے)
ریاض: وہ کیسے؟
علی: چلیں آپ میرا ہاتھ پکڑیں اور میں ایک سیکنڈ میں چھڑا تا ہوں۔
ریاض: ڈن
علی: ڈن (علی ہاتھ آگے کرتا ہے ریاض پکڑ لیتا ہے) دونوں ہاتھوں سے پکڑیں (ریاض ہاتھ پکڑ لیتا ہے علی کچھ پڑھ کر ہاتھ پر پھونکتا ہے) ایک سیکنڈ پاپا آپ تھوڑا چھوڑیں میں بتاتا ہوں (ریاض ہاتھ چھوڑ دیتا ہے) آہا۔۔۔آئی ون۔۔۔آئی ون۔۔۔ناچنے لگتا ہے۔
ریاض: او یو چیٹر (تینوں ہنستے ہیں)

سین نمبر۱۹

امجد کے گھر کا لان/ سہ پہر (نزہت اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ جیسے کہیں جانے کے لیے تیار ہیں بیٹا نومی اور بیٹی کرن کے ساتھ جیسے کہیں جانے کے لیے تیار ہیں۔نومی اور کرن ایک کرسی کے گرد میوزیکل چیئر گیم کھیل رہے ہیں) (نزہت ''کارڈلیس'' پر کوئی نمبر ڈائل کر رہی ہے اور سخت کڑھ کر بند کرتی ہے، پھر ملاتی ہے ہارن کی آواز کے ساتھ ہی امجد کی گاڑی گیٹ سے داخل ہوتی ہے نزہت ''کارڈلیس'' میز پر رکھتی ہے۔بچے امجد کی طرف بھاگتے ہیں اور پھر تینوں لان کی طرف آتے ہیں)
نزہت: جناب دفتر کا فون کس خوشی میں اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔
امجد: کوئی نہیں، گھنٹی بھی نہیں بجی نمبر غلط ملایا ہوگا۔
نزہت: کیوں نہیں، پہلی بار جو ملا رہی ہوں۔
امجد: میرا خیال ہے اصل بات بتا دوں (بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہیں)
نزہت: ضرور۔۔۔ضرور کسی کے ساتھ چلے گئے ہونگے۔
امجد: نزہت۔۔۔باز آجاؤ۔
نزہت: آپ تو کوئی اصل بات بتا رہے تھے۔
امجد: ہاں، میں نے کہا کہ فون کی بجائے تمہاری آواز اپنے کانوں سے سننے کا اپنا ہی ایک مزا ہے۔
نزہت: خوب، میں بھی دیکھوں گی۔
امجد: (حیران ہو کر) کیا
نزہت: فلم
امجد: فلم؟ کونسی فلم
نزہت: جس فلم کا ابھی ڈائیلاگ ادا کیا ہے۔
امجد: یعنی اب ہماری باتیں فلمی ڈائیلاگ ہو گئی ہیں۔
نزہت: اب چلیں
امجد: میرا خیال ہے ایک کپ چائے نہ ہو جائے (شرارتی انداز میں)
نزہت: آپ یہاں بیٹھ کر چائے کا انتظار کریں اور میں امی کے ہاں ہو کر بس دو چار گھنٹوں میں آتی ہوں۔نومی، کرن۔۔۔آؤ بیٹے (امجد مسکراتا ہوا ساتھ جاتا ہے، بچے گاڑی میں پیچھے اور نزہت آگے بیٹھی ہے گاڑی ریورس ہوتی ہے)

سین نمبر۲۰

آؤٹ ڈور نیشنل پارک کنڈ، شہناز اور ریاض دریا کے کنارے ٹہل رہے ہیں، کیمرہ دریا اور درختوں پر ہوتا ہوا ان پر آتا ہے، کچھ دیر بعد ریستوران کی چھت پر کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔
شہناز: زندگی اگر سانس لینے کا نام ہے تو یہ دنیا کا سب سے آسان کام ہے لیکن زندگی کو اگر اس کے سارے موسموں کا ذائقہ چکھ کر گزارنے کی بات ہے تو پھر جینا ایک آرٹ ہے، ایک مشکل کام۔
ریاض: میرا خیال ہے کہ محبت اس سفر کا سٹارٹ ہے۔
شہناز: بشرطیکہ محبت کی پذیرائی کے لیے کوئی دریچہ کوئی روشن دان کھلا رکھا جائے۔
ریاض: محبت ان تکلفات میں نہیں پڑتی۔
شہناز: تھوڑی سی قربانی تھوڑی سی گنجائش تو ضرور مانگتی ہے نا۔
ریاض: جس وقت انسان کے چاروں طرف بے یقینی کی دھند چھا جائے اور مستقبل کے سہانے سپنوں کا شور اس کا جینا حرام کر دے تو سب کچھ ممکن ہے۔
شہناز: ایسے حالات کسی سے پوچھ کر نہیں آتے، اس کے لیے پہلے پیش

قدمی کرنی پڑتی ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے، میں پوری پلاننگ کے ساتھ پاکستان آئی ہوں مگر اب اتنی اچھی آفر کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔

ریاض: میرا مسئلہ یہ ہے کہ باہر جانے کی بے پناہ خواہش کے باوجود یہ زمین میرے قدم نہیں چھوڑ رہی۔

شہناز: مستقبل تو میرا بھی پاکستان ہے لیکن اگر کل کے لیے جزوی آزادی کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا جائے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔

ریاض: سات سمندر پار جانے کی جزوی آزادی کے لیے سات صحراؤں جتنا وسیع دل چاہیے۔

شہناز: میرا مشورہ پھر بھی دل کی بجائے دماغ کی ہدایت پر عمل کرنے کا ہوگا۔ مجھے یوں بقول تمہارے سات سمندر پار ایک نئے دفتر کی برانچ کی بنیاد رکھنی ہے، مجھے یہاں بھی اور وہاں بھی تجربہ کار لوگوں کی ضرورت ہے، مجھے تمہارا کام بھی پسند آیا ہے اور (ریاض کی انسرشن) تم بھی۔

ریاض: جی؟

شہناز: جی ہاں، چیزوں کے دیکھنے پرکھنے کا میرا اپنا ایک انداز ہے ویسے تو (مسکراکر) تمہاری گفتگو بھی ایک ذہنی کیفیت کو دوسری ذہنی کیفیت میں بدلنے کا ہنر جانتی ہے لیکن تمہارا تجربہ تمہاری طاقت ہے۔

ریاض: شکریہ۔ گفتگو۔۔۔بات چیت کا مزہ اسی وقت آتا ہے جب جواب میں بھی لفظوں کے پھول ہر طرف خوشبو پھیلا دیں۔۔۔دیواروں سے انسانوں کی باتیں کرنا کتنا بھی اچھا لگے، آخر کتنی باتیں کرے گا۔

شہناز: اجازت ہو تو میں اسے اپنے لیے کمپلیمنٹ سمجھوں (ایک دوسرے کی طرف جیسے اچانک دیکھتے ہیں مگر ریاض سر جھکا لیتا ہے)

سین نمبر ۲۱

ریاض کا ڈرائنگ روم (گل اور علی بیٹھے ہیں)

علی: گل تم تین انگلیاں الگ اور دو الگ کرکے دکھاؤ (گل کرتی ہے)

اب علی چھوٹی (انگلی پکڑ کر کہتا ہے) آپ کسی کلاس میں تھرڈ آئی ہیں۔

گل: یس (دوسری انگلی نیچے کرتا ہے)

علی: کس کلاس میں سیکنڈ آئی ہو

گل: یس (تیسری انگلی نیچے کرتا ہے)

علی: کس کلاس میں فرسٹ آئی ہو۔

گل: یس (باقی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

علی: تو پھر زیرو کونسی کلاس میں لیا ہے

گل: اوہ۔ یوٹھہر (اس کے پیچھے بھاگتی ہے)

سین نمبر ۲۲

وقت شام۔ ٹیرس، نازو اور ریاض کرسیوں کے پاس کھڑے ہیں، سورج کو ڈوبتے دیکھ رہے ہیں۔

ریاض: سورج غروب ہونے کے کچھ ہی دیر بعد آسمان ہنسنے لگتا ہے، اتنے بہت سارے ستارے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بے اختیار ہنس رہا ہو۔

نازو: اپنے اپنے احساس کی بات ہے، بہت سارے لوگوں کو یہ ستارے آسمان کے سینے کے چھالے لگتے ہیں۔

ریاض: ویسے گل یہ بھی غلط نہیں کیونکہ شام کے وقت انسان بغیر کسی وجہ کے اداس ہو جاتے ہیں۔

نازو: ہاں یہ تو ہے ایک بے نام سی اداسی چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

ریاض: سنا ہے پردیس میں شام گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

نازو: کوئی نیا سفرنامہ پڑھا ہے کیا؟

ریاض: اوں، ہوں۔۔۔ بدلتے موسموں میں پرندوں کے ساتھ دل کرتا ہے کہ میں بھی سائبریا کی طرف اُڑ جاؤں۔

نازو: مجھے تمہاری فینٹسی ڈرا دیتی ہے۔

ریاض: خوف زدہ فینٹسی نہیں مونا ٹنی کرتی ہے، یکسانیت اکتاہٹ میں بدل جاتی ہے۔

نازو: میں پھر بھی کہوں گی کہ یہ اپنے احساس کی بات ہے سورج تو کبھی نہیں تھکا، ستاروں نے کبھی گلہ نہیں کیا، چودھویں کے چاند نے تو کبھی بھی اپنی چاندنی سے منہ نہیں موڑا، سارے گلے ساری شکایتیں اور ساری اکتاہٹیں انسان کے حصہ میں کیوں آئیں۔

ریاض: انسان عمر کے مختلف حصوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ میں تبدیلی لاتا ہے، بچپن بے فکری کا زمانہ، جوانی بے پروائی کا زمانہ مگر شادی کے بعد ذمہ داری اور بچوں کے بعد مال برداری کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے۔

نازو: (مسکراتی ہے) میرا خیال ہے کہ ہر حالت میں ثبوت بردباری کا دینا چاہیے۔

ریاض: نازو جی، انجن کے پیچھے ڈبے لگ جائیں تو انجن کی بھی چیخیں نکل جاتی ہیں، ہمارے بچے خیر سے بڑے ہو رہے ہیں۔

نازو: ہوں، میں نے تو اس لیے پہلے بھی کہا ہے کہ کم از کم ایک چھت تو اپنی ہونی چاہیے۔

ریاض: ایک چھت کے چکر میں تو کئی بار دل چاہنے کے باوجود نوکری نہیں چھوڑی، کمپنی کا یہ مکان ہماری ضرورت ہی نہیں مجبوری بھی بن گیا ہے۔

نازو: نہیں ایسے نہیں، میں تو ایک کمرے کے مکان میں بھی رہ سکتی ہوں۔ کمپنی کا گھر کبھی نا کبھی چھوڑنا ہی پڑے گا۔

ریاض: تو اسی لیے کہتا ہوں کہ اپنی چھت کی منصوبہ بندی بہت ضروری ہے۔

فی الحال تو یہ چھت چھوڑ کر۔۔۔اجازت ہو۔۔۔تو نیچے چلیں۔۔۔

(مسکراتا ہے۔۔۔ نازو لک دیتی ہے)

سین نمبر۲۳

کسی گھر کا لاؤنج / یا ٹیرس جہاں جھولا ہو (کسی گھر کے جھولے یا آرام کرسی پر شہناز جھول رہی ہے ساتھ ساتھ کوئی انگلش میگزین پڑھ رہی ہے، یک لخت میگزین بند کر کے سائیڈ پر رکھ دیتی ہے اور جھولے کی گدی کے ساتھ سر لگا کر کچھ سوچتی ہے، چہرے پر سوچ کے تاثرات آہستہ آہستہ مسکراہٹ میں بدلتے ہیں تو آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ سین نمبر ۲۱ میں دریا کے کنارے کی سیر دکھائی جائے۔ سین نمبر ۲۱ کے ریاض کا ڈائیلاگ "میرا خیال ہے محبت اس سفر کا شارٹ کٹ ہے" اور پھر ریاض کا یہ ڈائیلاگ "جس وقت انسان کے چاروں طرف۔۔۔ تاسب کچھ ممکن ہے" دریا کی سیر کرتے ہوئے ریاض اور شہناز پر اُوور لیپ ہوتا ہے Cut شہناز ایک مسکراہٹ کے ساتھ آہ بھرتی ہے۔

سین نمبر۲۴

ریاض کا بیڈروم/رات (ریاض بیڈ پر لیٹا ہوا ہے اور علی اس کے اوپر دو جانوروں کو لڑا رہا ہے، ریاض کی آنکھیں بند ہیں، نازو قہوہ لے کر آتی ہے علی اشارے سے بتاتا ہے کہ ریاض سویا ہوا ہے، نازو مسکراتی ہے جونہی میز پر کپ رکھتی ہے ریاض آنکھیں کھول لیتا ہے اور مسکرا کر جمائی لیتا ہے۔

نازو: سو جاؤ۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔

ریاض: علی جب بھی اپنے گدھے گھوڑے مجھ پر چلاتا ہے واللہ ایسے مزے کی نیند آتی ہے

علی: مما میرا قہوہ

نازو: گل کمرے میں لے گئی ہے جا کر لے لو۔

علی: اوہوں (اُٹھتا ہے) اوکے پاپا گڈ نائٹ

ریاض: (مسکرا کر) سویٹ ڈریمز مائی سن (علی ہاتھ ہلاتا ہوا نکل جاتا ہے)

نازو: سارا دن یہ ہے اور کھیل کود ہیں۔

ریاض: یہی ہے

نازو: بتایا آپ کی ڈائریکٹر نے۔۔۔ کچھ پروگرام فائنل کیا۔

ریاض: جانا تو ہے اس نے، بڑی اچھی آفر آئی ہوئی ہے اُسے۔۔۔ میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔

نازو: اپنی چھت کے حوالے سے۔

ریاض: سوچتا ہوں کہ اگر میرا بھی کوئی وسیلہ باہر جانے کا (نازو کی انسرشن) کسی طرح بن جائے اک دو سال کے لیے تو۔۔۔ اپنی چھت۔۔۔

نازو: جی۔۔۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔

ریاض: میری ڈائریکٹر کو پاکستان سے کچھ لوگوں کو لے جانا تو ہے اشارۃً ذکر بھی اس نے کیا تھا، اس وقت میں نے نہ کر دی تھی، لیکن

نازو: مرجانی جزیروں کی کشش غالب آ گئی ہے۔۔۔ ہے نا، ریاض جی، یہ نوکری بری تو نہیں۔۔۔ گھر۔۔۔ کار۔۔۔ مراعات۔

ریاض: چھوڑوں گا تو نہیں، اگر ایک سال کی چھٹی لے لوں مجھے یقین ہے کہ ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔

نازو: ہمارے حالات اب بھی ٹھیک ہیں۔۔۔ ریاض۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں۔۔۔ اتنے دن۔۔۔ (سر جھکا کر، پس منظر میں نور جہاں کے گانے آپے بنڑا نڑاتے آپے مناؤ نڑا کی دھن جاری ہے)

ریاض: بچوں کی خاطر تو کہتا ہوں، ان کے اچھے مستقبل کے لیے خیر یہ تو میری سوچ ہے، پتہ نہیں یہ سب ممکن بھی ہے یا نہیں، آل ریڈی میں نے ناں کی ہوئی ہے موقع ملا تو بات ضرور چھیڑوں گا۔

نازو: پتہ نہیں۔۔۔ مجھے تو یہ سب۔۔۔ آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

ریاض: تم نہیں چاہتی ہو ہمارا اپنا ایک گھر ہو، آج نوکری ہے تو گھر بھی ہے، کمپنی کی نوکری کا کیا بھروسہ۔۔۔ اور میں تم سب کو کرائے کے گھروں کے عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

نازو: (آہ بھر کر) جیسی آپ کی مرضی

ریاض: کیوں تم خفا ہو، یہ بات ہے تو میں یہ خیال ذہن سے نکال دیتا ہوں۔

نازو: میں کبھی آپ کی خوشیوں کے راستے میں دیوار بنی ہوں؟ اور قہوہ ٹھنڈا ہو گیا ہے (اُٹھتی ہے) چھوڑیں میں اور بنا لاتی ہوں (آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی)

سین نمبر۲۵

کسی ریسٹوران میں (کیمرہ ریسٹوران کا عمومی ماحول دکھا کر شہناز پر آتا ہے)

شہناز: میں ایک بات سمجھتی ہوں کہ ہماری سوچیں اس وقت تک ہمیں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں جب تک ان کا چہرہ ان کی شکل نہیں بن جاتی۔

ریاض: اور یہ ہنر ہر کسی کو نہیں آتا۔ سوچوں کو تصویر بنانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

شہناز: ارادہ مائی ڈیئر ارادہ۔ ایک بار باغ میں پھول لگ جائیں تو شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کے لیے اخبار میں اشتہار نہیں دینے پڑتے وہ کہیں نہ کہیں سے خود بخود آ جاتی ہیں، آپ آج کلیئر کر دیں کہ آپ نے جانا ہے یا نہیں۔

ریاض: اصل میں۔۔۔

شہناز: باقی کی باتیں بعد میں۔۔۔ پہلے میری بات کا جواب، جانا ہے یا نہیں (ریاض کا انسرشن)

ریاض: (چہرے پر سوچ کے ایکسپریشنز) ہونٹ کاٹتا ہے۔

☆

''قرآں کی رہنمائی''

حمدِ باری تعالیٰ

ہر طرف تیری ہی خدائی ہے
مالکِ کُل! یہی سچائی ہے

رہتی قُرآں کی رہنمائی ہے
روشنائی ہی روشنائی ہے

قطرے کو بحرِ بیکراں کے لیے
جھیلنی پہلے تو جدائی ہے

تیری مخلوق مولا! مشکل میں
یہ سراسر بے اعتنائی ہے

اک نگاہِ کرم تو ہو ہم پر
کیسی یہ تیری آشنائی ہے

نام لیوا ہیں صبح و شام ترے
ہر زباں پہ یہ کبریائی ہے

ہاتھ پھیلے ہوئے دُعا کے لیے
میری تو بس یہی رسائی ہے

شگفتہ نازلی
(لاہور)

نعتِ پاک

دلکش و دلنشیں ، دلکُشا ہے بہت
نُو ر افشاں وہاں کی فضا ہے بہت

اُن سے وابستہ ہونا سعادت مری
اُن سے نسبت کا ہی سلسلہ ہے بہت

اُن کا ہر اِک قدم منزلوں کا نشاں
اُن کا ہر اِک قدم رہنما ہے بہت

کیوں نہ تسکیں ملے آپ کے نام سے
آپ کا نام بہرِ شفا ہے بہت

اُن کی توصیف وتکریم کے باب میں
در حقیقت کلامِ خدا ہے بہت

ہر نَفَس لب پہ ہو بس! درودوسلام
اک یہی مشغلہ جاں فِزا ہے بہت

وہ انیسؔ ہر اِک قلبِ آزُردگاں،
بس! اُنھی کا مجھے آسرا ہے بہت

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

روشنی کا ہالہ

بلال مختار
(سڈنی، آسٹریلیا)

یہ سب بالکل غیر متوقع تھا۔ میں ذہنی طور پہ ایسے منظر کو تیار نہیں تھی۔ یقیناً ہماری زندگیوں کی مسافتیں طے کرتے ہوئے چند ایسے واقعات نمودار ہوتے رہتے ہیں کہ آپ انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتے ہیں، مگر اس شام کا واقعہ میرے اعصاب کو ہلا کر رکھنے کو کافی تھا۔

میں ابھی اسکولنگ سینٹر سے چند قدم دور تھی کہ درختوں کے بیچ میں سے اسکول کی عمارت میرے قدموں کیساتھ ساتھ واضح ہونے لگی۔ اسکول کی بالکنی کے بالکل اخیر کنارے پہ اک معصوم سا چہرہ کھڑا رو رہا تھا، اس بچی کی آنکھوں کی روزن سے آنسو بہاؤ کیساتھ رخساروں پہ لینڈ کر رہے تھے۔ جیسے ہی اس نے بالکنی کے سامنے لگے بانس کے اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو مجھے معاملہ فہمی میں دیر نہ ہوئی۔ اسکے بہتے آنسو اسکے غم و مایوسی کے خبر دیتے تھے اور اب زیست کے دھاگے کو توڑنے کے درپے تھی۔ ہاں، وہ شدید مایوسی کے عالم میں خودکشی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ سب آن کی آن میں ہوا؛ میں اپنے طویل سفر کی تھکاوٹ بھول چکی تھی اور اپنے اوسان کو بحال کرنے کی از حد سعی کر رہی تھی۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اسکو چیخ کر کہوں کے ایسا نہ کرو، اسے ذرا دھکا کے موت کے پنجوں سے واپس لوٹا دوں پر ایسے نازک موقع پہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے جذباتی ردعمل سے اسکا دماغ منتشر ہو کر کہیں وہ سمجھنے کی مکمل صلاحیت کھو نہ دے۔ ہاں! ابھی اسکا ارتکاز اپنی جان دھو بیٹھنے پہ تھا، جسے مجھے بہتر رستہ دکھانا تھا۔

میں اسکے بالکل سامنے دھیرے سے سامنے آئی اور یکدم دوستانہ لہجہ میں کہا:

"رکو پیاری لڑکی! تم رو کیوں رہی ہو؟ تم روتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتی۔" یہ اک نفسیاتی چال تھی۔ وہ روتے روتے رکی تو اسکی ہچکی سی بندھ گئی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے جذبات کسی پینڈولم کی طرح اک حد سے دوسری حد کو چھو رہے تھے۔

"کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ تمھاری آنکھوں سے آنسو کیوں بہہ رہے ہیں؟"

"مجھے کوئی پسند نہیں کرتا، سبھی مجھے کوستے ہیں اور برے برے ناموں سے پکارتے ہیں۔ میں بہت بری ہوں۔"

میں نے اسکی بات سننے کیساتھ ساتھ نیچے جھک کر اپنا بیگ زمین پہ رکھا مگر میری نظریں اس کے اک اک لفظ اور اس سے بڑھ کے اسکی باریک ترین حرکات پہ تھیں، اندھیرے کی وجہ سے دور دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا۔ رات کا اندھیرا اور روز زندگی سے مایوس ترین انسان آمنے سامنے تھے۔

ہاں دوسرا مایوس انسان میں خود تھی۔ بنیادی طور پہ میں پیدا اور بڑھی پلی تو ویتنام میں تھی مگر پھر گزشتہ چار سال سے سڈنی میں تعلیم اور روزگار کے سلسلہ میں رہ رہی تھی۔ ویتنام اور آسٹریلیا کے لائف سٹائل میں تو بہت سا فرق ہے مگر اس سے بڑھ کے یہاں پر نئے طلباء کیلئے بہت سے کٹھن حالات و واقعات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کئی بار ٹرین پہ ہی سو گئی اور رات کے دوسرے پہر شہر کے دوسرے کنارے کے آخری پلیٹ فارم پہ ٹرین رکی تو دیر ہو جانے کا احساس ہوتا، کام کی فکر میں امتحانات کی تاریخیں گڈ مڈ سی ہو جاتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہیکہ اک دفعہ "لسانیات اور انسانی نفسیات" کے کورس کے تحریری امتحان کیلئے کمرہ امتحان میں بیٹھی تو اک مختلف پرچہ دیکھ کر ممتحن سے سوال کیا تو آشکار ہوا کہ "لسانیات اور انسانی نفسیات" کا امتحان تو اسی وقت اور جگہ میں گزشتہ روز ہو چکا تھا۔ خیر جیسے تیسے تین سال کا پروگرام مکمل ہو ہی گیا۔ تعلیم حاصل کر چکنے کے باوجود مجھے آئندہ کی زندگی کے پلان کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، اک غیر یقینی کیفیت کیساتھ میں نے اپنے کنسلٹنٹ کیساتھ مشورہ کیا، اسکے مطابق مجھے چھ ماہ کیلئے کسی دور کے علاقے کا تدریسی تجربہ لانا ہوگا۔ چنانچہ میں نے پی این جی اور نیورو میں سے نیورو کی زمین کو منتخب کیا اور مختلف رفاعی اداروں سے ای میلز ڈالیں اور بالآخر شنوائی ہوئی۔ مجھے نیورو کے اک مقامی سکول میں مائیکر ٹیچنگ کی ٹریننگ کے واسطہ موقع دیا گیا، اور اسکے بدلہ میں مجھے سکول میں ہی رہائش، کھانا اور صحت کی انشورنس اسکول کی طرف سے تھا۔ سڈنی جیسے رونقوں بھرے شہر سے یوں دور کے جزیرے پہ جانا مشکل معلوم ہوا مگر میرے پاس اسکے سوا کوئی بہتر آپشن بھی نہیں تھی۔

سیارہ زمین پہ سانسیں بھرتے ہوئے مجھے تیس سال ہو چکے تھے، مگر معاشی اور سماجی مشکلات کے بعد سڈنی میں رہتے ہوئے مجھے جذباتی طور پہ کمزوریوں کا احساس ہوتا رہا۔ ایسے ہی ملے جلے تجربات کے بعد اب مجھے مزید چھ مہینے خون کے گھونٹ پینے تھے۔ جب میں اسکول کی عمارت کے سامنے پہنچی تو مایوسی کے بادل مکمل طور پہ میرے خیالات پہ بسیرا کر چکے تھے۔ اس مقام تک پہنچ کر میں خود کو تسلی اور حوصلہ نہیں دے سکتی تھی۔

یہ بڑا عجیب ہوتا ہے کہ بعض اوقات مایوسی کے خشک پربتوں سے امید و یقین کا آب زم زم پھوٹ پڑتا ہے، میں بھی کچھ ایسا معجزہ کرنے کے درپے تھی۔

"تمھیں کس نے کہا ہیکہ تم بری لڑکی ہو۔ اتنی پیاری سی گول مٹول بلوری آنکھیں ہیں، اور تمھارے سیاہ بال کتنے بھلے سے ہیں۔ میں اس شہر میں بالکل نئی ہوں، کیا تم مجھ سے دوستی کرنا چاہو گی؟" اس دوران میں ذہنی طور پہ اپنے آپکو تیار کر رہی تھی اگر اس نے چھلانگ لگا ہی دی تو کیا میں اسے پندرہ سے اٹھارہ فٹ کی بلندی سے آتے ہوئے بچا سکونگی، کیا وہ میری بات کا جواب بھی دیگی۔۔۔

وہ ابھی بھی رو رہی تھی مگر اچھی بات یہ کہ قدم آگے نہیں بڑھایا۔

"دیکھو معصوم لڑکی! میرا آج اس شہر میں پہلا دن ہے، مجھے تم بہت

اچھی لگی ہو۔ پلیز مجھے اپنی دوست بنالو۔"

اخیر جملہ کاری کا تھا، کیونکہ وہ اب کچھ قدم پیچھے ہوگئی۔ مجھے بعد میں اس آخری جملہ کی باریکی اور عین اہمیت کا احساس ہوا۔ اسکی عمر تقریباً تیرہ سے چودہ سال کے درمیان تھی۔ بنیادی طور پہ وہ لڑکی ملک شام سے اپنی ماں اور چند دوسرے لٹے پٹے لوگوں کیساتھ ہجرت کر کے آئی تھی، چونکہ وہ بذریعہ کشتی اور بغیر ویزہ بمعہ ضروری کاغذات کے نیوروتک پہنچی تھی، اسی لئے آسٹریلوی حکومت کے تعاون سے ان لوگوں کو Regional Processing Centres میں منتقل کردیا گیا۔

ہم دونوں اب اسکول کے پلے گراؤنڈ کے اک کنارے بینچ پہ بیٹھے ہوئے تھے۔

"تمھارا نام کیا ہے؟ کچھ اپنے بارے میں مزید بتاؤ، شام میں کیسی زندگی گزری؟" میں نے جاننے کے واسطے پوچھا۔

"میرا نام ہالہ ہے۔ میں مشرقی شام میں پڑھتی تھی، پھر ہمارے ملک میں خانہ جنگی نے یوں جڑ پکڑی کہ ہر طرف قتل وغارت، لوٹ مار اور اداروں کو کمزور وغیر مستحکم بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جانے لگی۔ لڑکیوں کی عصمتوں کیساتھ کھیلا جاتا جبکہ لڑکوں کو جان سے مار دیا جاتا۔ فضائی اسٹرائیکس سے کئی کئی بار ہمارے کان گھنٹوں بند سے ہو کر رہ جاتے۔ کئی کئی دن حملوں کے ڈر سے گھروں میں چھپے رہنا۔"

اور پھر اسکی آواز بھر سی گئی۔ میں نے ٹاپک بدلنے کے واسطے کہا:

"اچھا ہالہ! تمھارے نام کا مطلب کیا؟ سنا ہیکہ نام میں بڑی شے ہوتی ہے۔ ہماری شخصیات اور جسمانی وذہنی تبدیلیوں میں گہرا اثر ڈالتی ہے؟"

وہ اس بات پہ کچھ کھکھلا اٹھی۔ پھر کہنے لگی:

"ہالہ دراصل چاند کے اردگرد اک کمان کا نام ہے۔ جب چاند کی روشنی اپنے آس پاس کے بادلوں میں گزر کے مختلف زاویوں سے لوٹ آئے، اس موقع پہ اندھیرے آسمان پہ چاند کے اردگرد ہالہ سے بن جاتا ہے۔ اسی سے میرا نام منسوب ہے۔"

"ارے واہ! یہ تو بہت پیارا نام ہے، اک دم مست سا۔ پتہ ہے میرا نام ٹرنن ہے، ویتنامی زبان میں اسکا مطلب کنواری اور پاک صاف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔"

یوں اک آدھ گھنٹے کے بعد ہم دونوں کے درمیان خوب کیمسٹری بننے لگی۔ کچھ اندھیرا گہرا ہوا تو ہم واپس اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اگلے دن ہیڈ مسٹریس کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ انہوں نے بتایا کہ میں دو دن کے بعد کلاسز لینا شروع کردوں گی، تب تک ہم تمھارا ٹائم ٹیبل بقیہ کلاسز کیساتھ ایڈجسٹ کرلیں۔ اس دن میں اسکول کے مختلف حصوں کا دورہ کرتی رہی اور اسکول میں قائم ماحول اور نظم و نسق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ طلباء تفریح کے دوران بات بات پہ اونچا بولنا شروع ہو جاتے جبکہ سبھی کھیلوں کا دارومدار جسمانی طاقت وزور پہ تھا، اسی سبب اکثر لڑکیاں ایکطرف بیٹھی ہوئیں لنچ بکس اور اسکول ورک مکمل کر رہی تھیں۔ اگلے دن کلاسز ختم ہونیکے بعد کیفے میں اک کولیگ سے ملاقات ہوئی، اسکا نام اسٹیفن تھا۔ وہ یارن میں پلا بڑھا اور وہیں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب یہاں پر گذشتہ دو سالوں سے پڑھا رہا تھا۔ اسٹیفن کا اصرار تھا کہ مجھے شہر لازمی دیکھنا چاہیے مگر میں نے دوستانہ انداز میں انکار کردیا۔ اسکا کہنا تھا کہ کچھ دنیائیں سمجھنے کے لئے اپنے قدموں سے چل کر جانا ضروری ہوتا ہے۔ جہاز، اونچی اور فلک بوس عمارتوں سے گزریں تو بات سمجھ لگتی ہے، تیز رفتار گاڑیاں ہائی ویز اور عام شاہراؤں سے چلیں تو فائدہ ہے۔ موجودہ صورتحال میں ہم دونوں کو بائی سائیکل کے ذریعے چکر لگانا چاہیے۔ آخر کار اس نے مجھے آمادہ کر ہی لیا۔ سڑکوں کی حالت خستہ وبدحال تھی، اک جگہ پہ دو گروہ آپس میں متصادم ہوگئے مگر پاس سے گزرتے لوگ بنا کوئی ری ایکشن دیئے چلتے بنے۔ پھر ہم ساحل سمندر کے کنارے گیلی ریت پہ پرزور کوشش کیساتھ سائیکلنگ کرنے لگے۔ مگر اک بات قابل غور تھی کہ جا بجا زمین کھودی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی، چٹانوں کو جیسے اندر سے کھود کھود کر کھوکھلا کردیا گیا تھا۔ گھاس پھوس واجبی سی تھی اور ہریالی اور باقاعدہ سبزہ کہیں کہیں دیکھنے کو مل رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی ڈالا۔ اسٹیفن نے میری بات کا بلاواسطہ جواب تو نہ دیا مگر کہنے لگا۔

"تم جانتی ہو زندگی میں پلان بنانا کتنا ضروری ہے؟ منصوبہ بندی کتنے دوررس اثرات دکھا سکتی ہے؟؟"

"ہاں! منصوبہ بندی تو ہمیں اپنے مقاصد کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے، ایکطرح ہم عمومی سطح پہ فکر کرنے کے قابل ہو پاتے ہیں۔ اسباق کی منصوبہ بندی ہی لے لو، ہم کلاس شروع کرنے سے لیکر اختتام تک بہت کچھ پلاننگ کر کے چلتے ہیں۔ کونسا ٹاپک پڑھانا ہے، کس حد تک بچوں کو روشناس کروانا ہے، کن مغالطوں کو سامنے لانا ہے، کلاس ورک سے ہوم اسائمنٹ کی رہنمائی اور حاضری کس وقت لینی ہے۔"

اس نے سائیکل کا ٹائر گیلی مٹی میں نیم کمان کی شکل بناتے ہوئے کہا: "اور اگر پلاننگ نہ ہو تو کیا کچھ ہوسکتا ہے؟"

"وقت کی بربادی، ذمہ داریوں سے انحراف، بچوں کے حقوق کی تلفی اور تن آسانیاں۔"

"اب میں تمھارے سوال کیطرف آتا ہوں۔" اس دوران ہم دونوں ساحل سمندر کے کنارے بیٹھ کر لہروں کو اپنے قریب تک آتے دیکھنے لگے۔ "تمھیں پتہ ہیکہ نیورو اک وقت میں دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار کیا جاتا تھا۔ اسکے پیچھے اک دلچسپ سائنسی سوچ ہے، کہتے ہیں کہ آزادی کے عین بعد یہاں پر فاسفیٹ کے ذخائر برآمد ہونا شروع ہوگئے اور ماحولیاتی آلودگی سے بچاؤ کے لئے پوری دنیا میں شجر کاری مہم زوروں پہ تھی، اب درختوں کو پھلنے پھولنے، ہریالی اور بالخصوص زمینوں کو زرخیز کرنیکے لئے فاسفیٹ بنیادی کردار ادا

کرتی ہے۔چنانچہ اپنی آزادی کے چند سال بعد ہی نیورو میں کان کنی کا کام زوروں پہ شروع ہوگیا، پوری دنیا سے ڈیمانڈ بڑھنے لگی اور حیرانکن طور پہ نیورو دنیا بھر میں فاسفیٹ برآمد کرنے لگا۔70ء کی دہائی میں ایکسپورٹ کا کام زوروں پہ تھا، چنانچہ ان سالوں میں دولت کسی بارش کیطرح نیورو کے لوگوں پہ برسی۔خوشحالی ہراور، اس پہ اہم بات کہ نہ کوئی ٹیکس نہ کوئی صحت وتعلیم کے اخراجات۔عوام کے لئے سب کچھ مکمل فری کر دیا گیا۔مگر بڑے پیانے پہ حکومتی منصوبہ بندی اور کمزور پالیسیوں کے سبب 2011ء کے آس پاس ملک میں بدحالی اور غربت نے جنم لینا شروع کر دیا۔آج نیورو اپنے ڈیٹنشن سینٹرز کی وجہ سے دنیا میں جانا جاتا ہے۔''

ہم دونوں ایکبار پھر سے سائیکلوں پہ سوار ہوکر پیڈل پہ پاؤں دبانے ہی لگے تھے کہ میرے ذہن میں سوال کھٹکا۔

''مگر یہ سب اچانک فاسفیٹ کے ذخائر کیونکر برآمد ہو گئے اور وہ بھی چالیس پچاس سالوں تک پوری دنیا میں بھیجتے رہنا۔یہ تو جیسے زمین نے سونا اگل دیا ہو۔''

اسٹیفن پیڈل پہ پاؤں رکھ چکا تھا پر میرا سوال سنکر لحہ بھر کو رکا اور گویا ہوا:

''اسکے بارے میں عجیب توجیہ دی جاتی ہے۔کہتے ہیں کہ سمندری پرندوں اور بالخصوص بگلوں کا اپنی موسمی ہجرت کے دوران اس راستے سے گزرہوتا تھا۔خاص طور پہ جب وہ جنوبی کرہ کی جانب جارہے ہوتے تھے۔چونکہ نیورو اک جزیرہ ہے اور سمندر کے بیچوں بیچ واقع ہے، اسی سبب مہاجر پرندے اپنے وقتی پڑاؤ کے واسطے یہاں کی زمین کو منتخب کرتے تھے۔اپنے قیام کے دوران بگلے بھی خشکی پہ چکراتے رہتے اور انکی بیٹ سے یہاںکی زمین ہریالی سے بھر گئی، زرخیزی کیساتھ ساتھ بگلوں نے اس زمین کو فاسفیٹ کے کماحقہ مقدار سے بھر دیا تھا۔''

یقیناً اس نے صحیح کہا تھا، چھوٹے سے چھوٹے پیانے کے کام سے لیکر ملکی اور بین الاقوامی سطح کے لئے بہترین اور جامع منصوبہ بندی کا ہونا ازحد لازم وملزوم ہے۔

اگلے روز میری پہلی کلاس تھی، مجھے ثقافتوں اور انکی قربتوں کے تفہیم پہ اک کورس دیا گیا، جسے Understanding Acculturation کا عنوان دیا گیا۔میں جب بطور ٹیچر ہالہ ہی کی کلاس میں داخل ہوئی تو اسے انگشت بدنداں پایا۔خیر سے میں نے کورس آؤٹ لائن کے عین مطابق طلباء کو ثقافت کے بنیادی تعارف اور اک سے زائد ثقافتوں کے میلاپ کے حوالے سے بحث و مباحثہ بھی کروایا، طلباء کا ایکٹوٹی میں حصہ ڈالنا قابل دید تھا۔لنچ بریک کے دوران ہالہ تیر کی سی سیدھ سے میری طرف آن پہنچی اور پہلا سوال غیر متوقع نہیں تھا۔

''آپ نے مجھے نہیں بتایا کہ آپ اس اسکول میں ٹیچر کے طور پہ آئی ہو؟ میں تو آپکو اپنی دوست بنا بیٹھی تھی۔'' میں لحہ بھر کو مسکرا دی اور کہنے لگی:

''دیکھو! کیا ٹیچر اور طالبعلم میں دوستی نہیں ہوسکتی؟ ہم ابھی بھی دوست ہیں۔''

میرا یہ کہنا تھا، اس نے اپنا لنچ باکس چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میں نے اسکے چہرے کو بغور نہیں دیکھا۔میں جانتی تھی اس پردیس میں اسکو اسکی توقع سے بڑھ کے سہارا مل گیا تھا۔مجھے اپنے آپ پہ ذمہ داری کا بار بڑھتا محسوس ہوا ۔میں نے غور کیا کہ اسکے ساتھ تین اور غیر ملکی فیلوز بھی اسی طرح تقسیم تقسیم سی پھرا کرتی تھیں، دو کا تعلق عراق سے تھا جبکہ اک انڈونیشیا سے تھی۔حالانکہ ایسے موقع پہ ان چاروں کا ایکساتھ ہوجانا فطری عمل ہوتا مگر بریک میں بھی وہ باقیوں کیساتھ کھیل نہ پاتیں۔انکے ہاں ثقافتوں کا نمایاں فرق تھا، اسی امتیاز کے سبب ائیر نائن مکمل طور پہ بٹی بٹی سی تھی۔

چند ہفتے یونہی کلاسز لینے میں بیت گئے، اسکے ساتھ ہالہ سے اکثر ملتی رہتی اور اسکی دادرسی کیساتھ اسکو موجودہ زندگی کا ڈٹ کر سامنا کرنیکے لئے پیش کرتی رہتی۔حیرت انگیز طور پہ میں اپنے آپکو بھی امید سے بھرپور محسوس کرنے لگی، اسکے نینوں میں امید کے نئے دیئے جلتے دیکھکر مجھے خود بھی زندگی کیجانب رخ کرنے میں آسانی ہورہی تھی۔اب میری کلاسسز پہلے سے بڑھ کے پرجوش ہورہی تھیں۔اسی دوران ہالہ نے اپنے نام کیطرح باقی تینوں تارکین وطن فیلوز کو ایکساتھ کر کے کھیلنا شروع کر دیا، اب وہ چاروں قریب قریب بیٹھ کر کلاس میں بہترین انداز میں حصہ لے رہی تھیں۔مگر اک نقطہ جو مجھے چبھ رہا تھا، وہ کلاس کو بہت سی تقسیموں سے ہٹا کر دو بڑی تقسیم کی حد تک محسوس کرنے لگی۔اک طرف ہالہ کا گروپ تھا، جو صرف چار ہی تھیں تو دوسری جانب نیورو کے مقامی طلباء بھی تھے۔اب انکے ہاں اک مقابلہ کی فضاء پیدا ہوگئی، کلاس اور کلاس سے ہٹ کر بھی ایکدوسرے سے پرفارمنس میں بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔

''اوکے اسٹوڈنٹس! آج ہمارا تھیم ہوگا کہ کیسے ہم دوسری ثقافتوں کے لوگوں کو اپنے قریب لا سکتے ہیں۔کیسے ہم ملکر زندگی میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔کیا کوئی بتائے گا کہ ثقافتوں کے میلاپ کے کیا نتائج ہوسکتے ہیں؟''

اک طالبعلم نے ہاتھ اٹھایا اور کہنے لگا:

''تیسری دنیا کے لوگوں کے آنے سے ہماری اقتصادی پوزیشن کمزور ہوتی ہے، ہماری گورنمنٹ کو انکے لئے علیحدہ سے فنڈز رکھنے پڑتے ہیں۔ان کے آنے سے بہت سے جرائم بھی ہماری دنیا میں چلے آتے ہیں؟ یہ ایکطرح سے وائرس ہیں، جسکا کوئی اینٹی وائرس نہیں ہے۔''

اس بچہ کے آخری جملہ نے مجھے ہلا کر چھوڑ دیا، ایک دو بچوں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، مگر کہیں نہ کہیں تعصب اور نفرت ایکدوسرے کے لئے تھی۔میں نے سینے میں سانس بھری اور کہنا شروع کیا:

''پیارے بچو! دیکھو تو زندگی میں خوبصورتی کس شے سے ہے؟ چلیں اس سوال کا جواب جانتے ہیں۔آپکا فیورٹ کلر کونسا ہے؟؟'' میں نے مختلف بچوں سے پوچھنا شروع کیا۔وائٹ، پنک، گہرا سبزی مائل، نیلگوں، سفید اور مختلف طرح کے جوابات ملتے گئے۔

''اچھا اگر آپکے روم کو مکمل طور پہ گلابی کر دیا جائے تو کس کس کو اچھا لگے گا؟''

کلاس میں چار طلباء نے ہی ہاتھ اٹھایا۔

''اچھا اگر بلیو کلر کا کمرہ بنادیا جائے، آپکی ٹیبل، کرسی، دیواریں، بیڈ شیٹس۔۔۔۔سبھی کچھ۔۔۔پھر۔۔۔؟'' اب کی بار چھ طلباء نے ہاتھ اٹھایا۔ سارے بچے ایکدوسرے پہ غور وفکر کر رہے ہیں۔ کلاس میں پہلی بار اس درجے کی تقسیم دیکھنے کو مل رہی تھی۔ یہ تقسیم دراصل اپنی اپنی پسند کی تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں میری بات کو سمجھ رہے تھے۔

''اچھا اب دیکھو! دنیا میں اسوقت رنگوں کی کل تعداد کا تعین نہیں ہو سکا، قیاس ہیکہ انکی تعداد کروڑوں میں ہے۔ آپ میں سے ہر اک کا ڈی این اے کی کوڈنگ ایکدوسرے سے مختلف ہے، ہماری انگلیوں کی پوروں کی چھاپ سے لیکر زبان کا پرنٹ ہر دوسرے سے مختلف ہے۔ اسے علمی دنیا میں تنوع کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپکا کیا خیال ہیکہ پوری دنیا کو ہم اک ہی رنگ میں رنگ دیں تو کیسا رہیگا، یہ پربت، دریا، درخت، سبزہ، چرند پرند۔''

میرا آخری جملہ سنتے ہی اکثر بچے کھل کھلا اٹھے۔ میرے اندر کی مدفن روشنی اور پھوٹ کر بکھرنے لگی۔

''گلدستہ دیکھو بچو! کونسا سب سے اچھا معلوم ہوتا ہے، گلابی، سرخ اور بہت سے رنگوں کے پھولوں کو اک جگہ اکٹھا کرنے سے۔۔۔۔آپ سب بچے بھی مختلف دنیا سے مختلف ثقافتوں اور لسانی امتیازات کیساتھ اکٹھے ہو، یہی خوبصورتی ہے، نائن ایئرا ایکطرح سے گلدستہ ہے۔''

اس دن میں نے کلاس میں بہت حد تک مثبت فضا محسوس کی۔ قریب دو دنوں کے بعد بریک کے دوران میں نے نائن ایئر کو ایکساتھ رگبی کا میچ کھیلتے ہوئے دیکھا۔ سب اسکول کے یونیفارم میں بھاگے جا رہے تھے، کیا غیر ملکی اور ملکی۔ ان میں ایکدوسرے کو قبول کرنے کی صلاحیت اب ابھر کے سامنے آ رہی تھی۔ یہ بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔

چونکہ میرے کورس کا بنیادی ارتکاز ثقافتوں کو سمجھنے اور ایکدوسرے کیساتھ مل جل کر رہنے کے تھیم پہ تھا، چنانچہ روز اس موضوع پہ بھرپور معلومات اور سوچ کو مجتمع کر کے کلاس کو ڈرائیو کرتی۔ اک دوپہر کی بات ہیکہ ساتواں پیریڈ ختم ہو چکا اور میں قریب کے ایک کیفے میں کھانا کھانے کو چل دی۔ ابھی راستے میں ہی تھی کہ ایک جگہ پہ چند مہاجرین کو کسی بات پہ لڑتے دیکھا، وہ کسی بات پہ گتھم گتھا تھے۔ میں سوچنے لگی کہ اضطراب تقریباً ہر اک بستی کے باسی میں ہے، کوئی اس اضطراب کو Frustration کی صورت میں خارج کرتا ہے تو کوئی خوابوں کی تکمیل میں مزید ریاضت و کوشش میں صرف کرتا ہے۔

مجھے پڑھاتے ہوئے تقریباً سال ہونیوالا تھا، اس دوران کئی اتار چڑھاؤ نمودار ہوتے رہے مگر میں نے ان سبھی نشیب والی راہوں سے ایکطرح سے راہ فرار اختیار کر رکھی تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ان ایام میں صرف مقامی اخبار تک ناطہ جوڑے رکھا۔ نیورو اور اسکی نوجوان نسل میرے خیالات کا محور رہی؛ اکثر سوچتی رہتی کہ فلاں بچے کو کیسے یقین محکم پہ لا سکوں، فلاں کو کیسے اچھا لکھنے پہ مائل کروں اور ایسے درجنوں خیالات میں پلتی ہوئی اک سال مکمل کرنے والی تھی۔

ایئر نائن میں کرکٹ کافی پاپولر ہوتا جا رہا تھا۔ ایکدن سبھی بچے کھیل کھیل رہے تھے تو میں میدان کی ایکطرف درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ کلاس دو حصوں میں تقسیم ہو کر باقاعدہ ٹیموں کی صورت میں کھیل رہی تھی۔ اکثر اسپورٹس انچارج امپائرنگ کے امور سرانجام دیتے مگر اس دن وہ موجود نہ تھے۔ کھیل خود بخود چل رہا تھا۔ ایک موقع پہ بیٹسمن نے رن لینے کی کوشش کی، اسی دوران دوسرا رن لیتے ہوئے بال وکٹ کیپر کے پاس جا پہنچی اور اس نے کلیاں اڑا دیں۔ کچھ ہی دیر میں دونوں ٹیم کے کھلاڑیوں میں ٹھن گئی، آؤٹ یا کہ ناٹ آؤٹ۔ پہلے تو میرے دل میں آیا کہ مداخلت کر کے مسئلہ حل کر دیا جائے مگر پھر یہ سوچ کر رہ گئی کہ آج انہیں خود فیصلہ کرنے دیا جائے۔ کیا وہ Conflict Management کے دیئے گئے اسباق کو سمجھ چکے ہیں یا ابھی اس پہ مزید محنت کی ضرورت ہے۔

کچھ ہی دیر بعد آپس کی کھسر پھسر سے سب ایکطرف دیکھنے لگے، ہالہ ایکسٹرا کوور کی پوزیشن پہ بیٹھی انکے مسئلہ کو سلجھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اک بچہ نے کہا:

''ہالہ! ادھر آؤ۔۔۔۔جلدی سے ہمارے پاس آؤ۔''

ہالہ اٹھ کھڑی ہوئی اور انکے پاس کر کرکٹ کیپ اتار کہ کہنے لگی کہ مسئلہ کیا ہے۔ کچھ بازو پرس کے بعد ناٹ آؤٹ تجویز کیا، جسے سب نے من وعن قبول کر لیا۔ حالانکہ رن آؤٹ ہونے پہ ہالہ کی ٹیم کو فائدہ پہنچتا۔ ایک جگہ پہ چوکے اور چھکے کے درمیان اٹک گئے تو نظریں ہالہ کیطرف تھیں، اسی طرح ایل بی ڈبلیو کے موقع پہ بھی سبھی نے ہالہ کی طرف دیکھا۔ مجھے یہ دیکھکر حیرت انگیز خوشی کا سامنا تھا، ہالہ کھلاڑی ہونیکے باوجود نیوٹرل رہ کر امپائرنگ کر رہی تھی اور اس سے بڑھ کر سب اسکی بات کی تائید کر رہے تھے۔ یہ کافی عجیب و مسرور کن تھا۔ اس شام میں نے ساحل پہ چہل قدمی کرتے ہوئے دن کی سرگرمی پہ غور وخوض کیا۔ ہالہ کے ہاں کافی مثبت خوبیاں تھیں مگر اسکی ایک خامی بھی تھی۔ وہ سوشل بٹرفلائی نہیں تھی، پہلے اسکا کوئی دوست نہیں بننا چاہتا تھا مگر اب تو کلاس میں اک بہتر ایکڈمک اور ہم جماعتوں کا اعتماد حاصل کر چکی تھی، اسکے باوجود وہ اپنے شیل میں رہتی۔ کوئی اسکے پاس آ گیا تو صد بسم اللہ اور اگر نہیں تو وہ بھی اپنی ہی دنیا میں گم صم۔

ایک بریک کی بات ہوگی کہ ہم ٹیچرز کافی پی رہے تھے تو اسٹاف روم کے سامنے سے ہالہ گزری، اسکے ہاتھوں میں کچھ کتابیں تھیں۔ میں نے کافی کے کپ کیساتھ دو عدد بسکٹ اٹھائے اور ہالہ کو گیلری میں جا لیا۔

’’ہالہ! میری بچی۔۔۔کدھر جارہی ہے۔۔۔؟‘‘

’’میم! میں لائبریری جارہی ہوں، چند کتابوں کی آخری تاریخ سر پہ ہے۔جبکہ چند اور کتابیں بھی لینی ہیں۔‘‘

’’ارے ہاں! یہ تو بہت اچھا ہے۔‘‘ اس دوران میں نے ٹائٹل پہ نظریں دوڑائیں تو وہ دیومالائی کہانیوں والی کتب تھی۔ میں اندر ہی اندر بڑبڑائی:

’’اس عمر میں ایسی کتب سے تخیل کی پرواز خوب اٹھان بھرے گی۔‘‘

ہم دونوں لائبریری میں چل دیئے، لائبریرین سارہ مجھے اچھی طرح سے جانتی تھی۔ میں نے اس سے کتب کو ایشو کرنے کا ریکارڈ مانگا، اس دوران ہالہ نئی کتب تلاش رہی تھی۔ دراصل میں جاننا چاہ رہی تھی کہ ایئر نائن میں کون کون کتابوں کا شوقین ہے۔ رجسٹر پہ نظر دوڑائی تو معلوم ہوا کہ ہالہ کے علاوہ کیلب کو کتابوں کا شوق ہے اور وہ متواتر کتابیں مستعار لیتے رہتے ہیں، جبکہ الیکس کبھی کبھار کتابیں لینے آجاتا ہے۔

ہالہ اک ٹیبل کے پاس کھڑی کسی نئی کتاب میں کشش تلاش رہی تھی کہ میں جاپہنچی۔ اسے پاس بٹھایا۔

’’ہالہ! تمھیں یہ کتابیں کیسی لگتی ہیں۔؟؟‘‘

’’مس! میرا دل تو کرتا رہتا ہے کہ سبھی کتابوں کا رس ایکساتھ گھول کے پی لوں، پتہ ہے رات کو لیمپ کی روشنی میں یہ کتابیں مجھے پوری دنیا کی سیر کراتی ہیں۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔‘‘

’’دیکھو ہالہ! یہ جو کتابیں ہیں نہ لوگوں کے تجربات و خیالات کی عکاس ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربات سے جو کچھ سیکھا، وہ لکھتے جاتے ہیں۔ انکے ہاں خیال ہوتا ہیکہ جو مشکلیں جن Situations کا انہیں سامنا رہا، کل کوئی اور ان سے گزرے تو مزید اچھے انداز سے گزرے اور بہت سا لطف لیکر چلے۔ اب جو بھی نئی کارٹون سیریز آتی ہے تو آپ سب فیلوز آپس میں ڈسکس کرتے ہوگے اور شیئرنگ بھی کرتے ہوگے، اسی طرح کتابوں کو ایکدوسرے سے شیئر کرنا چاہیے۔‘‘

’’ارے مس! اس پہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ میری اپنی تصوراتی دنیا ہے۔ میں اپنی مرضی کے رنگوں سے ان تخیلات میں رنگ بھرتی ہوں اور بہت دور اڑتی چلی جاتی ہوں۔ اتنا دور کہ سمندری سرحدیں اور امیگریشن والے بھی مجھے روک نہیں پاتے۔‘‘

وہ کہتی ہی چلی گئی اور مجھے اپنی سوچوں سے انگشت بدنداں کرگئی۔

’’اچھا! تمھیں مزا کب آتا ہے؟ جب تم کسی لطیفے یا مزاح پہ اکیلی ہنسو یا ساری کلاس ایکساتھ ملکر ہنسے۔۔۔اور اس لطیفے کو انجوائے کرے؟؟‘‘

’’جب ساری کلاس یا میری سہیلیاں میرے ساتھ ہوں۔‘‘

’’بھلا کیوں؟‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

’’کیوں کہ اس میں لطیفہ کیساتھ بہت سی مسکراہٹیں شامل ہوجاتی ہیں۔ آپ ٹرن یا ہونگ کو کبھی ہنستے دیکھیں، کوئی ہنسی کی بات ہو یا نہ ہو تو انکے چہروں کو دیکھکر ہنسی آجاتی ہے۔‘‘

میں نے اسکے خیال میں اضافہ کرتے ہوئے کہا:

’’اور اس پہ جب تم سہیلیاں کمنٹ پاس کرتی ہوگی۔ تو وہ اک لطیفہ اک پورا خوشی کا ماحول بن جاتا ہے۔ ایسے ہی شیئرنگ میں بہت Efficiency ہے، آپ کم inputدیکر زیادہ output سمیٹ سکتے ہو۔ یونہی تم اپنی کتابیں، پسندیدہ پھول، گفٹ، لطیفے اور خوشیاں اپنی کلاس اور دوستوں میں شیئر کیا کرو۔‘‘

ہالہ کچھ دیر تو ہاتھوں کے پیالے میں منہ ایستادہ کیئے سوچتی رہی، پھر یکبارگی مسکرادی۔ اس نے کچھ نہیں کہا، مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے لگا کہ وہ میری تجویز کو کسی حد تک سمجھ چکی ہے۔

اسی ہفتے میں ہالہ مسلسل دو دن تک سکول نہیں آئی، جب تیسرے دن آئی تو اسکا چہرہ اترا ہوا تھا، وہ اداس تھی، معلوم ہوتا تھا کہ بہت دیر تک روئی ہو۔ کلاس میں جو بھی اسکے پاس گیا، اداس ہی لوٹا۔ میں اپنے طور پہ قیاس کرتی ہوئی مختلف ایکٹوٹیز گروپ کی شکل میں کرواتی رہی تاوقتیکہ کلاس کا وقت ختم ہو گیا۔ بعدازسیشن، میں نے ہالہ کو کلاس سے باہر بلوایا اور استفسار کیا۔

پہلے تو وہ کچھ بول نہ سکی اور آنسوؤں کی ڈوری اسکے معصوم رخساروں سے بہہ سی گئی۔

’’میم! میم۔۔۔۔وہ۔۔۔میرے ابو کو بندوق والوں نے مار دیا۔ میرے ابو کو ان بے حس لوگوں نے مار دیا۔‘‘

مزید تفصیلات سے پتہ چلا کہ اسکے ابو شام میں خانہ جنگی کے سبب اک جگہ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگئے، اور اسی وجہ سے وہ دو دن تک سو نہیں آسکی۔ اس دن میں نے بریک کے وقت تقریبا آدھی کلاس کو اک طرف سنجیدہ بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ ہالہ کے بالکل پاس بھی نہیں تھے، مگر معلوم ہوتا تھا کہ اپنے اس باڈی جسچر سے یہ پیغام دے رہے ہوں کہ وہ ہالہ کی اداسی میں شریک ہیں۔

کلاسز ہوتی رہیں، میں اپنی مشکلات بھول کر ایئر نائن میں کافی توجہ سے پڑھاتی رہی اور انکی کلاس سے ہٹ کے بھی روٹین کا باریکی سے مشاہدہ کرتی اور یوں وہ کلاس میرے دل کے بہت قریب ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اس کلاس میں کوئی کسی بھی طرح کی تفریق معلوم نہیں ہوتی تھی، ہیڈ مسٹریس سے لیکر باقی سٹاف بھی بچوں کی اوورآل پرفارمنس سے خوش تھے۔

حتیٰ کہ آخری دن آگیا، یہ سکول میں میرا آخری دن تھا، میری براستہ برسبن سڈنی کیلیئے بکنگ ہوچکی تھی۔ ایئر نائن نے میرے لئے اک پرخلوص پارٹی کا خود سے اہتمام کیا اور اس سے بڑھکر مجھے اخیر لمحوں میں بتا کر حیرت میں بھی مبتلا کردیا۔

بریک کے دوران اچانک پلے گراؤنڈ میں شور سا برپا ہوگیا، میں اپنی چائے ایکطرف چھوڑ کر باہر نکلی تو بہت سے بچوں کو جمع ہوتے دیکھا، بغور دیکھا تو ہالہ اور ایئر ٹین کے بچے میں کسی بات میں ان بن ہوگئی تھی۔ وہ عمر میں اس

باقی صفحہ ۵۷ پر ملاحظہ کیجیے

سَودا

سلیم آغا قزلباش
(سرگودھا)

حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر گئے تھے کہ اُس کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ اُس کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی اور لڑکے والوں نے مطالبہ کر دیا تھا کہ رخصتی سے قبل ہونڈا موٹر سائیکل، ایل سی ڈی، سپلٹ اے سی اور ڈیپ فریزر اُن کے گھر پہنچا دیا جائے حالانکہ نکاح کی رسم ادا کرنے سے قبل دونوں گھروں کے مابین یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا چکا تھا کہ جہیز کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور شادی کی دیگر رسوم بھی سادگی سے ادا کی جائیں گی تا کہ بے جا اصراف سے بچا جا سکے۔ مگر اب لڑکے والوں کے بدلے بدلے تیور دیکھ کر محمد یعقوب کے کاندھوں پر منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ اگر رسمِ نکاح پہلے ادا نہ کی جا چکی ہوتی تو وہ یہ رشتہ ہی توڑ دیتا یا پھر اُن سے اتنی مہلت مانگ لیتا جس میں اُن کے یہ سب مطالبات پورے کیے جا سکتے۔

محمد یعقوب کی زندگی رُوکھی پھیکی کھا کر گزری تھی۔ اُس کی بیوی جب تک زندہ رہی، وہ نہ صرف کم آمدنی میں گھر چلاتی رہی بلکہ اُس کے دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی پوری توجہ دی تھی۔ وہ خود صرف مڈل پاس تھا، اس لیے اسے کوئی اچھی نوکری نہ مل سکی تھی اور وہ ساری عمر محنت مزدوری کر کے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا رہا۔ اُس نے گدھا گاڑی بھی چلائی، فیکٹری میں بھی کام کیا اور کوٹھیوں میں چوکیداری بھی کرتا رہا مگر اُسے مالی آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اُس کی بیوی ایک سگھڑ عورت تھی۔۔۔ اسی وجہ سے گھر کا چولھا ہمیشہ جلتا رہا۔ دو سال قبل دل کا دورہ پڑنے سے وہ چل بسی۔۔۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ اُسے ہسپتال لے جانے کا موقع بھی نہ ملا۔ اُس کے رخصت ہو جانے کے بعد محمد یعقوب کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ بیٹا کامران کالج میں پڑھتا تھا، ابھی وہ اُسے کسی کام دھندے پر لگانا نہیں چاہتا تھا۔۔۔ ایسا کرنے سے اُس کا مستقبل تاریک ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو زیادہ تعلیم نہ دلا سکا تھا وہ خاصی خوش شکل تھی اور گھریلو کام کاج میں بھی طاق تھی، اُس کی مرحومہ ماں نے اُسے اُمورِ خانہ داری میں کافی ماہر کر دیا تھا اور انہیں گُنوں کی وجہ سے اس کا رشتہ ایک ایسے لڑکے سے طے پا گیا تھا جو ایک کاٹن فیکٹری میں فورمین کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور چار موٹر رکشوں کی ملکیت جس کی اضافی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ جوان بیٹی کو کسی کی نگرانی میں چھوڑ کر اُسے محنت مزدوری کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ اپنے آبائی گاؤں گیا اور اپنی ایک بیوہ خالہ کو شہر چل کر ساتھ رہنے پر آمادہ کر لیا جس کے آ جانے سے حالات واقعی بہتر ہو گئے۔

محمد یعقوب نے لڑکے والوں کو یاد دلایا کہ نکاح سے قبل اُنہوں نے کسی قسم کے مطالبے کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی مگر اُن کا جواب تھا کہ:

''ہمیں اپنی برادری میں بھی منہ دکھانا ہے۔ کل کلاں کو ہمارے شریک ہمیں طعنے دیں گے کہ سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کن بھُوکے ننگوں کے ہاں کر دی!''

اب محمد یعقوب کو یوں لگتا کہ اُس کی بیٹی کی زندگی بھنور میں پھنس چکی ہے اور اگر وہ جلد کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو نہ جانے کیا نتیجہ نکلے! اسی کشمکش اور پریشانی کے عالم میں اُسے اپنا گردہ بیچ کر لڑکے والوں کا منہ بند کرنے کا خیال آیا مگر اس سلسلے میں اُسے کہاں جانا تھا، کس سے ملنا تھا اور لین دین کے معاملات کس طرح چُکانا تھے ایسی باتوں سے وہ قطعاً ناواقف تھا۔ البتہ اخبار میں گاہے بگاہے ایسی خبریں اُس کی نظروں سے گزرتی رہی تھیں کہ بعض نجی ہسپتال گردوں کی خریداری کے دھندے میں ملوث ہیں اور غریبوں، بے کسوں اور مجبور لوگوں کو معاوضہ ادا کر کے اُن کا ایک گردہ نکال کر ضرورت مندوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اسی شش و پنج میں چند دن مزید گزر گئے۔ آخر ایک دن اُسے ایک ایسے مزدور کے بارے میں پتا چلا جس نے کچھ عرصہ قبل اپنی کسی گھریلو مجبوری کی وجہ سے اپنا ایک گردہ فروخت کر دیا تھا۔ اُس سے ملاقات کر کے محمد یعقوب کو کافی معلومات حاصل ہو گئیں۔ اُس مزدور نے اُسے پرائیویٹ ہسپتال کا نام پتا بھی بتا دیا جہاں خفیہ طریقے سے یہ کاروبار گزشتہ کئی سال سے جاری تھا۔ اس کے علاوہ اُس نے اُسے اُس ایجنٹ کا پتا ٹھکانہ بھی بتا دیا جس کے ذریعے گردوں کی خرید و فروخت کا معاملہ طے پاتا تھا۔ چنانچہ ایک روز وہ جی کڑا کر کے اُس ایجنٹ کے پاس جا پہنچا۔ اُس نے کچھ بنیادی باتیں محمد یعقوب پر واضح کیں اور کافی بحث و تکرار کے بعد اڑھائی لاکھ روپے میں گردے کا سودا طے پا گیا۔ ایجنٹ نے اپنے کمیشن کے طور پر پانچ ہزار روپے طلب کیے تھے جو محمد یعقوب نے دینے کی ہامی بھر لی۔ اگلے روز ہسپتال میں داخل کر کے اُس کے چند ٹیسٹ لیے گئے اور پھر اُسے ڈرپ لگا دی گئی۔ بستر پر لیٹے لیٹے یک دم اُس کے دل میں خوف کی ایک عجیب سی لہر اُبھری، اُسے اپنے پورے بدن پر ٹھنڈے پسینے کی تری محسوس ہونے لگی۔ ایک بار تو اُس کے دل نے کہا کہ وہاں سے بھاگ جائے مگر دوسرے پل ہی اُس کی بیٹی کا غمگین چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور اُس نے اپنا ارادہ بدل لیا کہ ایک گردے کی قربانی دے کر وہ اپنی لاڈلی کی زندگی بچا سکتا تھا۔

آپریشن سے پہلے ایک بار پھر اُس کا طبی معائنہ کیا گیا اور اُسے دو انجکشن لگا دیے گئے جس پر وہ خود کو کچھ کچھ غنودگی کے عالم میں جاتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ اُسے بس اتنا یاد رہا کہ آپریشن تھیٹر میں سفید نقاب پوش اُس کے دائیں بائیں آ کھڑے ہوئے تھے اس کے بعد اُسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ اگلے روز جب وہ ہوش میں آیا تو اُسے بتایا گیا کہ آپریشن کامیاب رہا تھا اور وہ جلد اپنے گھر جا سکے گا۔ دو دن کے بعد اُسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اُس کے ٹانکے ابھی کچے تھے اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کچھ روز مزید ہسپتال ہی میں آرام کرے مگر انتظامیہ نے اجازت نہ دی۔ البتہ کچھ ضروری ادویات اُسے مفت مہیا کر دیں گئیں اور بعض ہدایات پر عمل کرنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ وہ ٹانکے

کھلوانے کے لیے چند دن بعد دوبارہ ہسپتال آئے۔اب صرف رقم کی وصولی کا مرحلہ باقی تھا۔تھوڑی دیر بعد ایجنٹ وہاں پہنچ گیا اوراُسے ایک ریستوران میں لے گیا چائے کا آرڈر دے کر اُس نے سگریٹ سلگایا اور دو تین گہرے کش لینے کے بعد اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے ایک خاکی رنگ کا لفافہ نکال کر اُس کے حوالے کر دیا۔محمد یعقوب اُس وقت کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا،اُس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا مگر وہ اندر سے مطمئن تھا کہ اُس نے اپنی بیٹی کی زندگی کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا تھا۔۔۔اُس نے سوچا،اب سسرال میں اُس کا سر اونچا رہے گا۔پھر کپکپاتے ہاتھوں سے جب اُس نے رقم گنی تو اُس میں پچاس ہزار روپے کم تھے۔اُس نے ایجنٹ کی طرف دیکھا تو وہ معاملے کو بھانپتے ہوئے اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔محمد یعقوب کے اندر طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اُس نے اُسے انتہائی درشت لہجے میں کھری کھری سنائیں تو ایجنٹ نے اُس کے بگڑے تیور دیکھتے ہوئے بقیہ رقم اپنا کمیشن کاٹ کر اُس کے حوالے کر دی۔

اُس کے لیے گھر تک کا سفر خاصا تکلیف دہ تھا۔گھر والے اُس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے مگر اُس نے انہیں تسلی دی کہ سفر کی تھکان کی وجہ سے کچھ کمزوری ہو گئی ہے۔وہ گھر والوں کو اپنے کسی بچپن کے دوست کے بیٹے کی شادی میں شرکت کا بتا کر گیا تھا۔بہرکیف اُس نے کسی کو ہوا تک نہ لگنے دی کہ وہ اپنا گردہ فروخت کر چکا ہے۔چند روز مکمل آرام کرنے اور اچھی غذا کے استعمال سے وہ کافی حد تک صحت مند ہو گیا۔ایک ہفتے کے بعد وہ دوبارہ ہسپتال جا پہنچا۔اُس کے ٹانکے کاٹ دیے گئے البتہ چند روز اور دافعِ عفونت ادویہ جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی۔یہ مرحلہ طے کر کے وہ خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔اُس نے اپنے بیٹے،بیٹی اور خالہ کو خوش خبری سنائی کہ لڑکے والوں کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے اُس نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔یہ سن کر نہ صرف اُس کی بیٹی کے چہرے پر رونق آ گئی بلکہ اُس کی خالہ اور بیٹا بھی نہال ہو گئے۔اگلے چند دن میں موٹر سائیکل کے سوا اُس نے وہ تمام چیزیں خرید لیں جن کا لڑکے والوں نے مطالبہ کیا تھا۔پھر ایک دن اُس نے اپنے داماد اور سمدھی کو گھر بلا کر موٹر سائیکل خریدنے کے لیے رقم اُن کے حوالے کر دی۔یہ دیکھ کر باپ بیٹا دونوں خوش ہو گئے اور ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی پکی کر گئے۔یوں محمد یعقوب کی بیٹی کی شادی نہایت خوش اسلوبی سے انجام پا گئی اور اُس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اُتر گیا۔

زندگی کا پہیہ گھومتا چلا گیا۔ایک سال کے بعد محمد یعقوب نانا بن گیا۔ بیٹی کی خوش گوار زندگی دیکھتے ہوئے وہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا۔مگر اِدھر کچھ عرصے سے اُسے اپنے بیٹے کی طرف سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔اُس نے ایف ایس سی فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔اُس کی تعلیم اور ہوسٹل میں رہائش کی وجہ سے اخراجات میں کافی اضافہ ہو گیا تھا مگر محمد یعقوب جیسے تیسے سب خرچے برداشت کرتا رہا۔وہ چاہتا تھا کہ کامران اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد کوئی معقول ملازمت حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔کامران بھی خاصا محنتی تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اُس کا باپ مشکل حالات میں بھی اُس کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہا تھا۔کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اُس نے ملازمت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں مگر ہر جگہ اُس کی نو آموزی،ناتجربہ کاری اور سفارش کی عدم موجودگی آڑے آ جاتی۔مایوسی اور نا اُمیدی نے اُس کے دل و دماغ میں غصہ بھر دیا۔وہ بلاوجہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھ پڑتا،کمرے میں زیادہ تر اکیلا پڑا رہتا۔لیٹے لیٹے تنگ آ جاتا تو گھر سے باہر نکل جاتا اور اپنے بچپن کے چند دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر یا مٹر گشت کر کے واپس آ جاتا۔محمد یعقوب کے لیے ایک بار پھر آزمائش کی گھڑی آ گئی تھی۔۔۔اُس کا جوان بیٹا ملازمت کے بغیر بے کار زندگی گزار رہا تھا۔بظاہر اس مسئلے کا کوئی فوری حل نظر نہیں آ رہا تھا البتہ ایک دن باتوں باتوں میں کامران نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر اُسے بیرونِ ملک جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جائے تو گھر کے تمام دلدّر دُور ہو سکتے ہیں۔مگر اس معاملے میں سب سے بڑی رکاوٹ رقم کا حصول تھا۔کم از کم پانچ چھ لاکھ اکٹھا کیے بغیر کامران کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکتا تھا اور اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا سہل نہیں تھا۔کامران نے تو اپنی خواہش کا اظہار برملا کر دیا مگر محمد یعقوب کے سر پر پہاڑ جتنا بوجھ آن پڑا۔اب وہ دن رات اسی اُدھیڑ بُن میں رہنے لگا کہ اس رقم کا انتظام کیسے کیا جائے۔اتنی بھاری رقم قرض پر بھی نہیں مل سکتی تھی کیونکہ اُس کے پاس رہن رکھنے کے لیے نہ تو کوئی مکان تھا نہ زمین اور پھر دوستوں،رشتے داروں میں بھی ایسا کوئی نہیں تھا جو اس معاملے میں اس کی دادرسی کر سکتا۔شدید ذہنی پریشانی کے عالم میں اُس کے اندر سے آواز آئی کہ وہ اپنے جسم کا کوئی اور انگ گوشہ کیوں نہ فروخت کر دے تا کہ کامران کا مستقبل سنور جائے۔چنانچہ اُس نے اس بارے میں عملی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ایک دن وہ اُسی ایجنٹ سے ملنے چلا گیا جس نے اُس کا گردہ فروخت کروایا تھا مگر اُس کا رویہ اُس کے ساتھ رُوکھا پھیکا سا رہا۔محمد یعقوب نے ایک ہزار کا نوٹ اُس کے ہاتھ پر رکھا تو وہ فوراً تعاون کرنے پر رضا مند ہو گیا۔مگر مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہ جس پرائیویٹ ہسپتال کی معاونت کرتا تھا وہاں صرف گردوں کی خرید و فروخت اور پیوند کاری کا خفیہ کام ہوتا تھا۔ بسیار کوشش کے باوجود وہ ایجنٹ اُس کی کوئی مدد نہ کر سکا البتہ اُس نے اتنی رہنمائی ضرور کی کہ اسلام آباد،لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں انسانی اعضا کی پیوند کاری کرنے والے نجی ہسپتال سے رابطہ قائم کرنے سے کوئی امیر کبیر مریض اُس کی آنکھوں کا قرنیہ یا جگر کا ٹکڑا خریدنے پر تیار ہو سکتا ہے۔

محمد یعقوب سوچتا کہ باسٹھ تریسٹھ برس سے وہ اس دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا تھا اور مزید ایسا کچھ نہیں تھا کہ جس کے لیے وہ اپنی آنکھوں کی روشنی محفوظ رکھتا۔بیٹی اپنے گھر میں آباد اور سکھی تھی،قرضہ کوئی چکانا نہیں تھا صرف بیٹے کی زندگی کو روشن کرنا باقی تھا اور اگر دو آنکھوں کے عوض یہ دولت مل جائے تو گھاٹے کا سودا ہرگز نہ ہو گا۔اُس نے فیصلہ تو کر لیا مگر عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں تھا۔تاہم بیٹے اور خالہ کو یہ بتا کر کہ وہ ایک نہایت ضروری کام کے سلسلے میں ایک ماہ کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہے گھر سے چل پڑا۔پہلے اسلام آباد پہنچا جہاں وہ چند روز تک ٹھہرا رہا۔اِدھر اُدھر سے معلومات اکٹھی کر کے دو تین نجی ہسپتالوں

تک رسائی حاصل کی مگر کامیابی نہ مل سکی۔ ہر جگہ یہی کہا جاتا کہ وہ اپنا نام پتا لکھوا دے اگر کوئی ضرورت مند آیا تو مطلع کر دیا جائے گا۔ پھر اُس نے لاہور کا رُخ کیا۔وہاں بھی وہ دن رات مارا مارا پھرتا رہا۔مگر مایوسی نے اُسے پوری طرح اپنے شکنجے میں لے لیا۔ پھر بھی بیٹے کی زندگی سنوارنے کی خاطر وہ ہمت نہیں ہار رہا تھا۔ وہیں نجی ہسپتالوں میں دھکے کھاتے کھاتے اُس کی ملاقات اللہ کے ایک نیک بندے سے ہوگئی۔ اُس کی بپتا سن کر اُس نیک بندے نے مشورہ دیا کہ اگر وہ کراچی جا کر قسمت آزمائی کرے تو اُس کے دل کی مراد پوری ہونے کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں کیونکہ کراچی ایک ایسا شہر ہے جہاں دوسرے ملکوں سے بھی لوگ علاج معالجے کی غرض سے آتے جاتے رہتے ہیں۔اللہ کے اُس نیک بندے نے اپنے ایک دو واقف کاروں کے موبائل نمبر بھی لکھ دیے جن کی وساطت سے اسے وہاں سستی رہائش اور دیگر سہولتیں میسر آ سکتی تھیں۔اُس نیک بندے کا شکریہ ادا کر کے وہ کراچی روانہ ہوگیا۔

ریل کا تھکا دینے والا طویل سفر طے کر کے وہ اپنی آنکھوں کی روشنی بیچنے کے لیے روشنیوں کے شہر میں جا پہنچا۔جن دو افراد کے فون نمبر اُسے دیے گئے تھے انہوں نے محمد یعقوب کے لیے سستی رہائش اور کھانے پینے کا معقول بندوبست کر دیا۔ اگلے ہی روز اُس نے شہر نوردی شروع کر دی۔ پرائیویٹ ہسپتالوں سے رابطہ کر کے اُس نے اپنی آنکھوں کا قرنیہ فروخت کرنے کی بات کی مگر بے سود۔۔۔اُسے یہی بتایا گیا کہ:

’’لوگ عموماً آنکھوں کا عطیہ ضرورت مندوں کو دان کیا کرتے ہیں اور اکثر لوگ مرنے سے پہلے اپنی آنکھوں کا قرنیہ نابینا افراد کے لیے وقف کر جاتے ہیں۔تاہم کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی حادثے کے باعث نابینا ہو جانے والے افراد معاوضہ ادا کر کے قرنیہ خرید لیتے ہیں۔‘‘

یہ سب جان کر اُسے اپنی کامیابی کے امکانات اندھیرے میں ڈوبتے محسوس ہونے لگے۔اب اُس کے پاس کھانے پینے کے لیے بھی خرچہ بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے مزدوری بھی شروع کر دی تا کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مزید کچھ عرصہ اس شہر میں رہ سکے۔

ایک روز اچانک ایک بڑے پرائیویٹ ہسپتال کے باہر اُس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی جو آنکھوں کے قرنیے کی تلاش میں تھا۔وہ دونوں ایک ہی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ اُس شخص نے موبائل فون پر کسی کو اطلاع دی کہ ابھی تک کہیں سے بھی قرنیہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ جب اُس کی گفتگو ختم ہوئی تو محمد یعقوب نے ڈرتے ڈرتے اُس شخص سے اپنی آنکھوں کا قرنیہ فروخت کرنے کی بات کی۔ یہ سنتے ہی اُس شخص کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مختصر سی تعارفی گفتگو کے بعد اُس شخص نے اسے ساتھ چلنے کو کہا تا کہ ضرورت مند خاندان سے اُس کی ملاقات کرا دی جائے اور لین دین کے معاملات بھی طے پا جائیں۔ وہ اُس شخص کے ساتھ ہو لیا۔۔۔آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد کار شہر کے پوش علاقے میں داخل ہوئی اور پھر ایک بنگلے میں جا رُکی۔وہ شخص اسے مہمان خانے میں بٹھا کر بنگلے کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم اُس کے لیے شربت کا گلاس لے آیا۔اُس وقت واقعی شدید پیاس سے اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ پنکھے کی خوش گوار ہوا اور شربت کے ٹھنڈے میٹھے گھونٹوں نے اُس کے جسم و جاں کو تازہ دم کر دیا۔ ابھی اُس نے گلاس خالی کیا ہی تھا کہ اُسے وہاں لے کر آنے والے شخص کے ساتھ عمدہ لباس میں ملبوس ایک معزز شخص اندر داخل ہوا۔رسمی علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو فریقین کی حالتِ زار کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئی۔ وہ معزز شخص ایک صنعت کار تھا۔ ایک کار حادثے میں اُس کی بیٹی کی دونوں آنکھوں کی بینائی ضائع ہوگئی تھی۔ چھے ماہ بعد اُس کی شادی ہونا تھی اس لیے وہ صنعت کار ہر قیمت پر اپنی بیٹی کی آنکھوں کی روشنی بحال کرانے کا خواہش مند تھا۔اور ادھر محمد یعقوب کے گھریلو حالات اور بیٹے کی غیر ملک میں تعلیم کا سوال تھا۔ طے پایا کہ سب سے پہلے محمد یعقوب کے کچھ ضروری ٹیسٹ کرائے جائیں گے تا کہ معلوم ہو سکے کہ اُس کی آنکھوں کا قرنیہ متعلقہ خاتون کو منتقل کیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ پھر اُس سے کہا گیا کہ:

’’اس مرحلے کی کامیابی کے بعد تمہیں بیانِ حلفی لکھ کر دینا ہوگا کہ تم اپنی رضامندی سے آنکھوں کا عطیہ دے رہے ہو۔‘‘

یہ بات سن کر وہ گھبرا گیا مگر جب اُسے سمجھایا گیا کہ:

’’اِس کام کے کچھ قانونی تقاضے بھی ہین جن پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔‘‘

تو بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر اُسے بتایا گیا کہ:

’’اگر تمہاری ٹیسٹ رپورٹیں ٹھیک نکلیں تو پھر تم اپنے شہر واپس چلے جانا۔ بیٹے کو باہر بھیجنے کے سلسلے میں تمام ضروری کاغذی کارروائی اور قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد اُسے اپنے ساتھ لے کر کراچی واپس آ جانا۔ یہاں تمہیں مطلوبہ رقم ادا کر دی جائے گی۔‘‘

محمد یعقوب نے ان سب باتوں پر عمل کرنے کی ہامی بھر لی۔ البتہ اُس نے کچھ پیشگی رقم کا تقاضا کیا تا کہ وہ پیشِ نظر معاملات کو آسانی سے نبٹا سکے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ٹیسٹ رپورٹیں ٹھیک آنے کی صورت میں اُسے ایک لاکھ روپے کی رقم ادا کر دی جائے گی۔

اُس رات وہ بہت بے چین رہا۔ایک طرف امید اور دوسری طرف نا اُمیدی اُس کے آلتی پالتی بیٹھ رہیں۔۔۔ایک خوشی کی نوید دیتی تو دوسری مایوسی کی باتیں کرتی۔اُن دونوں کی بحث و تکرار سنتے سنتے رات بیت گئی۔ صبح مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو وہ بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ وضو کرنے کے بعد نماز ادا کی اور پھر تا دیر مصلّے پر بیٹھا ہاتھ اٹھا کر خیر طلبی کی دعائیں مانگتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب اُسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں اُس کے بلڈ ٹیسٹ ہوئے۔ دو دن کے بعد رپورٹیں ملنا تھیں۔ اسے ساتھ لانے والے شخص نے کہا:

’’اب تم اپنی جائے رہائش پر چلے جاؤ۔۔۔رپورٹیں آنے پر تمہیں

مطلع کر دیا جائے گا۔''

یہ دو دن کا عرصہ اُسے تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے محسوس ہوا۔ تیسرے دن دوپہر کے وقت اُسے موبائل فون پر خوش خبری سنائی گئی کہ:

''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔۔۔لہٰذا تم آ کر پیشگی رقم لے جا سکتے ہو۔''

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بنگلے پر پہنچا۔ اُس نے پیشگی رقم وصول کرتے وقت التجا کی کہ:

''میرے بیٹے کے کان میں اس سارے معاملے کی بھنک تک نہیں پڑنی چاہیے مبادا کہ وہ باہر جانے سے انکار کر دے۔''

گھر واپس پہنچ کر اُس نے کامران کو بتایا کہ اُس کے لیے کراچی کے ایک صنعت کار کے کارخانے میں بہت اچھی تنخواہ پر ملازمت کا انتظام ہو گیا ہے اور وہ اُسے پانچ لاکھ کا قرضہ بھی دیں گے۔ کامران کو اپنے باپ کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ اُس نے سوچا، شاید فکر و پریشانی کے باعث اُس کا والد بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔ مگر جب اُس نے ایک بڑی رقم دیتے ہوئے کہا کہ:

''اس رقم سے تم اپنا پاسپورٹ اور تمام ضروری کاغذات بنوا سکتے ہو''

تو کامران کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور اُس نے اگلے ہی روز تمام مراحل سے نپٹنے کی تیاری شروع کر دی۔ کم و بیش ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اُس نے باہر جانے کے تمام انتظامات مکمل کر لیے۔ خوشی سے اُس کے پاؤں زمین پر ٹِک نہیں رہے تھے۔۔۔مگر اُسے کیا پتا تھا کہ اس خوشی کے لیے کتنی بڑی قیمت ادا کی جانے والی ہے۔

آخر ایک اَبر آلود صبح کو محمد یعقوب اپنے نورِ نظر کے ساتھ کراچی پہنچ گیا۔ حسبِ وعدہ اُسے بقیہ رقم ادا کر دی گئی۔ دو روز کے بعد کامران کی فلائٹ تھی۔ محمد یعقوب جانتا تھا کہ اس کے بعد اُس کی زندگی میں کبھی نہ ختم ہونے والی شبِ دیجور اُترنے والی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔۔۔اُس کی نظریں کامران کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں جیسے وہ اُس کا ایک ایک نقش گھول کر پی جانا چاہتا تھا۔ کامران حیران تھا کہ اُس کے ابّا، نہ جانے کیوں اُسے مسلسل دیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن اُس نے یہ سوچ کر اپنے والد سے کوئی سوال نہ کیا کہ یہ تو والدین کی محبت کا فطری تقاضا ہے کہ اُسے کئی سال تک اُن کی نظروں سے دور رہنا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اُسے رخصت ہونے سے پہلے جی بھر کے دیکھ لینا چاہتے ہیں۔

محمد یعقوب کو دن کی جو مہلت ملی تھی وہ اُسے جاگتی آنکھوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ اگلے دن وہ بیٹے کو لے کر سمندر کنارے گیا۔ کئی گھنٹوں تک باپ بیٹا سمندر کی بپھری لہروں کا نظارہ کرتے رہے جس کی سطح پر مچھیروں کی کشتیاں، سٹیمر اور سمندری جہاز اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ شام کو انہوں نے شہر کے کئی مشہور مقامات کی سیر کی۔ اُس سے اگلا دن بھی خاصا مصروف گزرا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ بیٹے کو لے کر چڑیا گھر جا پہنچا۔۔۔شاید وہ مختلف قسم کے پرندوں، چرندوں اور درندوں کو بھی آخری بار جی بھر کے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ رات کو وہ تا دیر بنگلے کے ٹیرس پر کرسی بچھا کر، چاند ستاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ تیسرے روز صبح کے وقت وہ ہوائی اڈے پر بیٹے کو الوداع کہنے کے لیے اُس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ آخر روانگی کا لمحہ آن پہنچا۔ اُس نے کامران کو زور سے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ آنسوؤں کے دو قطرے پلکوں سے ٹوٹ کر اُس کی سفید خشخشی داڑھی میں جذب ہو گئے۔ وہ کامران کی پشت پر نظریں جمائے اُس وقت تک اُسے دیکھتا رہا جب تک وہ اُس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اُس نے اپنی دونوں آنکھیں ایک دم پورے زور سے میچ لیں!!

- بقیہ -

روشنی کا ہالہ

سے بڑا تھا اور کچھ تناؤ والے انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ ابھی ہالہ کو گھونسا دے مار یگا، اور ایسا ہی ہوا، اس نے اک زوردار گھونسا اسکے منہ پہ دے مارا۔ آن کی آن میں ناک کے بانسے سے خون بہہ نکلا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھنے کا سوچا ہی تھا کہ اک عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔

ائیر نائن کے بچے ادھر ادھر سے سامنے آنے لگے اور عین ہالہ اور ائیر ٹین کے بچے کے درمیان آ گئے۔ وہ لڑکا، پوری کلاس اور پھر انکے باقی دوستوں کو یوں جمع ہوتے دیکھکر حیرت میں رہ گیا۔ اس سے پہلے جہاں لڑائی ہوتی تو سبھی تماشا دیکھتے تھے؛ آج پہلی بار ایسا واقعہ ہو رہا تھا۔ گو کہ ہالہ کے ناک سے ابھی بھی خون بہہ رہا تھا مگر مجھے کلاس کو یوں یکجا ہو کر ہالہ کے ارد گرد جمع ہوتے دیکھکر دلی شادگی ملی۔

جہاز بادلوں کے بیچ میں رستہ بناتے ہوئے اڑتا جا رہا تھا، میں نیو ساؤتھ ویلز کی فضائی سرحد میں داخل ہو چکی تھی، مگر ہالہ اور اسکی کلاس کیساتھ گزرا ایک سال یادوں سے بھرپور تھا اور انکا بسیرا میرے آس پاس تھا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ ہالہ نے اپنے نام کا مطلب بتایا تھا کہ چاند کے ارد گرد روشنی کا ہالہ سا بن جانا، جیسے بارش ہونے والی ہو اور ایسا ہی ہوا، آخری دن کی لڑائی میں ہالہ کے ارد گرد دنیا سے آئے مہاجر اور نیورو کی آبادی نے اسکو اپنی بانہوں میں بھر دیا تھا۔

ہاں! اسے یتیم ہونے سے تو کوئی نہیں بچا سکا مگر وہ اب Homeless نہیں رہی، نیورو اب اسکا اپنا گھر تھا۔

رُودادِ چمن

شیخ بشیر احمد
(سری نگر، بھارت)

تھی تو وہ بڑی سمجھدار، صابر شاکر اور اخلاقی لحاظ سے صحیح معنوں میں معصوم بھی۔ اسکا چھوٹا سا گھر اور اس گھر کے چھوٹے سے آنگن میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا کرتی اور ہنسی مذاق میں دن گزار لیا کرتی۔ ان کا دل بہلاتی رہتی۔ سارا گھر خوشیوں سے بھرا رہتا تھا پھر ایک دن اچانک اس پر غم کا ایسا پہاڑ ٹوٹا کہ کچھ بھی سوجھائی نہ دیا۔ چاروں طرف اندھیرا۔ لگتا تھا جیسے قدرت نے نوشتہ تقدیر لکھنے کے بعد اس پر سیاہی پھیر دی ہو۔ وہ چڑ چڑی سی ہوگئی۔ اب صرف روتی رہتی تڑپتی رہتی یعنی زندگی سے مایوس سی ہوچکی تھی۔ لوگوں نے سوچا اس کے دل پر جو گہری چوٹ لگی ہے شاید اس کے صدمے سے نہ بچ پائے گی۔ کیونکہ زخم اتنا گہرا اثر کر چکا تھا کہ چند دنوں کے بعد اس کی موت یقیناً ہوسکتی تھی۔ یوں بھی وہ اپنی زندگی کا خاتمہ ہی چاہتی تھی۔ بسا اوقات اُمیدیں آدمی کو جینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کسی مقصد نے اُسے خودکشی کرنے سے روکے رکھا اور وہ ایک انجانی امید کے سہارے زندہ رہی۔ کون جانے اس طرح کی اور ماؤں کا بھی ایسا ہی حال رہا ہو۔

دریائے جہلم کے کنارے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی ناگفتہ بہ بستی تھی، البتہ چاول میں کنکر کے برابر اس میں چند کھاتے پیتے گھرانے بھی موجود تھے۔ آزادی کے تقریباً ساٹھ سال بعد بھی یہاں نہ تو مستقل بجلی میسر تھی اور نہ پینے کے لیے صاف پانی کا انتظام تھا۔ دن ہو یا رات ہمیشہ بجلی کی آنکھ مچولی جاری رہتی۔ بعض اوقات ہفتوں بعد بھی اس کی شکل وصورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ شام ہوتے ہی ساری بستی اندھیروں میں ڈوبی رہتی۔ اس غریب عورت کے گھر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ اس کا مرد دن بھر مستری کا کام کرکے گھر آکر اب سو گیا تھا۔ اچانک بجلی چلی گئی تو چھوٹی بچی خاموشی سے موم بتی جلا کر اسے طاق پر رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسکے ہاتھ میں اردو کی کوئی کتاب تھی اور بھائی یعنی گھر کا چشم وچراغ سولہ سالہ لڑکا ماں سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بیٹا طیش کے عالم میں اناپ شناپ بکتے ہوئے گھر سے بھاگ جانے کی دھمکی دے رہا ہے اور ماں اُسے خدا اور بہن کا واسطہ دے کر سمجھاتی ہوئی ایسا کرنے سے روک رہی ہے۔ ماں ہے نا۔ بیٹے کی جدائی کیسے برداشت کرسکے گی۔ اسکے تن میں اس کی روح جو رچی بسی ہے۔ بھلا روح کے بغیر جسم کی کوئی قدر ومنزلت ہوسکتی ہے؟ اُسے معلوم تھا کہ اس کا بیٹا بستی میں اول سے ہی تعلیم میں یکتا اور اچھے نمبر حاصل کر کے گریجویشن پاس کرنے کے باوجود گھر پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہاتا رہتا ہے۔ وہ اس کے مستقبل کے بھیانک انجام سے دل برداشتہ اور پشیمان تھی۔ پھر جب بچہ بڑا اور جوان ہورہا ہو تو اس کے مطالبات کیساتھ ساتھ اس کے جذبات کی بیداری میں بھی تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کا بیٹا بچپن سے ہی خاموش طبع سنجیدہ اور کافی ذہین تھا۔ نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ قرآن شریف کے لگ بھگ دس پارے بھی حفظ کر چکا تھا۔ پھر جوں ہی وہ عزت نفس اور زندگی کو بامقصد بنانے میں مصروف ہوگیا تو اس نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو زندگی کے معاملات میں احساس کمتری، سخت مزاجی، کٹر پسندی اور انتہائی غیر لچکدار اور بسا اوقات بے رحمانہ رویہ اختیار کیے ہوتے تھے یہ دیکھ کر اس کے سوچنے کے ڈھنگ میں اصلاحی آداب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا جذبہ بھڑک اٹھا اور وہ ان لوگوں کی طرف کھینچتا چلا گیا جو ایک اسلامی تشخص والا نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وادی میں ایسی تیز وتند آندھی آئی جس نے یک لخت ساری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک دہشت بھرا ماحول پیدا کر دیا۔ ان حالات میں لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ نوجوان جوق در جوق ٹولیوں کی صورت میں سرحد پار چلے گئے اور جب وہاں سے اسلحہ سے لیس ہوکر واپس لوٹے تو راستے میں سینکڑوں نوجوان حفاظتی دستوں کی گولیوں کی زد میں آکر لقمہ اجل ہوگئے۔ بیشتر کو پکڑ کر جیل کی کال کوٹھریوں میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے ٹھونسا گیا بیشتر نہ صرف تڑپائے گئے بلکہ بے نام ونگ دفنائے گئے۔ اور جو جان بچا کر سرحد پار کرنے میں کامیاب رہا انہوں نے شہروں اور قصبہ جات کا رُخ کر لیا۔ انتقامی جذبے کے حامل افراد سراپا احتجاج تھے۔ جہاں کہیں کوئی وردی پوش یا نقاب پوش نظر آیا بندوقوں کے نشانے پر آ گیا۔ اچانک حالات ابتر ہوگئے۔ کل تک جہاں فاختاؤں اور کوئلوں کی کوک گونجا کرتی تھی۔ خوشحال اور دل لبھانے والی بولیاں کانوں میں پڑتی تھیں۔ جہاں محبت اور اخوت کی قندیلیں روشن تھیں وہاں اب گولیوں کی گھن گرج اور دستی بموں کے پھٹنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی تھی۔ اک آگ سی لگی تھی اور اس آگ کی تپش میں بہت کچھ جل کر راکھ ہورہا تھا اور اس راکھ سے محض دھواں اٹھ رہا تھا۔

ایک ہو کا عالم تھا۔ لوگ سہمے سہمے، حیران وپریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہتے تھے افراتفری کے ماحول میں ایک دن نوری رات گئے اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی کہ شاید ابھی نہ تو ابھی آئے لیکن جب سحر کی سپیدی مشرق کی اور سے نمودار ہوئی اور وہ گھر لوٹ کے نہ آیا۔ تو وہ بے چین ہوگئی۔ اس دن سے اب تک اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ جانے کہاں چلا گیا۔ اپنی یادیں چھوڑ کر جانے کہاں روپوش ہوگیا تھا۔ ورنہ بسیار تلاش کرنے پر ضرور اس کا پتہ چل جاتا۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا دیکھتے ہی دیکھتے وہ طوفان تھم گیا۔ جو اس سے پہلے آیا تھا۔ اب لوگوں نے قیاس کیا کہ شاید اُسے وہ کسی بے نام قبر میں ابدی نیند سلا دیا گیا ہے۔ مگر کہاں کس قبر میں؟ اب تک یہ بھید عیاں نہ ہوا۔ شاید کریک ڈاؤن یا چھاپے کے دوران

گرفتار ہوکر جیل کی اندھیری کوٹھری میں طرح طرح کی اذیت ناک تکالیف اور ٹارچر سے دم توڑ بیٹھا ہو۔ بہت سارے کم سن نوجوان مختلف نامعلوم جگہوں پر جس بُری طرح دفنا دیئے گئے ہیں اُس بربریت کے بارے میں کوئی ذی حس انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب جب کہ لگ بھگ دس سال کا لمبا عرصہ بیتنے کے بعد قیامت خیز موسمی آندھی دفعتاً تھم گئی تو اپنوں کی بازیابی کیلئے لوگ متحرک ہونے لگے۔ حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آ کر مظاہرے کرنے لگے۔ لاپتہ نوجوانوں کے بارے میں جانکاری دینے کی مانگ زور و شور سے اُٹھنے لگی۔ جو مارے گئے تھے ان کی بے نام قبروں کی نشاندہی اور شناخت بتانے کی مانگ بڑھنے لگی۔ ان حالات میں جب کبھی نوری بچاری نامعلوم قبروں کی بازیافتگی سے متعلق کوئی اشتہار دیکھتی تو اسے اپنا بیٹا ہاتھ میں پرچم لہراتا ہوا اجتماع میں شامل ہونے کا گمان ہوتا۔

آج کا اجتماع جو شہر کے ایک بڑے سے ہال میں منعقد ہو رہا تھا۔ اس کے متعلق سن کر وہ بھی اپنے سینے پر دکھوں کا بوجھ لئے ایسے ہی شہر چلی آئی شاید وہ اپنے غمگین شوہر کو اور غمزدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جو دل برداشتہ ہو کر اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کی خود اعتمادی ہی کھو بیٹھا تھا۔

پو پھٹتے ہی لوگوں نے ہاتھوں میں بینر اور گتے کے بورڈ لے کر اجتماع میں آنا شروع کیا تھا۔ یہ اجتماع شہر کے عین وسط میں بنے ایک بڑے سے ایسے ہال میں رکھا گیا تھا۔ جسے ایک صاحب ثروت نے قوم کے نام وقف کر رکھا تھا۔ اس ہال سے کبھی اس کے بیٹے کی زندگی کا تعلق بھی رہا تھا۔

کوئی بیس سال قبل ایک دن اس کا بیٹا کریک ڈاؤن کے دوران پولیس کی گرفت میں دوران تفتیش اتنا پٹ گیا کہ وہ جیل کی بند سلاخوں کے اندر ہی دم توڑ بیٹھا اور پھر دوسرے دن اس کی نعش اسی ہال کے دروازے پر پڑی ہوئی پائی گئی۔ اولاد کے غم میں وہ ٹوٹ گیا اور ٹوٹ کر ایسا بکھرا کہ اس ہال کو بیٹے کے نام سے بے سہارا اور خستہ حال عوام کے لیے وقف کر دیا۔

ہال کے آنگن میں کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ ان میں مرد و عورتیں سبھی شامل تھیں۔ جو مختلف اطراف سے آئے تھے۔ کچھ آس پاس کے علاقوں اور ملحقہ نیم گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں چند چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ وقت مقررہ سے پہلے لوگوں سے بھرا ہال یوں لگتا تھا جیسے ساری آبادی اِدھر اُمنڈ آئی ہو۔ لہٰذا کافی شور و شر مچا ہوا تھا۔ چونکہ یہ عام اجتماع نہ تھا اسلئے چند اِکا دُکا ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ ملازمین، فوٹو گرافر اور پریس رپورٹر بھی واقعہ کو Cover کرنے پہنچے تھے۔ پھر اچانک سٹیج پر ایک باریش بزرگ نمودار ہوا۔ جیسے ہی وہ مائک کے سامنے کھڑا ہوا سب کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ پورے ہال میں قبرستان جیسا سکوت چھا گیا۔ اگلی صفوں میں بیٹھی عورتوں نے زار زار رونا شروع کیا جیسے آہوں اور سسکیوں کا راج ہو گیا ہو۔ جیسے انسانوں کی بستی میں خوشی کا کال پڑ گیا تھا۔ ان کے پیچھے مردوں کی ایک اچھی خاصی تعداد قطاروں میں بیٹھے سہمے سہمے سے حیران و پریشان سے تھے۔ بیشتر حضرات آنکھوں میں نمی لیے اس بزرگ شخص کی تقریر بیقراری سے سُن رہے تھے۔ جیسے وہ سبھی اپنے ہی شہر میں اپنی بستی میں، اپنے گھر میں بے حال ہو کر اجنبیت سی محسوس کر رہے ہوں۔ بوڑھا بزرگ روہانسی آواز میں چپ رہنے کے لیے اپنے دونوں بازو ہوا میں لہرا لہرا کر خاموش ہونے کے اشارے کر رہا تھا۔ پھر ایک دم سارے مجمع پر خاموشی کی ہوا سی چلی۔ سارے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اب ہال میں صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس میں ایک التجا تھی۔ ایک عاجزی ایک درد تھا۔ ایک طوفان، ایک عجیب سی قسم کی گھٹن کیونکہ ماحول کو اس کی اثر انگیز جادو بیانی کی موٹی چادر نے جیسے ڈھک لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

تحقیقات کے بعد یہ حقیقت سامنے آسکتی ہے اور تحقیقات کا کام سرکار کے بجائے کسی بااختیار ایجنسی کو سونپنا چاہیے۔ کیونکہ سرکار روز اول سے ہی ایسے معاملات کی سچی باتیں سامنے لانے میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ جہاں جہاں لوگوں نے نعرہ بازی کرتے ہوئے تحقیقات میں خدشات ظاہر کیے لاتعلقی کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا وہاں وہاں یا تو اندھا دھند لاٹھیاں برسائی گئیں یا پھر جھوٹی تسلیاں دے کر بہلائے گئے۔ ہم اپنے جائز مطالبات کو لے کر پُرامن احتجاج کر رہے ہیں اور یہ احتجاج تب تک جاری رہیگا۔ جب تک سرکار ہماری مانگ پوری نہیں کرتی۔"

ہال کے ایک کونے میں نوری اپنے بدن کو سمیٹی ہوئی بڑے ہی انہماک سے اس کی تقریر میں سچائی محسوس کر رہی تھی۔ ہر سو خواتین سُن رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں لبالب آنسو اُبھر آئے تھے۔ اس کے کتابی چہرے پر بکھرے ہوئے بال اس کی حالتِ زار کو صاف صاف بیان کر رہی تھی۔ اور اس مغموم چہرے کو دیکھتے ہی ایسا معلوم پڑتا جیسے وہ کسی ستم زدہ بستی کے اُجڑے لوگوں کے گھر کی ایک مثالی نمونہ ہو۔ یہاں جو لوگ جمع ہوئے تھے۔ وہ بھی اس کے غم و اندوہ میں برابر ہی تھے۔ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی سوچیں کم و بیش مشترک ہیں۔ شاید یہی خلش، یہی تڑپ اور من کی ایسی ہی ہلچل ان سبھوں کو اِدھر کھینچ لائی تھی۔ ان کی غیر ہوتی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

بزرگ اپنی بپتا سنا رہا تھا۔ اور لوگ بھی ہمہ تن گوش آنسوؤں میں لت پت اس کی روئیداد سن رہے تھے۔

"میرا بھی ایک بیٹا تھا۔ جو کبھی مجھے ڈیڈی اور کبھی بابا کے نام سے یاد کرتا تھا۔" یہ کہتے ہوئے بزرگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے جی کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا تو وہ پھر یوں بول پڑا۔ جیسے اس واقعہ کی تصویر اسکی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی ہو۔ وہ بولا کہ "اچانک ایک دن ان کی زندگی میں ایک ایسا زلزلہ آیا۔ جس نے ساری خوشیاں تہس نہس کر دیں"۔ ایسے ہی کئی واقعات جیسے ایک جوان کالج جا رہا تھا۔ اچانک راستے میں گرنیڈ دھماکے کی زد میں آ گیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اس کے ٹوٹے پھوٹے استخوان اکھٹا کر کے

دفنا دیئے۔ماں بچاری کیسے جوان بیٹے کا جھٹکا سہہ پاتی۔غموں کے پہاڑ کے نیچے دب کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔پھٹے حال کھلی کھلی آنکھوں سے کبھی کھلے آسمان کو تکنے لگتی کبھی زور زور سے رونے لگتی تھی۔بچارہ شوہر جو خود بھی جواں سال بیٹے کی ہلاکت پر ٹوٹ کر بکھر چکا تھا اپنی بیوی کی ہسٹریائی حالت دیکھ کر دنیا کے سارے بکھیڑے بھول گیا۔چونکہ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔آہستہ آہستہ پڑوسیوں اور رشتہ داروں نے ڈھارس بندھائی اور بیوی کی ناگفتہ بہہ حالت کے دوررس نتائج کے بارے میں سمجھانا شروع کیا۔اور ایسے بہت سے گھرانوں کے نام زبان پر گنوا دیئے جہاں والدین نے بیٹے کی میّت کو کاندھا دیا تھا۔جہاں ماں نے اپنی عصمت ریزی میں مری اپنی لڑکی کو خود غسل دیا تھا۔

ان عورتوں کے نام بھی لیے۔جو بن بیاہی رہ گئیں جن کے گھروں میں امیدوں کے چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گئے۔سب کچھ سننے کے بعد اپنے لیے نہ سہی، بیوی کی حالت سدھارنے کے لیے اس نے بھی احتیاطی تدابیر کرنا شروع کیں اور گھر سے Mental Hospital کی چار دیواری میں منتقل کر کے اس کے علاج و معالجہ میں جٹ گیا۔

یہی کوئی آدھ گھنٹے تک، جب تک وہ بوڑھا بزرگ شخص اپنی مختصر و جامع تقریر کرتا رہا۔وہ خیال میں الجھا رہا۔تقریر اثر انگیز تھی۔حیرت زدہ مضطرب بوڑھے کی آنکھوں میں اُداسی کی پرچھائیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔اس کے اندر کرب کی لہریں شدت سے اٹھ رہی تھیں۔وہ غم انگیز آواز میں بس بولے جا رہا تھا۔

مختلف عدالتوں اور کمشنوں میں کئی اور شکایات درج ہیں۔لیکن کوئی کاروائی عمل میں لائی گئی نہ ہی نامعلوم قبروں کی شناخت کرنے کا مرحلہ حکومتی اور انتظامی سطح پر روبہ عمل لایا گیا۔بلکہ نظر اندازی کی پالیسی برابر برقرار رکھی گئی۔جس کے باعث یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار پھیل گیا ہے۔آج کے جلسے کا مدعا و مقصد یہی کچھ بتانا تھا۔اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بزرگ کو سن کر لوگوں میں ضبط اور برداشت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔آنسوؤں کا سیلاب رواں ہو گیا۔اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی یاد آتے ہی آہ و بکا سنائی دینے لگیں۔کم و بیش سب کا یہی حال تھا کون کس کی مصیبتوں کو روتا۔ہر ایک کی ایک بے عنوان کہانی تھی۔ہر ایک اپنا غم سنا رہا تھا۔ہاتھوں میں جو بینر اور گتّے کے بورڈ تھے۔ان پر چسپاں تصویریں جیسے بول رہی تھیں۔مگر ان میں کوئی اپنی بے نام قبر کے بارے میں نہ بتا رہا تھا۔شاید انہیں بے وقت موت کا جیسے یقین نہیں ہو رہا ہو۔

نوری پچھاڑتی ہوئی بے حال ہو گئی تھی۔وہ سینے سے اپنے بیٹے کی تصویر لگائے جیسے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر پھیر کر سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ اپنے شکستہ آنچل سے اس کے چہرے کو پونچھ رہی تھی۔

اچانک باہر ہال کے پولیس کی ہارن سنائی دی۔لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی جدھر جس کا رخ تھا اُسے ادھر کو بھاگنا پڑا۔نوری کو کچھ چونکانے والی بات معلوم ہوئی تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی۔اچانک خطرناک بجلی کڑکی معلوم ہوتا تھا کہ قہر خداوندی شہر کو آفت زدہ کرنے پر تُلی بیٹھی ہے۔مگر کارساز دو جہاں کی رحمت بھی نرالی ہے کہ بارش برس کر اچانک تھم گئی۔بجلیوں کا کڑکنا بھی کم ہوا۔

لوگ دھکم پیل کرتے ہال سے باہر نکل چکے تھے۔اب اکیلی نوری وہاں رہ گئی تھی۔سر سے کمر تک اٹا ہوا دوپٹہ لپیٹ کر ہال سے باہر نکلی۔ہر طرف ہو کا عالم تھا۔پولیس کا پہرہ لگا ہوا۔جابجا پولیس گاڑیاں چوہے دان کی طرح لگے ہوئے جیسے چوہوں کو پکڑنے کے لیے تیار کھڑے ہوں۔

تارکول کی سڑک پر جمی گرد و غبار نے کیچڑ کی صورت اختیار کر رکھی تھی کہ چلتے ہوئے پھسلن ہو رہی تھی۔ایسے میں نوری کسی سڑک پر اوندھے منہ دھڑام سے گر گئی۔بچاری...ناتواں وجود بھاری کم بوجھ کی وجہ سے کھڑی نہ ہو پا رہی تھی۔وہ کیچڑ میں لت پت ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر ہوش میں آتے ہی تھوڑی سے سنبھلی مگر لگتا تھا کہ جیسے دل کی دھڑکنیں رک سی گئیں ہیں۔بیچارگی اور بے اختیاری کے عالم میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ نکلے۔دور کہیں ہاتھوں سے بینر چھوٹ کر گرا تھا اور اُسے تلاشنے کے لیے ادھر ادھر غمناک نظریں دوڑائیں۔ڈھونڈتے ڈھونڈتے کیچڑ میں اٹے ہوئے اخبار کے تراشے اور ٹوٹے پھوٹے ادھ گیلے بینر...ہاتھ لگے۔

جن پر گم شدہ مدفون نوجوانوں کی تصویریں چسپاں تھیں جو بھاگم بھاگ میں لوگوں کے ہاتھوں سے گر کر سڑک پر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔اچانک اس کی نگاہ کچھ دور فاصلے پر اس جگہ ٹھہر گئی جہاں سڑک پر ایک بینر کیچڑ سے لت پت پڑا تھا۔پھر جونہی وہ آگے بڑھی اور اس بینر کو اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے کر دیا۔اسی لمحہ وہ بینر کسی بھاری بھرکم بوٹ تلے آ گیا۔

بینر پر جو تصویر چسپاں تھی اب اس پر پڑے بوٹ کے تلوے کے نشانات اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور چیخ چیخ کر ناکردہ گناہوں کی داستان سنا رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں اب بھی ان سینکڑوں نوجوانوں کی لاشیں آہ و بکا کر رہی ہیں جنہیں تڑپا تڑپا کر جیلوں میں موت کی نیند سلا دیا گیا تھا اور پھر نامعلوم جگہوں پر بے نام و نشان دفنا کر نابود کر دیا گیا تھا۔تبھی تو آج تک ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا پاتا تھا۔

پھر جونہی نوری اٹھ کر کھڑی ہوئی تو سامنے ایک سپاہی کو خشمناک نظروں سے گھورتے ہوئے کھڑا پایا۔اس کی آنکھوں سے سفاکی برس رہی تھی اور ہاتھوں میں رکھی ہتھکڑی اس کی بے رحمانہ رویہ اور جبر و ستم کی داستان بیان کر رہی تھی۔یہ دیکھ کر وہ زہر کا گھونٹ پی گئی اور زیر لب مسکرانے لگی اُسے لگا جیسے ایک سزا کے بعد اب دوسری سزا دی جانے والی ہو۔۔۔!!!

’’سمے کی کہانی‘‘

نگہت یاسمین
(اٹک)

بنگال کا کالا جادو مشہور ہے۔

مگر پتہ نہیں انیسہ بیگم پہ کونسا جادو چل گیا تھا کہ وہ اس سانولی سلونی تیکھے سے نقوش والی لڑکی پر سو جان سے مرتی تھیں۔ کالج ہال میں جگمگ کرتے سٹیج پر ایک ورائٹی پروگرام میں بنگالی لڑکی کا رول کرتے ہوئے انہوں نے اُسے دیکھا تھا۔ قدرے سنولائٹ لئے ہوئے گالوں پر پھوٹتی شفق، بھرے بھرے عنابی ہونٹ کاجل بھری آنکھیں اور کمر پہ لہراتے ریشمی بال اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پروگرام ختم ہو اور وہ اڑ کے اُس کے پاس جا پہنچیں۔

پردہ گرتے ہی وہ جھٹ سے اپنی جگہ سے اُٹھیں مگر بھیڑ میں سے راستہ بناتے، پوچھتے پوچھاتے میں اتنی دیر ہوگئی کہ وہ لڑکی سے تو نہ مل سکیں بس لڑکی کا نام معلوم ہوسکا۔

نغمانہ۔۔۔نغمانہ۔۔۔نغمانہ وہ دل ہی دل میں دہراتیں بے قرار سے پھرتی رہیں۔ آخر مسز بیگ کی وساطت سے انہوں نے اس کے گھر کا پتہ چلا ہی لیا۔ مگر انیسہ بیگم! کیا دلچسپی ہے آپ کو اس لڑکی سے۔۔۔بے چارے غریب سے لوگ ہیں باپ کلرک ہے۔۔۔نئی آبادی میں چھوٹا سا گھر ہے۔ ویسے رشتہ تو اپنے ہی جیسے خاندان میں کرنا چاہیے۔

اسد نے سنا تو منہ بسور کے بیٹھ گیا۔ امّاں آپ تو ہمیشہ گوری، چٹی چاند سی دلہن لانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں اور یہ بھی کہ ایسے گھر کی بیٹی کو دلہن بنا کے لاؤ نگی جو لاکھوں کا جہیز لائے۔۔۔جن کا وسیع شاندار بنگلہ ہو۔۔۔پورچ میں دو تین نئے ماڈل کی گاڑیاں کھڑی ہوں اور اب۔۔۔

تم کیا جانو۔۔۔سلونے پن کا ایک اپنا حُسن ہوتا ہے رہی ماحول اور سٹیٹس کی بات تو ہمارے گھر میں آئے گی تو خود بخود اسی رنگ میں ڈھل جائے گی۔ جیسے تیسے انیسہ بیگم نے اسد کو رام کر ہی لیا۔

مین روڈ سے اتر کر گاڑی نشیبی علاقے میں واقع نئی آبادی کی طرف مڑ گئی تھی۔ ذرا آگے تنگ گلیوں میں کچے پکے نئے پرانے مکانوں کا اک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔

بس! بس! اسد گاڑی یہیں روک دو۔ اسد نے حیرت سے ماں کو دیکھا مگر وہ گاڑی سے اتر کر کیچڑ بھری نالیوں، پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیوں سے بمشکل گزرتی ریشمی دوپٹہ سنبھالتی بڑا سا پرس لہراتی اس گھر میں یوں داخل ہوئیں جیسے کوئی فاتح اپنے مفتوح علاقے میں داخل ہوتا ہے۔

دروازے پر ٹاٹ کا بوسیدہ سا پردہ لٹکا ہوا تھا پر انہیں اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی کہ گھر کیسا ہے۔۔۔؟ گھر کے مکین کیسے ہیں اور بیٹھک کے نام پر جس کمرے میں انہیں بٹھایا گیا ہے اس میں گھسی پٹی دری کے اوپر پرانے سے صوفے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔ لڑکی کی ماں ہکا بکا سہمی سہمی نظروں سے ان کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ پھر اس کی دبی دبی سی آواز کمرے میں گونجی۔

بیگم صاحبہ! ہم غریب لوگ ہیں۔ آپ اپنے ہی جیسوں میں رشتہ کریں تو مناسب ہے۔ چھوڑیں بہن! یہ روایتی باتیں۔۔۔مجھے لڑکی پسند ہے لڑکا راضی ہے۔۔۔بلائیں لڑکی کو۔۔۔لڑکی آئی سر پہ دوپٹہ اوڑھے۔۔۔دیسی شیشے کے گلاسوں میں ہلکے گلابی رنگ کا شربت چھلکاتی۔۔۔شرماتی لجاتی۔

’’یہی تو میں چاہتی تھی۔۔۔لڑکی حیادار ہونی چاہیے۔۔۔‘‘ انیسہ بیگم نے نٹ بیٹے کے کان میں سرگوشی کی۔

انیسہ بیگم نے پیار سے اُسے گلے لگایا۔ ہاتھ میں پانچ ہزار کا کھڑکتا نوٹ رکھا اور بولیں۔۔۔بس آج سے نغمانہ ہماری بیٹی ہے اور پھر دو ہفتوں کے اندر اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق دلہن بنا کر اُسے گھر لے آئیں۔

انیسہ بیگم خوشی سے لال گلال بنی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے تین تین تولے کے طلائی کڑے دلہن کو پہنائے۔ منہ میں کھوئے کی مٹھائی رکھی اور خوشی سے کھلکھلاتی دلہن کے چاؤ کرتی رہیں۔

شروع شروع میں وہ ایسی ہی دکھتی تھی جیسے عام طور پر دلہنیں ہوتی ہیں شرمائی شرمائی، سجی سنوری۔ انیسہ بیگم کے مشورے سے روزانہ لباس بدلتی۔ صبح بیدار ہوتے ہی انہیں سلام کرتی۔ انیسہ بیگم اس کی ان اداؤں پر نہال ہو ہو جاتیں۔ ہفتہ بھر خیریت سے گزرا پھر تو اس نے ایسا پینترا بدلا جیسے اس نے پرانی کینچلی اتار پھینکی ہو۔

ایسی ہوشیار۔۔۔تیز طرار۔۔۔پٹ پٹ بولنے والی۔۔۔انیسہ بیگم سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ یہی وہ بھولی بھالی سادہ لڑکی ہے۔ شرمیلی مسکراہٹ والی اور اب اس کے اندر سے کسی خرانٹ، مکّار سی عورت نمودار ہوگئی ہے۔

جب بھی انہیں کچن میں کام کرتے دیکھتی فوراً ٹوک دیتی۔

امّاں! آپ بزرگ ہیں آپ کے آرام کے دن ہیں اب یہ ہمارا کام ہے۔ انیسہ بیگم جل بھن کر رہ جاتیں۔ بدمزہ کھانے کھا کھا کر تو ان کی بھوک ہی اڑ گئی تھی۔

اسد بھی اب برائے نام ان سے بات کرتا۔ گھر آتے ہی اپنے کمرے میں مقید ہو جاتا اور انیسہ بیگم تنہا یادوں کے سمندر میں گُم۔۔۔انہوں نے سوچا تھا کہ بہو آئے گی تو گھر میں رونق ہوگی مگر اُس نے تو انہیں یوں الگ کر کے رکھ دیا تھا جیسے دودھ میں سے مکھی۔۔۔

دو سالوں میں دو اور سانولی سلونیاں آ گئی تھیں۔ انیسہ بیگم انہیں پیار کرتی انہیں گود میں بٹھا کر ان سے باتیں کرتیں۔ مگر اسے کب یہ گوارا تھا وہ تو

دونوں بچیوں کو ان کی ہوا تک نہ لگنے دیتی۔

جب بھی وہ دادو۔۔۔دادو پکارتیں ان کے پاس آ کے بیٹھتیں فوراً لپک کے آتی۔ ایک کا کان مڑورتی دوسری کا بازو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی کمرے میں لے جاتی۔ کیا کرتی ہو وہاں۔۔۔؟

ماما! دادو ہمیں بہت پیار کرتی ہیں چاکلیٹ اور ٹافیاں دیتی ہیں مزے کی۔ مت کھایا کرو یہ میٹھی چیزیں۔ پھر اسد سے مخاطب ہو کر کہتی۔

ہزار بار منع کیا ہے اماں کو۔۔۔مت دیا کریں انہیں ایسی ویسی چیزیں۔۔۔ پر انہیں کیا۔۔۔ مصیبت تو مجھے پڑتی ہے۔۔۔ پتہ ہے پچھلے سال سونی کا سر کتنا پک گیا تھا۔ درد سے کس طرح بلبلاتی تھی۔ ساری ساری رات مجھے جگائے رکھتی۔ مگر اماں کب سنتی ہیں کسی کی۔۔۔

اور دیکھو اس عمر میں بھی ہر ہفتے کلب جانے کا جنون سوار ہے۔ کیسے رنگ برنگی ساڑھیاں باندھے پرس جھلاتی جاتی ہیں۔ لوگوں کی ساسیں دیکھی ہیں مصلیٰ بچھائے نفل نمازیں پڑھتی رہتی ہیں۔

اسد بے چارا چپ رہتا۔ ذرا بھی بولتا تو اس کی زبان شعلے برسانے لگتی۔ شام کو دونوں سیر کے لیے نکل جاتے۔ بس اتنا کرتی جاتے جاتے بتانے آ جاتی۔

اماں! ہم واک کے لیے جا رہے ہیں گھنٹہ بھر تک واپس آ جائیں گے۔ مگر راستے میں ماں کے گھر چلی جاتی۔ رات گئے دونوں واپس آتے اور وہ ان کے انتظار میں تنہا سوکھتی رہتی۔

وہ سوچتی۔۔۔اتنی تنہا تو وہ اس وقت بھی نہیں تھیں جب اُن کا شوہر انہیں چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اس وقت بھی نہیں جب فہد ہائر ایجوکیشن کے سلسلے میں امریکہ گیا تھا۔ تب بھی انہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا تھا جب وہ کالج سے ریٹائر ہوئی تھیں انہوں نے کلب جوائن کر لیا تھا اور اپنے اوپر مصروفیت کا حصار تان لیا تھا۔

فہد امریکہ سے انجینئرنگ کی ٹریننگ لے کر آ گیا تھا۔ چار سال تک ان کی نگاہیں اسے دیکھنے کو ترستی رہیں مگر بہو نے اس پر جانے کیا ڈورے ڈالے کہ وہ آتے ہی اس کا دیوانہ ہو گیا۔ ہر وقت بھابھی، بھابھی کی رٹ لگائے اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا۔

بھابھی! میرے لیے بھی اپنے ہی جیسی سلم اینڈ سمارٹ کیوٹ سی لڑکی تلاش کرنی ہے۔

بے فکر رہو فہد! یہ میری ذمہ داری ہے۔

وہ تو پہلے ہی اس بات کی منتظر تھی فوراً ہی اپنی چھوٹی بہن ثمرانہ کو پیش کر دیا۔ فہد نے دیکھتے ہی اُسے پسند کر لیا اور وہ بھی اس گھر کی بہو بن کر آ گئی۔

دونوں بہنیں سارا دن کمرے میں جانے کیا کھسر پھسر کرتی رہتیں اور انیسہ بیگم اکیلی بیٹھی کڑھتی رہتیں۔

اُس روز کلب میں سالانہ فنکشن تھا وہ تیار بیٹھی تھیں مگر بیٹے سے کہتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔ جیسے ہی انہوں نے کہا بیٹے! مجھے ذرا کلب ڈراپ کر دو وہ تنک کر بولا۔۔۔

اماں! آپ کو بھی گھر میں چین نہیں۔ دیکھتی نہیں میری طبیعت خراب ہے۔ گاڑی کون ڈرائیو کرے گا۔

انیسہ بیگم نے اپنی کولیگ کو فون کر کے گاڑی منگوالی مگر ان کا دل اندر ہی اندر روتا رہا۔ فنکشن اٹینڈ کر کے گھر آئیں دیکھا صحن میں سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔

اوہ! یہ تو میرے کمرے کا سامان ہے۔ وہ ٹھٹھک کر وہیں رُک گئیں۔ بہو دوڑی ہوئی آئی۔۔۔اماں جی! ادھر آئیں اس کمرے میں۔۔۔وہ کمرا میں نے بچیوں کے لیے سیٹ کیا ہے۔ ماشاءاللہ! دونوں بڑی ہو گئی ہیں نا۔ انہیں اب الگ کمرے میں سونا چاہیے۔

کونسا کمرا۔۔۔؟ انیسہ بیگم کا پریشانی کے مارے بُرا حال تھا۔

وہ کچن کے ساتھ ہے نا سٹور، وہ میں نے خالی کروایا ہے۔

یہ بیڈ۔۔۔ڈریسنگ ٹیبل۔۔۔الماریاں۔۔۔کیسے آئیگا۔ یہ سارا سامان اس چھوٹے سے کمرے میں۔

آئے گا کیسے نہیں۔۔۔ابھی لگاتی ہوں یہ سامان۔۔۔ پھر دونوں بہنوں نے گھسیٹ گھسیٹ کر یہ سارا سامان اس چھوٹے کمرے میں گھسیڑ دیا۔

صبح ہی صبح ویلفیئر سنٹر کی گاڑی ان کے گھر کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ انیسہ بیگم سوچ رہی تھیں شادی سے پہلے لڑکی کے لیے اس کے ماں باپ کا گھر ہوتا ہے جس میں وہ عیش کرتی ہے مگر ڈولی میں بیٹھتے ہی وہی گھر جس سے اس کے بچپن اور جوانی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں پل بھر میں پرایا ہو جاتا ہے۔

شادی کے بعد دلہن بن کر شوہر کے گھر آتی ہے اپنی اس چھوٹی سی سلطنت کو جنت کا نمونہ بنانے کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اس پر نچھاور کر دیتی ہے مگر اولاد کی شادی ہوتے ہی یہ گھر بھی جسے وہ اپنا سمجھتی ہے یکدم اجنبی ہو جاتا ہے۔

"پاکستانی عورت ساری عمر پوتے پوتیوں کو کھلانے کے خواب دیکھتی رہتی ہے ان کی میٹھی میٹھی باتوں سے دل کو بہلاتی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ ایک سراب ہے۔۔۔دھوکا ہے۔۔۔وہ جو بہو کو چاؤ سے بیاہ کر لاتی ہے۔۔۔ بیٹے کے لیے خوشیاں خریدتی ہے مگر وہ عورت آتے ہی اس سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے اور بلا شرکت غیرے اس کی ملکیت حاصل کرنے کے منصوبے سوچنے لگتی ہے۔"

انیسہ بیگم بیگ تھامے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ان کے دونوں بہویں، بیٹے، پوتیاں سب ان کے گرد کھڑے تھے۔ انہوں نے سب کو پیار سے تھپکی دی۔ پوتیوں کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔

باقی صفحہ ۱۰۶ پر ملاحظہ کیجیے

''پتھر کے شہر میں''

غالب عرفان

(کراچی)

کرتے ہوئے وہ گفتگو ٹھہرا تو راز ہو گیا
چھوٹی سی بات تھی مگر قصہ دراز ہو گیا

پتھر کے شہر میں گیا اپنے لہو میں تر بہ تر
چلتے ہوئے وہ کرچیاں آئینہ ساز ہو گیا

اپنی اَنا کے خول سے نکلا تو یوں نکل پڑا
سارا وجود ہی کہیں محو نیاز ہو گیا

گرد و غبار بن گیا محمود کا وجود جب
عشقِ آئینہ ساز بھی مثل ایاز ہو گیا

دشتِ فراز میں جو ایک بھٹکا ہوا ہیُولہ تھا
گرتے ہوئے نشیب میں راز و نیاز ہو گیا

اپنی روایتیں لیے تھا جو سخنوری میں طاق
اک دن جدید کیا ہوا جدت طراز ہو گیا

عرفانِ فکر کی اُڑان ہو کہ نظریہ زیست کا
میرے لیے تو ہر سفر باعثِ ناز ہو گیا

○

محمود الحسن

(راولپنڈی)

حُسنِ چمن نہ جلوہِ جاناں تلاش کر
خود اپنے نورِ جاں کو مری جاں تلاش کر

میں نے کہا کہ کوئی علاجِ ہجوم غم
اُس نے کہا کہ دیدہِ گریاں تلاش کر

میں نے کہا کہ دولتِ کونین چاہیے
اُس نے کہا کہ گوہرِ ایماں تلاش کر

میں نے کہا کہ درپئے آزار ہے جہاں
اُس نے کہا کہ کوچۂ جاناں تلاش کر

میں نے کہا کہ رفعتِ افلاک چاہیے
اُس نے کہا کہ عظمتِ انساں تلاش کر

میں نے کہا کہ آبلہ پائی کا کیا علاج
اُس نے کہا کہ خارِ مغیلاں تلاش کر

میں نے کہا کہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں تجھے
اُس نے کہا کہ نزدِ رگِ جاں تلاش کر

یا اُس بہارِ حُسن کا ہرگز نہ کر گلہ
یا پھر علاجِ تنگیِ داماں تلاش کر

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

سجن سجیلے باغ میں، ہوا ہے کیسا میل
میرے سوکھے جسم سے، لپٹی پیار کی بیل

یاد رہیں گے ماہیے، یاد رہے گا یار
مل کے چمن میں کھیلنا، آنکھ مچولی کھیل

دور بسے اس شہر سے، کیسے ملو گے یار
دیکھوں کھڑکی کھول کر، آتی جاتی ریل

رقص ہے تیرے میل کا، محفل پر ہے رنگ
ڈالوں موتی آنکھ سے، پیا ملن کی بیل

جانے لگی ہے روشنی، میں ہوں بہت ناچار
بجھتے دیئے کے واسطے، لاؤں کہاں سے تیل

لکھنے والے دیکھنا، مشکل ہے یہ کام
بچے کا یہ شاعری، کھیل نہیں مت کھیل

چلنا گاڑی والیا، دیکھ کے دھند غبار
کچی سڑک ہے گاؤں کی، ہلکے گاڑی ٹھیل

ثاقبؔ ہم تو عشق میں، کتنے ہوئے بے حال
کیسے ہجرِ یار کے، درد لینے ہیں جھیل

○

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

جو لمحہ لمحہ اُتارتا ہے عذاب مجھ میں
وہ لانے والا ہے جلد ہی انقلاب مجھ میں

ہوائے مسموم چل رہی ہے مگر ابھی تک
مہک رہے ہیں رفاقتوں کے گلاب مجھ میں

چمک رہے ہیں تمام الفاظ جگنوؤں سے
کھلی ہوئی ہے غم و الم کی کتاب مجھ میں

جسے بھی دیکھو وہ میرے باطن کو پڑھ رہا ہے
کسے بتاؤں نہیں ہے کوئی سراب مجھ میں

وہ جس کے چنگل سے چھوٹ جانے کا منتظر ہوں
سسک رہا ہے ابھی وہ عزّت مآب مجھ میں

زمانے والو! دعا کرو ساقی ازل سے
انڈیل دے وہ رفاقتوں کی شراب مجھ میں

سماعتوں کو جلا رہے ہیں جو لفظ اخترؔ
ہوا ہے زیرِ تکلّم اب کامیاب مجھ میں

○

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ، بھارت)

دھو گئی چہروں سے گرد یاس کا غازہ ، ہوا
کر گئی افسردہ روحوں کو ترو تازہ ، ہوا

لاکھ بیٹھو چھپ کے اپنے بند کمروں میں، مگر
توڑ کر آ جائے گی ایک ایک دروازہ، ہوا

صبح آنچل کی ہوا دے کر کھلاتی ہے جسے
شب کو بکھراتی ہے خود اُس گل کا شیرازہ، ہوا

ناپنے نکلی ہے شہرِ دل کی وسعت کو ، مگر
کیا لگا پائے گی میرے غم کا اندازہ، ہوا

بھر چلے تھے زخم جو، پھر سے لگے منہ کھولنے
کچھ پرانے درد لے کر آئی ہے تازہ ہوا

جی ترستا ہے پھر اُن لمحوں کو جب تھے سب بہم
رقص ہے، بوئے سَمَن ، رنگِ شفق، تازہ ہوا

ہم تو اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کر چکے
دیکھ جا کر اب تُو کوئی اور دروازہ، ہوا!

وہ لطافت، وہ مہک کیوں چاندؔ! یکسر کھو گئی؟
بھر رہی ہے کِن خطاؤں کا یہ خمیازہ ، ہوا؟

○

ڈاکٹر سید قاسم جلال

(بہاولپور)

چمن سے تو بہاروں کی گُل افشانی نہیں جاتی
ملے کیا جب ہماری تنگ دامانی نہیں جاتی

نہ جانے روح کیوں خوشیوں کی محفل میں ہے افسردہ
ہے گھر آباد، لیکن دل کی ویرانی نہیں جاتی

شکوک اکثر حقائق تک پہنچنے ہی نہیں دیتے
اندھیرا ہو تو کوئی شکل پہچانی نہیں جاتی

مسائل حل تو ہوتے ہیں مگر آہستہ آہستہ
جو مشکل آ پڑے سر پر، بآسانی نہیں جاتی

ہمیشہ آیۂ لَا تَقْنَطُوْ کا ورد جاری رکھ
اگر توبہ کے بعد اے دل! پشیمانی نہیں جاتی

وہ کر سکتا ہے عرفانِ خدا کا کسی طرح دعویٰ؟
خود اپنی ذات جس انساں سے پہچانی نہیں جاتی

مجھے غم جب بھی تڑپاتا ہے ، اکثر صبر کرتا ہوں
مگر دل سے نہ جانے کیوں پریشانی نہیں جاتی

شہید ایسا ہے انساں مر کے بھی رہتا ہے جو زندہ
یہ سورج ڈوب بھی جائے تو تابانی نہیں جاتی

○

ڈاکٹر رؤف خیر

(حیدرآباد، دکن)

لائے جو مومنین پہ ایمان پھنس گئے
حی علی الفلاح و فرزان پھنس گئے[1]

ہشیار ہوشیاری سے اپنی بچے رہے
دامِ محافظین میں نادان پھنس گئے

اس عشق نامراد نے مٹی پلید کی
دامن بچا تو جیب و گریبان پھنس گئے

ملکِ سبا سے تخت منگانا پڑا انہیں
ہُد ہُد کی بات سُن کے سلیمان پھنس گئے

سب جاں نثار جان بچا کر نکل لیے
بالکل اکیلے پڑ گئے سلطان پھنس گئے

انساں کا خوں بہا کے بھی موڑی ہیں سرخ رو
کالے ہرن کو مار کے سلمان پھنس گئے

مجروؔح کو غزل نے گلے سے لگا لیا
نظموں کے بیچ اختر الایمان پھنس گئے

تھا ہر ورق پہ صنعتِ اغلاط کا کمال
دیوان دے کے صاحبِ دیوان پھنس گئے

ان کی مدد تو فتویٔ مفتی نے خوب کی
جو درمیانِ سنّت و قرآن پھنس گئے

کھیلا شکار شیخ نے داڑھی کی آڑ میں
بیٹھے بٹھائے خیؔر شریمان پھنس گئے

○

کرامت بخاری

(لاہور)

کسی گھر کو جلا دینے سے پہلے
ذرا سوچو ہوا دینے سے پہلے

ہر اک فرعون کو ملتی ہے مہلت
کلیمی کو عصا دینے سے پہلے

کوئی جھوٹی گواہی بھی نہیں تھی
مرے سچ کو سزا دینے سے پہلے

یہ جنگل بے تحاشا جاگتا تھا
پرندوں کو اُڑا دینے سے پہلے

بڑی تعداد میں تھا میرا لشکر
دیا گھر کا بجھا دینے سے پہلے

سُنا ہے اُس کی آنکھوں میں تھے آنسو
مرے خط کو جلا دینے سے پہلے

اُسی کو یاد کرتا ہوں کرامتؔ
اُسے یکسر بھلا دینے سے پہلے

○

[1] مسلمانوں کی دو کمپنیاں جو مسلمانوں کا پیسہ لوٹ کر اچانک منظر نامے سے غائب ہوگئیں۔

نذیرفتح پوری

(بھارت)

اندھیرے فکر و نظر کے مٹانے پڑتے ہیں
مرے چراغ مجھی کو جلانے پڑتے ہیں

کوئی بھی معرکہ بس یونہی سر نہیں ہوتا
ہر اک محاذ پہ جوہر دکھانے پڑتے ہیں

یہ وادیوں کی مسافت یونہی نہیں کٹتی
اندھیری رات میں جگنو جلانے پڑتے ہیں

مسرتوں کے خزانوں کو ڈھونڈنے کے لیے
غموں کے کتنے ہی پربت اٹھانے پڑتے ہیں

سخن کی کھیتیاں ہوتی نہیں یونہی شاداب
نذیر درد کے دریا بہانے پڑتے ہیں

گل بخشالوی

(کھاریاں)

دعاؤں میں بھی اثر نہیں قبول رب کو نہ بندگی ہے
سزا ہے شاید کسی خطا کی مرے وطن میں جو بے حسی ہے

بھرے ہیں دولت سے بینک اُن کے لہو غریبوں کا پی رہے ہیں
جو کہہ رہے ہیں ہمارا مقصد، غریب لوگوں کی بہتری ہے

یہ بم دھماکے جو کر رہے ہیں، نہیں یہ مومن کی شان ہرگز
نہیں ہے مذہب میں یہ شہادت حرام اُن کی یہ خودکشی ہے

وطن میں غیروں کے بیٹھ کر وہ وطن کی باتیں جو کر رہے ہیں
نہیں ہے مخلص وہ گل وطن سے وطن سے اُن کی یہ دشمنی ہے

بڑھا رہے ہیں یہ اپنی دولت، کوئی بھی ان میں نہیں ہے مخلص
ہیں رہنما جو وطن کے اُن کی، وطن کے دشمن سے دوستی ہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

بیان سے کبھی پیمان سے نکل گیا ہے
امیرِ شہر بھی ایوان سے نکل گیا ہے

اُڑے ہیں ہوش بھی، اوسان بھی خطا ہوئے ہیں
نہ جانے کیا مرے سامان سے نکل گیا ہے

دکھائی دیتا ہے کیوں سیڑھیاں اُترتا ہوا؟
اگر یہ سچ ہے، مرے دھیان سے نکل گیا ہے!

وہ، اپنے آپ سے لڑنے کہاں تلک جاتا!
شکست مان کے میدان سے نکل گیا ہے

رہائی پائی ہے ہمزاد کی اسیری سے
کوئی مکان کے بحران سے نکل گیا ہے

پروں سے باندھی گئی ہے اُڑان صدیوں کی
پرندہ بھی حدِ اِمکان سے نکل گیا ہے

اُسے گمان تھا! جانے سے روکا جائے گا
سو، پہلے شاہ کے فرمان سے نکل گیا ہے

ہم اہلِ عشق چلے ہیں سخن کماتے ہوئے
ہمارا کام بھی نقصان سے نکل گیا ہے!

نیام سے نکل آئی ہے تیغِ خون آشام
قلم بھی اپنا قلم دان سے نکل گیا ہے

○

روٹھی ہوئی بیوی کے نام خط

یونس خان
(فیصل آباد)

میں بہت دنوں بعد گھر واپس آیا تھا میری اب اس گھر میں قبولیت کی گنجائش موجود نہ تھی۔ میری بیوی الفت کے جزبات کی منہ زور آندھیوں کے آگے یہ گھروندا مسلسل لرز رہا تھا۔ کسی بھی وقت یہ گھروندا تنکا تنکا ہوا چاہتا تھا۔ مجھے ریٹائر ہوئے دس سال ہو گئے تھے وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ نے مجھے گھر بٹھا دیا تھا اور میرا گھر بیٹھنا اسے کسی صورت قابل قبول نہیں تھا اسے لگتا تھا کہ میں اس کی زندگی میں کچھ زیادہ ہی دخیل ہو گیا ہوں جو اسے پسند نہ تھا۔

اس کا لاابالی پن ابھی ختم نہیں ہوا تھا اسے لگتا تھا کہ میں اس کی شخصی آزادی میں حائل ہو رہا ہوں وہ تنہائی پسند تھی اب ہر وقت اسے مجھے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ یہیں سے نفرت کی وہ چنگاری پھوٹی جو بڑھتے بڑھتے نفرت کا الاؤ بن گئی وہ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی گھر میں برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ اس کی زندگی کے تمامتر ڈیپریشن اور تمام تر کمیاں غصے میں ڈھل رہیں تھیں اور یہ تمام تر غصہ میرے اوپر اتر رہا تھا۔ وحشت کا جن پوری شدت کے ساتھ ننگا ناچ رہا تھا اور اس وحشت کے جن کو میرے اپنے بھی نادانی میں پال پوس رہے تھے وہ اپنا تمام تر ڈیپریشن مسلسل اس کی جھولی میں ڈال رہے تھے اور اس طرح وہ مزید ڈیپریشن میں جا رہی تھی۔ ہم بچوں کی شادیوں کا انتظار کر رہے تھے بیٹی اگرچہ سب سے چھوٹی تھی ابھی وہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو ہم نے اسے جلدی جلدی بیاہ دیا۔ بیٹا ہونہار تھا وہ اپنی منزلیں ایک اُڑن کھٹولے کی طرح ٹاپ رہا تھا وہ دن بدن بلندی کی طرف گامزن تھا اور ہم روز بروز پستی میں گر رہے تھے۔ ہماری روز روز کی چخ چخ نے اسے وقت سے پہلے ایک ذمہ دار انسان بنا دیا تھا وہ مسلسل ہمارے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کھچ کھچ کی وجہ سے میرے ساس اور سسر بھی بہت زیادہ پریشان رہنے لگے۔ میرے سسر ایک بہت محبت کرنے والے حساس انسان ہیں وہ میرے چچا ہیں اگرچہ وہ میرے والد کے سگے بھائی نہیں ہیں لیکن ان کے درمیان محبت کا رشتہ سگے بھائیوں سے بھی زیادہ مضبوط تھا یہ اسی محبت کی مغلوبیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی لاابالی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیا کہ وہ ان ہاتھوں سے زیادہ کسی اور ہاتھ کو بہت زیادہ مضبوط نہیں پاتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شدید محبت کرتا تھا اور یہ ہماری چچا بھتیجا کی محبت کی انتہا تھی کی انہوں نے اپنی سب سے لاڈلی بیٹی کا ہاتھ تمام تر مخالفت کے باوجود میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہیں لگتا تھا کہ ان کی بیٹی کو میں سنبھال سکتا ہوں۔ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں زندگی کی دوڑ میں بہت زیادہ محنت کرنے کی وجہ سے وہ اگنور ہوتی چلی گئی۔ ہمارے درمیان ایک مناسب رشتہ موجود تھا بچوں کی پیدائش نے اسے کافی حد تک ایک مضبوط سہارا دیا تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کی عادی تھی اس کے فیصلے جزبات پر مبنی ہوتے جب کہ میں سوچ بچار کے بعد فیصلے کرنے کا عادی تھا اور ہمارے یہی رویے ہمارے درمیان ایک خلیج پیدا کرنے کا باعث بن رہے تھے اولاد بڑی ہو رہی تھی اور ہم اپنے بچوں کی شدید محبت میں مبتلا ہو رہے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ بچے خاص طور پر بڑا بیٹا ہمارے درمیان پل بنے گا جب کہ اسے لگتا تھا کہ یہ وہ نیا ہے کہ جس پر سوار ہو کر وہ میرے سے بہت دور کہیں انجانے سمندروں میں چلی جائے گی۔ بیٹا کامیابیوں کی منزلیں مارتا دن بدن اونچی سے اونچی ہواؤں میں جا رہا تھا۔ اب اس کی شادی کی عمر آ گئی تھی ہمیں اس کی شادی کا انتظار تھا مجھے اس لئے کہ ایک محبت کرنے والی بہو ہماری زندگیوں میں رنگ بھر دے گی اور اس طرح الفت کی زندگی کے جو گھاؤ ہیں ان کو بھرنے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ جب بہو بیٹی بن کر آئے گی تو وہ زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ وہ اپنا موقف زیادہ مضبوطی سے پیش کرنے کی اہل ہو جائے گی اور وہ اپنی محبت سے اپنی بہو کو اپنا گرویدہ کر لے گی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بہو بھی اگرچہ ایک بہت حساس لیکن ذہین لڑکی ہے۔ اس نے بھی چھوٹی عمر میں کامیابی کی بہت ساری منزلیں ماری تھیں لیکن جب رشتہ کی بات چل رہی تھی اس کے گھر والے ہمارے سامنے اس کی کمیوں کو سامنے لاتے اور اس کی کامیابیوں کو اگنور کر دیتے۔ وہ یہ کہتے کہ ان کی بیٹی گھرداری نہیں جانتی وہ کچن نہیں جانتی اور دبی سی آواز میں کہتے کہ وہ کام کرتی ہے۔ دِنوں میں شادی کے معاملات طے ہوئے اور ہم نے بیٹے کی شادی فاطمہ سے کر دی۔ آندھیوں کے جھکڑ اتنے تیز تھے کہ بیٹے کی شادی کے فوراً بعد مَیں حیدرآباد میں اپنے والدین کے پاس جا بیٹھا۔ میں کامیابیوں کی قیمت ادا کر رہا تھا ٹوٹے رشتے اور خراب صحت۔ ہم پچھلے پچیس سال سے والدین سے الگ رہ رہے تھے سروس کے سلسلہ میں دوسرے شہروں میں بھی رہنا ہوا۔ ہم والدین کی طرف سال میں دو چار مرتبہ ہی آپاتے تھے جب کہ کبھی کبھار میرا اکیلے کا چکر بھی لگ جاتا۔ اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ میرا ایک بھائی جوان کے ساتھ رہتا تھا اس کے بچے بھی بڑے ہو رہے تھے وہ بھی والدین سے علیحدہ ہو گیا اور اپنے گھر میں شفٹ ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر والدین تنہا ہو گئے تھے اب میرے اسّی سالہ والد اور پچھتر سالہ والدہ بھی بیماریوں اور بڑھاپے کا شکار ہو رہے تھے۔ مجھے علاج درکار تھا مجھے خاص کیئر کی ضرورت تھی جو میرے والدین کے پاس زیادہ بہتر طریقے سے ہو رہی تھی۔ ایک مہینے بعد جب میں گھر واپس آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پورا ڈیسک ٹرافیوں سے بھرا پڑا ہے یہ تمام ٹرافیاں فاطمہ کی تھیں وہ پاکستان کی ایک مایہ ناز موٹیویشنل سپیکر تھی جس کی ہمیں خبر نہیں تھی۔ اس کے والدین نے اس کی کامیابیوں کو ہمارے سے چھپایا تھا صرف اس کی کمیاں کمزوریاں ہمارے سامنے رکھیں تھیں اور یہی وجہ تھی کہ فاطمہ بھی ہمارے ساتھ بہت زیادہ محبت میں مبتلا ہو گئی۔ ہم بھی محبت کی کمی کا شکار تھے وہ ہمیں بھی سگی بیٹیوں سے زیادہ عزیز ہو گئی۔

بیگم بھی اس سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگی اوراس شدید محبت کی وجہ سے وہ اسے اپنا اثاثہ سمجھنے لگی اب اسے اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں فاطمہ سے بات کروں اور ہم باپ بیٹی میں اتنی گاڑھی چھنتی ہے کہ ہماری تمام تر دستیاب وقت میں باتیں ہی ختم نہ ہو پاتیں اور میری بیوی الفت سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا۔اب یہ فاطمہ سے بھی چھپا ہوا نہیں تھا کہ ہمارے درمیان تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ ہمارے بستر بہت عرصے سے الگ ہو چکے تھے ہم الگ الگ کمروں میں سوتے تھے۔ہم نے اپنے بستر اسی وقت الگ کر لئے تھے جب ہماری بیٹی بڑا ہونا شروع ہوئی تھی۔ہم الگ الگ کمروں میں سوتے تھے اب میرے بیٹے محمود کی شادی کے بعد ہمارے درمیان کسی بھی طرح کی ریلیشن شپ نہیں تھی۔شادی تک تو ایک بھرم موجود تھا اب وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔اس نے فاطمہ کو بھی اپنے ساتھ انوالو کرنا شروع کر دیا۔ان کی شادی کو سات ماہ ہو گئے تھے۔ میں مہینے ڈیڑھ مہینے بعد گھر واپس آتا اور ہفتہ دس دن رہ کر واپس چلا جاتا۔ میں رات کو ہی گھر واپس آیا تھا اگلے دن وہ آفس جانے سے پہلے میرے کمرے میں آئی اور مجھے ہاتھ سے پینٹ کیا ہوا ایک کارڈ دیا جس میں ایک لمبا چوڑا میسج تھا وہ کہہ رہی تھی "میرے پیارے بابا جان ہم آپ سے بہت محبت کرتے ہیں والدین تو اولاد سے محبت کرتے ہی ہیں اولاد کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے والدین کو اپنی محبت بڑھا چڑھا کر پیش کریں بابا ہم آپ کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ہمیں آپ کی صحت کی فکر بھی رہتی ہے۔" جب کہ مسز کو یہ بات ناگوار گزری کہ فاطمہ نے مجھے کچھ گفٹ کیا ہے اگر چہ وہ نہیں جانتی تھی کہ فاطمہ نے مجھے کیا گفٹ کیا ہے اس سے یہ برداشت نہیں ہوا۔اس نے گھر چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا وہ میری موجودگی میں گھر میں نہیں رہنا چاہتی تھی اس نے اپنے بھائی کو فون کیا کہ وہ اسے آ کر لے جائے بلکہ اب فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ اگر وہ اس گھر میں رہتی ہے تو میں اس گھر میں نہیں آؤں گا۔ وہ نفرت کی انتہا پر کھڑی تھی۔ اس کا بھائی ایک محبت کرنے والا انسان ہے ہمیشہ فائر بریگیڈ کی طرح جلتی پر پانی ڈالنے کے لئے فوری طور پر حاضر ہو جاتا ہے۔اب اس کے اعصاب بھی جواب دینے لگے ہیں۔ یہ اس کی ہمارے ساتھ محبتوں کا نتیجہ ہے کہ اس کے صبر کا پیمانہ ابھی تک لبریز نہیں ہوا۔ وہ رات کو گھر آیا مجھے ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملا۔اس وقت مجھے نہیں پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے میں اپنے وقت پر اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔صبح بار بار بیل ہوئی تو بستر سے باہر نکلا اور میں نے بالکنی سے جھانکا تو پتا چلا کہ کام والی آئی ہے۔ میں سمجھا کہ مسز شاید واش روم میں ہے۔لیکن چیک کرنے پر پتا چلا کہ وہ جا چکی ہے۔رات کو مجھے بتانے سے گریز کیا گیا۔شام میں میری بہو فاطمہ مجھے یہ کہہ رہی تھی بابا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے میں بہت پریشان ہوں۔آپ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بہت اچھے انسان ہیں۔ہمیں آپ دونوں سے محبت ہے۔ بابا جان آپ میں ایک کمی ہے کہ آپ اپنا ایکسپریس نہیں کر پا رہے کہ گیپ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔کچھ عرصہ پہلے میرے اندر ایک ہوک اٹھنا شروع ہوئی کہ جن لوگوں سے میں محبت کرتا ہوں ان سے فرداً فرداً بڑی شدت سے کہوں کہ " آئی لو یو" چند دن بعد ایک شادی کے سلسلہ میرا فیصل آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ میں فاطمہ کو بتا رہا تھا میں نانو کے گھر گیا میں نے نانو کے ہاتھ پکڑے اور ان کے گلے لگ گیا میں نے محبت سے ان کے گالوں سے گال لگائے اور انہیں کہا" آئی لو یو۔ " ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بڑی محبت سے میرے گال تھپکتے ہوئے کہنے لگیں " مجھے بھی تم سے بہت محبت ہے میرے بیٹے۔ " اس دوران نانا ابو کمرے میں داخل ہوئے ان کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ وہ تو میرے ساتھ غصہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے انہوں نے ہمیشہ اپنی بیٹی کو ہی سمجھایا اور اسے ہی غلط کہا اور یہی میری شامت کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ وہ اسے غلط کہتے تھے ان کی محبت میں کسی طریقے کی کمی کیا آنا تھی زندگی بھر کی محبتیں کب ایک ہی پل میں مسمار ہوتی ہیں۔آج ان کے چہرے پر غصہ تھا چال میں بھی لڑکھڑاہٹ تھی۔ میں ان کی طرف بڑھا ان کے ہاتھ تھامے اور ان ہاتھوں کو چوما اور بے ساختہ رونا شروع کر دیا۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔انہوں نے بے ساختہ مجھے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ہی لومی۔

فاطمہ کہنے لگی بابا میں انہیں باور کراؤں گی۔ آپ کے اندر خوف ہے، ڈر ہے کہ وہ یہ سب کچھ رَد کر دے گی۔آپ اس ڈر کو نکال دیں آپ میرے نام ایک خط لکھیں۔ میں نے اسے خط لکھنے کی حامی نہیں بھری۔

محبت کا ایک رشتہ پہلے ہی ختم ہو چکا ہے ہماری محبت کرنے والی ماں ایک سال پہلے ہی ملک عدم کو سدھار گئی ہیں۔ان کی چند دن بعد برسی ہے۔ہم زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں ہیں اگر محبت نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو زندگی میں رنگ بھرتی ہے۔ میں نے ایک پیپر پکڑا اور اس پر ایک فقرہ لکھا اور فاطمہ کے حوالے کر دیا۔اس پر لکھا تھا" آئی لو ہر "

Master piece of the year

میرے محلے میں ماسٹر عتیق صاحب رہتے ہیں، 44 سال کی عمر میں اُن کی شادی ہوئی۔ایک دن فرماتے ہیں کہ جب میں 23 سال کا تھا تو ڈائری میں 21 ایسی خوبیاں نوٹ کی جو میری مُتوقع بیوی میں ہونی چاہیے۔وقت گزرتا گیا لیکن ایسی بیوی نہ مِل سکی جس میں 21 خوبیاں ہوں، اور ماسٹر عتیق ہر سال ایک دو خوبیاں کاٹتے رہے کہ چلو یہ خوبیاں نہ بھی ہوں تو لڑکی قبول ہے۔ بالآخر 40 سال کے ہو گئے اور ڈائری میں صرف ایک خوبی لکھی رہ گئی۔

"عورت ہو"

معصومیت تھی۔ جب بھی وہ سرخ رنگ کا کرتے کے ساتھ ہلکا گولڈن رنگ کا چست پاجامہ پہن کر سیاہ زلفیں کھولتی تو وہ بار بار اُس کے سفید رخساروں کو چھوتی جس پر رب نواز اس کی آنکھوں میں ڈوب جانے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ بڑی بی بی یہ سب دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیتی تھی۔

بڑی بی بی نے اپنے گھر والے کے دوسرے بیاہ کے لیے ایک لڑکی پارو خود ہی ڈھونڈی تھی۔ رشتے اچھے گھرانوں سے بھی ملتے تھے لیکن وہ سب رب نواز کو نہیں بلکہ حویلی کے لیے آتے تھے۔ رشتہ طے کرنے والے پہلے ہی حویلی اپنی بیٹی کے نام کروانا چاہتے تھے لیکن رب نواز کو حویلی کے لیے وارث چاہیے تھا مگر یہ شرط کسی بھی صورت قبول نہ تھی، اس لیے رب نواز نے دوسری شادی کرنے سے انکار کر رہا تھا مگر اس انکار میں ایک درد چھپا تھا اور اس ٹیس کو وہ محسوس کرتی تھی اس لیے وہ معمولی گھر سے پارو کو خود بیاہ لائی تھی اور اس کے بدلے رب نواز کا درد اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔

وقت یونہی کروٹیں بدلتا رہا اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کب پارو چھوٹی بی بی بن گئی لیکن اب یہ نازک کلی رب نواز کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔ اب وہ منکوحہ تھی وہ جس طرح سے جی چاہے اُس کو رکھے۔ مگر ان سب کے باوجود ایک کمی تھی جسے وہ اکثر محسوس کرتی لیکن کبھی کسی سے نہ کہتی تھی اور اندر ہی اندر گھلتی رہتی تھی۔ شادی کے کچھ ہی دن بعد اس نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے عیش و عشرت ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ اس کے بھی اپنے کچھ خواہشات اور خواب ہیں جو اس نے جوان ہوتی ہوئی راتوں میں دیکھے تھے لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی اور یہ خواہشات ہمیشہ سے اس کو بے چین کیے رکھتی ہیں مگر ان احساسات کو وہ دل کے کسی کونے میں دبا دیتی تا کہ یہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکیں۔

اس دن جب رات کو رب نواز کمرے میں آیا تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر افسانوں کی کتاب کے صفحات ہوا کے شور سے اُلٹ پلٹ رہے تھے۔ لیمپ کی روشنی میں اس کا سراپا بے حد حسین لگ رہا تھا۔ بال اس کے سفید رخساروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اتنے میں رب نواز بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس پر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا خوبصورت ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے بولا۔ آج اتنی جلدی سونے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ اُس نے یونہی ہاں میں جواب دیا۔ وہ کچھ دیر اُسے تکتا رہا اور بعد میں سونے کا کہہ کر خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس بات کا اُسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ خفا ہو کر چلا گیا ہے۔

پارو بارش میں بھیگتی، ملازموں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی، لان میں کھلتے گلاب اور کلیوں سے باتیں کرتی، مالی کے ساتھ باغیچے میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتی، کتابوں کا مطالعہ کرتی اور رات گئے کھلی کھڑکی سے مسکراتے چاند سے چکوری کا حال پوچھتی، یہ سب اُس کو اچھا لگتا تھا۔ ابھی تو اُس کی عمر سپنے دیکھنے کی تھی جس میں وہ اپنی مرضی سے اِن خوابوں کو پورا کرے جو اُس نے کبھی دیکھے تھے مگر یہ ساری عادتیں رب نواز کو بالکل پسند نہیں تھیں۔

وہ اکثر اشاروں کنائیوں میں اُسے سمجھاتے تھے جس سے وہ اکثر سوچتی تھی کہ ان باتوں میں برائی ہی کیا ہے؟

اس جواب پر بڑے صاحب منہ بسورتے ہوئے کہتے تھے کہ حویلی میں رہنے کے کچھ اصول طریقے ہیں۔ جن پر ساری خواتین عمل کرتی ہیں تم بھی کوشش کرو خود کو بدلنے کی۔ اُن کی باتیں سن کر وہ اداس ہو جایا کرتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اُس دن وہ شام کو لان میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک سے جی متلانا شروع ہو گیا حالانکہ دوپہر کے کھانے میں صرف جوس کا ایک گلاس پیا تھا۔

پچھلے دو دن سے اِس کی طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی، اِدھر بڑی بی بی رات کو کمرے میں آئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ انھیں دیکھ کر وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھی۔ پارو کا پیار سے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی کیا بات ہے؟

بڑی اُداس لگ رہی ہو۔

نہیں کل سے دل گھبرا رہا ہے۔ میں نے تو متلی آنے کی وجہ سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ بڑی بی بی یہ سن کر مسکرانے لگی۔ اوہ یہ تو خوشخبری ہے جس کا ہم سب شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ پارو کی حیرت سے آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ طبیعت کی سازش اُسے سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

یہ خبر سنتے ہی وہ خوشی سے نہال ہو رہی تھیں اور پارو گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

حویلی میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ چھوٹی بی بی اُمید سے ہے۔ حویلی بہت بڑی تھی لیکن مبارک بادا تنی تھیں کہ ہر طرف خوشی سے قہقہے لگنے شروع ہو گئے۔ رب نواز کے پاؤں تو زمین پر نہیں ٹکتے تھے اور بڑی بی بی پارو کو زمین پر پاؤں نہ رکھنے دیتی مگر لوگ زیادہ مبارکیں بڑی بی بی کو دیتے جن کی بدولت اتنی بڑی خوشی حویلی کو دیکھنے کے لیے ملی۔

’’میں نے پیدا ہوتے ہی جھولی میں لے لینا ہے، بعد میں نہ کہنا۔ میں بڑی ہوں اور تم چھوٹی اس لیے پہلا بیٹا بڑی کا۔ بعد میں اور پیدا ہوں گے وہ تمہارے۔۔۔‘‘

بڑی بی بی پارو کو کہتی بڑی بی بی کو ابھی تک کوئی ملال نہیں تھا کہ اُس نے خود اپنا شوہر ایک پرائی عورت کے حوالے کر دیا تھا اور اب تو اِس نے ساری جائیداد بھی ایک پرائی عورت کے بیٹے کو دینی تھی۔

میں نے تم کو چھوٹی بہن اور سہیلی سمجھا جب سے تمہیں بیاہ کر لائی ہوں مجھے تو بالکل محسوس نہیں ہوا کہ تم میری۔۔۔‘‘

پارو اُس کی بات ٹوک دیتی بڑی بی بی مجھے بھی کبھی محسوس نہیں ہوا۔

اِدھر بڑی بی بی اور رب نواز نئے آنے والے مہمان کے لیے تیاریاں شروع کرنے لگے۔ طرح طرح کے کھلونے، ننھے ننھے کپڑے، خوبصورت جھولے سب چیزوں کے لیے آڈر دینے شروع کر دیئے۔ پارو یہ سب خاموشی سے دیکھتی رہی اور اس کی طبیعت دن بدن خراب رہنے لگی تھی تو ایک پل

کے لیےنہیں رکتی تھی۔ بڑی بی بی نے شہر میں ایک اچھی گائنا کالوجسٹ سے وقت لے رکھا تھا۔ ڈرائیور نے صبح نو بجے دونوں بیبیوں کو شہر لے کر جانا تھا۔ پارو کا خیال رکھنے کے لیے دلشاد کو بھی تیاری کا رات ہی بتا دیا تھا۔ وہ جلدی نہا دھو کر تیار ہوگئی۔

بڑی بی بی اُس کے کمرے میں آئی تو ہلکے گلابی رنگ کی فراک اور سفید پٹیالہ شلوار پہنے۔ جھیل سی گہری آنکھوں میں سیاہ کا جل، ہلکے اورنج رنگ کی لپ اسٹک اور صراحی جیسی گردن میں چھوٹا سا لاکٹ پہن کر وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ انھوں نے کہا حسین لگ رہی ہو اور وہ شرما گئی پھر دونوں سیڑھیاں اترتی ہوئی باہر گیٹ کی طرف چل دیں۔ شہر جانے والا راستہ کچی سڑک سے ہوتا ہوا پکی سڑک کی طرف جاتا تھا۔ دونوں کناروں پر سرسبز کھیت، درخت قطار در قطار کھڑے تھے۔ کھیتوں میں لوگ کام کر رہے تھے۔ یہ سب لوگ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہے تھے۔

ڈاکٹر نے مکمل چیک اَپ کرنے کے بعد کچھ دوائیاں اور ہدایات لکھی دی تھیں۔ آپ انھیں وقت پر دیتی رہیں۔ بڑی بی بی نے پوچھا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں ہے۔

بالکل نہیں۔ بس عمر تھوڑی کم ہے۔

ان کو خوش رکھیں، اپنی صحت کا خیال اور ان کو سوچنے کم دیا کریں۔

کلینک سے واپسی پر انھوں نے اس سے پوچھا:

تم اب چپ چپ کیوں رہتی ہو؟

پہلے تو بہت چہکتی تھی؟

وہ آنکھوں میں نمی کو چھپاتے ہوئے دھیرے سے بولی کوئی وجہ نہیں ہے اس پر وہ خاموش ہوگئی دن یونہی گزرتے گئے اور کئی مہینے گزر گئے۔ آخر کار وہ وقت آن پہنچا جس کے لیے سب لوگ شدت سے انتظار میں تھے۔ اُسے شہر کے سب سے اچھے پرائیویٹ ہسپتال میں لے جایا گیا۔ رب نواز بہت بے چین ہو رہا تھا کہ جلدی سے وہ گھڑی آئے جب وہ اپنے وارث کو ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے سے لگائے۔ ادھر پارو کو سٹریچر پر آپریشن تھیٹر کی طرف لے جا رہے تھے۔ سفید رنگ کا کوٹ پہن کر وہ سفید پری لگ رہی تھی۔ اس کی ہلدی کی طرح زرد رنگت، آنکھوں میں اُداسی اور نہ جانے کن سوچوں میں ڈوبی چھت کی طرف گھور رہی تھی۔ بڑی بی بی نے امام بری کے دربار پہ حاضری دینے کی منت مانگ لی تھی۔ ہر کوئی پارو کے لیے خاموش دعائیں کر رہا تھا۔ اور رب نواز آپریشن تھیٹر کے باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ کافی وقت گزرنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر باہر آئی چہرے پر کافی سکون تھا انھیں دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائی اور بتایا کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اسے سن کر وہ خوشی سے نہال ہو رہے تھے اور ڈلیوری بھی نارمل ہوگئی۔ آپ دو گھنٹے بعد مریض سے مل سکتے ہیں۔

اس خوشی کے موقع پر انھوں نے رب کا لاکھ شکر ادا کیا اور حویلی میں فون کے ذریعے اطلاع دی کہ سب گاؤں والوں کے کھانے کا بندوبست کیا جائے۔ اب وہ دونوں منے کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہونے لگے تھے۔ ننھا منا دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ بڑی بی بی نے پارو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے وہ دھیرے سے بولی ہاں یاد ہے۔ رب نواز پیار بھری نظروں سے پارو کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا آج تم نے ہمیں دنیا کی بہت بڑی خوشی دی ہے۔

لیکن پارو کی خاموشی کو کوئی سمجھ ہی نہیں پایا۔ حویلی میں مبارک باد دینے کے لیے مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹیں تھیں اور بڑی بی بی کی خوشی تو چھپائے نہیں چھپ رہی تھی ہر کوئی محسوس کر رہا تھا، لیکن پارو کی چپ کسی کو محسوس ہو رہی تھی نہ ہی دکھائی دے رہے تھی۔

ایک دن بڑی بی بی پارو کے کمرے میں آئی تو وہ وہاں موجود نہ تھی۔ انھوں نے دلشاد کو آواز دی اور کہا چھوٹی بی بی کہاں گئی ہیں وہ اکثر لان میں بیٹھی فضا میں اُڑتے ہوئے آزاد پنچھیوں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ اُسے کھلے آسمان تلے سانس لینے سے سکون ملتا اور پیپل، نیم، برگد کے درخت، پھول کلیاں سب اس کے دوست تھے۔ وہ کہیں بھی نہیں موجود تھی۔ بڑی بی بی دوبارہ اس کے کمرے میں آئی اور ایک خط سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ملا جس کی تحریر یوں تھی:

بڑی بی بی آپ کو بہت مبارک ہو کہ حویلی کا وارث مل گیا۔ میں نے اپنا وعدہ وفا کیا آپ کو حویلی کے لیے وارث کی ضرورت تھی جو میں نے آپ کو دیا۔ میرے اپنے بھی کچھ خواب تھے جن کو پورا کرنے کے لیے میں نے جوانی کی کئی راتیں جاگ کر گزار دی تھیں۔ وہی سپنے جو ایک لڑکی کے ہوتے ہیں ان کو پورا کرنے کا میں نے بھی سوچا تھا۔ قید بہر حال قید ہی ہوتی ہے چاہے وہ سونے کے پنجرے میں ہی کیوں نہ ہو۔ میں عمر قید کی سزا نہیں کاٹ سکتی اور ہمیں اپنی مرضی سے گزارے ہوئے چند پل ہی کیوں نہ میسر آئیں ہم اُس میں ساری زندگی جی لیتے ہیں۔ زبردستی گھر بسائے جا سکتے ہیں کبھی دل نہیں بسائے جاتے۔ (میری اور بڑے صاحب کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔) آپ بھی میری خاموشی کو نہیں سمجھ سکیں۔ مجھے حویلی کی دولت و جائیداد نہیں چاہیے اور نہ ہی عیش و آرام چاہیے صرف اپنی مرضی کا جیون ساتھی چاہیے جس کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر میں اپنی زندگی گزار سکوں۔ اس لیے مجھے معاف کر دیں میں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اب آپ بڑے صاحب کو کہہ کر مجھے اس قید سے رہائی دلوائیں۔

آپ کی دوست پارو!

خط پڑھ کر اُن کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

"دوڑو"

اگر آپ اُڑ نہیں سکتے تو دوڑو، اگر آپ دوڑ نہیں سکتے تو چلو، اگر آپ چل نہیں سکتے تو رینگو لیکن آگے بڑھتے رہو۔

اپنی سوچ اور سمت کو درست رکھو، کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

(مارٹن لوتھر کنگ)

کانچ کا چھناکا

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

اس شہر میں تبادلے کے بعد بہت سے دوستوں سے تعلق بنا اور ختم ہو گیا مگر ایک دوست ڈیش سے سوچ، فکر اور مزاج کی ہم آہنگی نے ایک دوسرے سے اس قدر قریب کر دیا جس قدر بچپن کے دوست آپس میں بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال کلبلائے گا کہ بھئی یہ ڈیش کیا نام ہوا؟ ہر آدمی اپنے نقطہ نظر کے حوالے سے خود ساختہ دلائل ضرور رکھتا ہے۔ سو ہم نے سوچا اصغر، اظفر، اشعر، اطہر یا جاوید، صدیق اور منظور کو تختۂ مشق بنانے کے بجائے کیوں نہ ڈیش کی اصطلاح استعمال کی جائے۔ یہ ڈیش کی اصطلاح بھی اندیشۂ دور دراز کے پیش نظر استعمال کی گئی ہے وگرنہ کونسا نام ہے جو دوستی پر فٹ نہیں آتا۔

کئی دنوں بلکہ ہفتوں اور مہینوں سے ڈیش صاحب ہماری تواضع کا پروگرام ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ بقول اُن کے وہ ہمیں دنیا کے اُس گوشے کی سیر کرانے والے ہیں جو ہم نے اس سے قبل دیکھا اور نہ سُنا ہوگا۔ ڈیش صاحب کے اس یقین کے جواب میں ہمارے ماتھے پر تیوریاں نمایاں ہونا فطری بات ہے مگر ڈیش صاحب اپنے دعویٰ میں فرماتے ہیں کہ جس جہاں کی سیر ہم آپ کو کرانے چلیں ہیں اُسے دیکھ کر آپ بادشاہ اکبر کی پیروی میں کہہ اُٹھیں گے:

گر فردوس بر روئے زمیں است
ہمی است وہمی است

ہم اپنی بابت آپ کو بتلاتے چلیں کہ نا تو ہم مزاج کے سادہ اور نا تنگ ذہن کے مالک ہیں۔ نئے خیالات اور نئے تجربات ہمارے مزاج کا حصہ رہے ہیں۔ بلاشبہ ہمارا آبائی شہر اس میٹروپولیٹن شہر کی ٹکر کا نا صحیح مگر زندگی کی ہر وہ شے وہاں بھی اُسی طرح دستیاب ہے جس کے مثبت یا منفی استعمال سے زندگی کی راہیں کشادہ بھی ہو سکتی ہیں اور تنگ بھی۔

اس سے قبل آپ سوال اٹھائیں کہ اگر وہ شہر آپ کے مزاج اور حالات کے مطابق تھا تو اُسے چھوڑنے کی ضرورت کیا تھی۔ دو لفظوں کا جواب تو یہ بنتا ہے ''کانچ کا چھناکا'' میرے خیال میں یہ جواب آپ کے لیے مزید اُلجھن کا باعث بن جائے گا۔ ہر انسان کی زندگی پر اُس کو تب تک اختیار ہوتا ہے جب تلک کالے سر والی اُس کی زندگی میں شریک نہیں ہوتی۔ اور کالے سر والی کی دراز زلفیں، غزالی آنکھیں، گلابی گال، ستواں ناک اور بیضوی دہانہ ہو تو یوں جانئے کہ آپ کی نوکری پکی ہوئی یعنی آپ پر جورو کے غلام کا لیبل بہ آسانی چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ صاحب ہم بھی آپ کی طرح گوشت پوست کے انسان اور سینے میں نرم دل کے مالک ہیں۔ ہمارے لیے بھی زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ہم سدھائے ہوئے حیوانِ ناطق کی پیروی میں بیگم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے زندگی کے راستے کشادہ کرتے جائیں۔

ایک چیز توازن نام کی بھی ہماری زندگی میں لازم ٹھہرائی گئی ہے جو اکثر کوشش کے باوجود مزاجی خدا کہلانے والے شخص کی دسترس میں کم کم ہی آتی ہے۔ والدین تعلیم یافتہ، زمانہ شناس اور مزاجاً بردبار تھے لہٰذا بیگم صاحبہ کے ہم دو اور ہمارے دو کی تکرار پر خاموشی سے آمادہ ہو گئے نہ صرف یہ بلکہ روزمرہ کے معمولات سے بھی اس طرح کنارہ کش ہو گئے کہ جیسے گھرداری سے اُن کا کبھی تعلق نہ تھا۔ چھوٹا بھائی بھی تعلیم کی غرض سے اکثر دوسرے شہر میں رہتا اور کبھی کبھی گھر آتا تو اُس کی اس طرح تواضع کی جاتی جس طرح مہمان کی کی جاتی ہے۔ البتہ اکلوتی چھوٹی بہن کے باعث بیگم کے سامنے اُس وقت خفت کا سامنا ہوتا جب وہ روایتی ناز و ادا کے ساتھ کہتی:

''دیکھیں جی میرے گھرے میں دو بڑی بہنیں اور بھی تھیں مگر میری جیولری، کاسمیٹکس اور پرفیومز کو ہاتھ لگانے کی کبھی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی مگر یہ گڑیا آفت کی پرکالہ ہے۔ جیسے ہی میری نظر چوکتی ہے فوراً میرے بیڈروم میں جا کر میری چیزیں بالخصوص پرفیومز کو استعمال کرنا نہیں بھولتی۔''

لفظ پرفیومز پر ہم نے اُن کے مخصوص اور مہنگے برانڈ کا نام لیتے ہوئے یاد کرایا ''کہ بھئی لفظ پرفیومز تو آپ ایسے استعمال کر رہی ہیں جیسے طرح طرح کے ہوں حالانکہ آپ تو ایک ہی برانڈ کا پرفیوم استعمال کرتی ہیں'' ہمارے یاد دلانے پر بیگم صاحبہ تنک کر بولی:

''ایک برانڈ کا مطلب ایک شیشی تو نہیں ہوتا، میں ایک وقت میں کئی باٹلز رکھتی ہوں تا کہ وقت پڑنے پر پریشانی کا سامنا نہ ہو، آپ کو تو پتہ ہے میں کھانا پینا چھوڑ سکتی ہوں مگر اپنی فزیک، فٹنس اور میک اپ سے کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتی اور پرفیومز سے تو کسی قیمت پر نہیں، دیکھتے نہیں کام والی کے کپڑوں سے مرے ہوئے مچھروں کی بُو آتی ہے اور گاڑی میں بیٹھو تو ڈرائیور کے کپڑوں سے ایسی بساند آتی ہے جیسی مچھلی مارکیٹ میں آتی ہے اور ان بیچاروں کا بھی کیا قصور جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر، بند نالے اور گٹر کیا کم ہیں فضا کو مسموم کرنے کے لیے۔''

ہم نے گڑیا کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کئی بار کہا کہ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو ہمیں بتلاؤ ہم بازار سے لا دیں گے مگر وہ کبھی ہنس کر اور کبھی شرما کر انکار میں سر ہلا کر بھاگ جاتی۔ ہم والدین سے کسی قیمت جدا ہونا نہیں چاہتے تھے اس میں کسی طرح کی ہمدردی یا والدین کی تنہائی کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا بلکہ والدین کے زیرِ سایہ گھر گرہستی میں جو رکھ رکھاؤ اور بے فکری ہمیں میسر تھی تنہا زندگی میں اُس کو برقرار رکھنے کا ہم خود کو اہل نہیں سمجھتے تھے مگر اُس روز ہمارے بیڈروم میں کانچ کے چھناکے نے صورت حال اس قدر گمبھیر کر دی کہ رات کو والدین نے ہمیں اپنے کمرے میں بُلا کر پیار سے سمجھایا:

"بیٹا! ہماری، آپ کی اور اس گھر کی بھلائی اسی میں ہے کہ آپ اپنی دنیا الگ آباد کرلو۔" ہم نے والد صاحب سے اختلاف کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اُنہوں نے انگلی کے اشارے سے "نا بیٹا نا، ہم دونوں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے، اسی میں ہماری، تمہاری اور اس گھر کی بھلائی ہے، میں نے ہیڈ آفس فون کر کے ہاشمی صاحب سے تمہارے تبادلے کی بات کرلی ہے۔"

دیکھیے! بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر جب بات نکلتی ہے تو دُور تلک جاتی ہے۔ ہماری افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے ڈیلش صاحب نے دائیں کہنی ہماری بائیں پسلی میں بھونکتے ہوئے شوخی سے کہا "تو پھر پارٹی کا پروگرام بنالو نا" ڈیلش صاحب کی معنیٰ خیز نظروں کے جواب میں ہم نے صرف یہ کہنا مناسب سمجھا "بندہ پرور ہم نے آنکھیں بند کر کے اپنی لگام آپ کو تھمادی ہیں" ڈیلش صاحب بھی کمپیوٹر سے نگاہیں ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو ورزش کے انداز میں اوپر نیچے کرتے ہوئے "تو پھر اس اتوار کو چھ بجے تیار رہیے، یا میں خود آؤں گا آپ کو پک کرنے وگرنہ دوسری صورت میں موبائل پر آپ کو ایڈریس سمجھادوں گا۔"

"کچھ بتلائیے بھی کس قسم کی پارٹی ہے، لوگ کیسے ہیں، اسٹیٹس کیا ہے، آپ کو تو پتا ہے میں بلو اسٹینڈرڈ لوگوں سے ملنا قطعاً پسند نہیں کرتی، ایسا کیجیے نا آپ اکیلے چلے جائیں اگر لوگ باگ اور ماحول اچھا ہوا تو میں پھر کسی پارٹی میں شریک ہوجاؤں گی۔"

"محترمہ جس طرح آپ پارٹی اور اُس کے شرکاء کی بابت بے خبر ہیں، بندۂ ناچیز بھی اُتنا ہی بے خبر ہے۔ آپ تو جانتی ہیں اس شہر میں ڈیلش صاحب سے زیادہ عزیز میرا کوئی دوست نہیں۔ جب سے ہم اس شہر میں آئیں ہیں وہ ہمیں اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرنے اور ماہانہ پارٹیوں میں شرکت کی مسلسل دعوت دے رہے ہیں۔ دیکھنے میں کیا حرج ہے، انسان تجربات سے ہی سیکھتا ہے اگر آپ مطمئن ہوئیں تو اگلی بار جائیں گے وگرنہ نہیں۔"

قبل اس کے بیگم کوئی جواب دیں موبائل کی گھنٹی نے دونوں کو متوجہ کر دیا۔ "ہوں، ہاں، اچھا، ویری سیڈ، کوئی پرابلم نہیں، ہوں ہوں، ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔"

"کون تھا؟"

"ڈیلش صاحب تھے۔"

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"وہ، آج مسز مانڈی والا کی مدر ہاسپٹلائز ہیں۔ اس لیے پارٹی نیکسٹ سنڈے تک پوسٹ پون ہوگئی ہے۔"

"یہ مسز مانڈی والا کون ہیں؟"

"ملوں گا تو ضرور بتلاؤں گا، ابھی تک تو میں بھی آپ کی طرح مانڈی والا اور ہانڈی والا سب سے قطعی بے خبر ہوں۔"

"بھاڑ میں جائیں ہانڈی اور مانڈی والے، ہماری شام تو خراب کر دی نا۔" وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے بیگم کے شانے دبا کر چہرہ اُن کے کان کے پاس کرتے ہوئے رومینٹک لہجے میں کہا "بھئی بجلی تو کہیں نا کہیں گرنی تھی، مانڈی والا نہ صحیح تو ہانڈی والا ریسٹورنٹ تو کہیں نہیں گیا۔"

"آپ کو تو لے دے کے بس کھانے کی فکر پڑ جاتی ہے اور وہ بھی اُس بورنگ جگہ پر۔ چلنا ہے تو کسی اسٹینڈرڈ کی جگہ پر چلو۔" انکار کی گنجائش قطعاً نہ تھی شانے اُچکاتے ہوئے "ایز یو وِش" کہا چھوٹے اور بڑے کو ڈھیر ساری چاکلیٹ، جوس، بسکٹ اور کھلونے دے کر اُن کی آیا کے سپرد کیا اور تیزی سے گاڑی کی جانب قدم بڑھادیے۔

ماحول کی نسبت تو اس اسٹینڈرڈ کی جگہ کو سو میں سے اسّی نمبر دیے جا سکتے تھے مگر سروس اور کھانے کے حوالے سے ففٹی ففٹی سے زیادہ کا سوال ہی بنتا تھا مگر یہ سب کچھ دل ہی دل میں ہو سکتا تھا کیونکہ بیگم صاحبہ کی رائے سے اختلاف ایک نیا محاذ کھولنے کے مترادف تھا۔

دوسرے روز ڈیلش صاحب سارا دن وقفے وقفے سے معذرت کرتے رہے۔ اُنہیں اس بات کا ملال تھا کہ پہلی بار ہمیں انوائٹ کیا اور اُسی روز مسز مانڈی والا کی مدر ہاسپٹلائز ہوگئیں۔ ہماری دلجوئی کے لیے ڈیلش صاحب پورا ہفتہ ہمارے اشتیاق کو مہمیز دیتے رہے۔ "میاں یوں سمجھ لو، دیر آید درست آید، زندگی میں بہار آ جائے گی بلکہ یوں کہیے کہ نئی زندگی مل جائے گی۔" ہماری لاکھ کوشش کے باوجود ڈیلش صاحب نے پارٹی کی نیچر کے حوالے سے ایک لفظ بھی بیان نہیں کیا اور یہی چیز ہمارے لیے دشواری کا باعث بن رہی تھی کہ ہم بیگم کو قائل کریں تو کیسے کریں؟

جمعہ کے روز ڈیلش صاحب نے سرگوشی کے انداز میں خوشخبری سنائی کہ اس بار پارٹی سنڈے کے بجائے سیٹرڈے کو ہے، تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے ہیں، ہر ممبر آپ سے انٹروڈکشن کے لیے بہت ایکسائٹڈ ہے، پروگرام وہی ہے یا تو میں خود آپ کو پک کروں گا یا موبائل پر ایڈریس بتلادوں گا۔

اب جناب بیگم کو منانے کے لیے جن جن مراحل اور جتن سے ہمیں گزرنا پڑا اُس کا بیان ہم سے بہتر حضرت داغ دہلوی اس شعر میں کر گئے ہیں:

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی اتنے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

ڈیلش صاحب نے موبائل پر مطلوبہ پتہ سمجھاتے ہوئے کئی اضافی نشانیاں بھی ذہن نشیں کرادیں۔ ہم نے بھی جواب میں اعتماد سے بروقت پہنچنے کا وعدہ کرتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ زبانی بات چیت میں آدمی کو ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ اُس کی نظروں کے سامنے ہے مگر گردشِ ایام یا گردشِ دوراں کا حصّہ بنتے ہی نزدیک نظر آنے والی چیزیں اکثر دُھندلی ہوجاتی ہیں اور کبھی کبھی حافظے سے محو بھی۔

اب سلسلہ یہ بنا کہ دائیں، بائیں، سیدھے، اُلٹے ڈرائیو کرنے کے

بعد ڈیش صاحب نے موبائل پر تشویش بھرے لہجے میں نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو ہم نے اپنی پریشانی کا ذکر کچھ مکمل کچھ نامکمل الفاظ میں کر دیا۔ڈیلش صاحب نے موبائل پر ہماری رہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا۔اُن کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے قریب دس منٹ بعد ہم منزلِ مقصود پر پہنچے تو کشادہ گھر کے باہر روشنیاں جھلمل، جھلمل کر رہی تھیں۔ ہماری سہولت کے لیے ڈیلش صاحب دو چاک وچوبند مسلح گارڈ کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ڈیلش صاحب کی رہنمائی میں ہم نے گاڑی پارک کی اور جونہی ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو ویلکم کی پُر شور آوازوں، ہگ اور ہینڈ شیک کے بعد لائٹس آف کر دی گئیں۔اندھیرے کے ساتھ گھٹی گھٹی آوازوں اور طرح طرح کی خوشبوؤں سے ماحول سحر آگیں ہوگیا۔

قبل اس کے ہم ڈیلش صاحب سے روشنی نہ ہونے کا سبب دریافت کرتے وہ ہمارا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے ایک سمت میں بڑھنے لگے۔مزاحمت کرتے ہوئے ہم نے بیگم کو آواز دی تو کچھ دیر بعد ڈیلش صاحب کے بجائے ایک نسوانی ہاتھ ہمارا ہاتھ تھام کر ایک کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔جی تو بہت چاہا بیگم کی خبر لینے کو مگر موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے خاموشی میں عافیت سمجھی۔ ہر چند ہمارا شمار زاہدِ خشک میں نہیں ہوتا مگر مشروب اور ساقی نے جس انداز اور ادا سے فرائضِ مہمان داری نبھائے اُس نے ہمیں ایک طرح سے شرابور کر ڈالا۔

ہمارے ذہن سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی تھی اور ہمارے اندر انسان کی جگہ ایک درندہ عُود کر آیا تھا۔ہم نے فریقِ مخالف پر حاوی ہونے کی بھرپور کوشش کی مگر حملہ اس قدر شدید اور تابڑ توڑ تھا کہ سپَر ڈالتے ہی بنی۔ یہ کیفیت آج تک کسی سے بیان ہوئی ہے اور نہ شاید ہو سکے۔اس کے لیے بھی فیض احمد فیض کی مدد لینی پڑے گی۔

ایک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

شادی کے بعد یہ پہلی رات تھی کہ ہم نے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے گزاری۔ناشتے کی ٹیبل پر پہلا سوال جو بیگم صاحبہ نے ہم پر داغا وہ کچھ یوں تھا:

''تمہارا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا ہے''

''کون سا روپ؟''

''اب بننے کی ضرورت نہیں''

''مطلب؟''

''جسم کا ایک ایک جوڑ اب تک دکھ رہا ہے''

''اس میں کون سی نئی بات ہے''

''مطلب یہ کہ یا تو میں تمہیں نہیں جانتی یا تم نے آج تک اپنا آپ مجھ سے چھپائے رکھا، بائی داوے کوئی ڈرگ وغیرہ تو نہیں لی تھی تم نے؟''

''جو کچھ وہاں دستیاب تھا میں نے وہی لیا، ویسے بھی تم جانتی ہو مجھے ڈرگ وغیرہ کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔''

روزمرہ کے برخلاف ڈیلش صاحب کو آفس کے مین گیٹ پر دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔گرمجوشی سے مصافحہ اور معانقہ کرتے ہوئے بولے:

''سنائیے! کون سے آسمان پر ہیں؟''

''بھائی صاحب میں تو آپ کے ساتھ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر کھڑا ہوں، یہ آسمان بیچ میں کہاں سے آ گیا؟''

''مطلب آپ نے انجوائے نہیں کیا؟''

''ایسی بات نہیں، بہت انجوائے کیا۔۔۔مگر۔۔۔عجب طرح کا کنفیوژن ہے۔۔۔بیگم کے سوالات بھی اُلجھن کا باعث بن رہے ہیں۔''

''میاں سب الجھنیں، گانٹھیں اور بندھن کھُل جائیں گے۔دھیرج سے کام لو۔تم تو میری توقع سے زیادہ سادے نکلے۔کوئی شاعری وائری پڑھتے ہو کہ نہیں۔گر نہیں تو فوراً شروع کر دو۔احمد فراز اس حوالے سے بہت مددگار ہوں گے۔دیکھو! تمہارے معاملے کی گتھی کتنی نفاست سے سلجھا رہے ہیں''

یہ بھی کیا کم ہے کہ دونوں کا بھرم قائم ہے
اس نے بخشش نہیں کی، ہم نے گزارش نہیں کی

اصل میں غلطی میری تھی۔اگر پہلے روز ہی میں نسوانی سراپے میں گم ہونے کے ساتھ اُس کی خوشبو پر توجہ دیتا تو مجھے ڈیلش صاحب کے سامنے حزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔اب ہم میاں بیوی اس انجمنِ آزاد خیالی کے باقاعدہ رکن بن گئے تھے جو بھاری معاوضہ کے عوض حاصل ہوئی تھی۔

آئندہ کے لیے میں نے ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا تھا کہ میں نسوانی سراپے میں کھونے سے پہلے اُس کی خوشبو پر توجہ دوں گا اور بوقت انتہا اُس کی تعریف میں چند جملے ایسے ضرور کہوں گا جس سے وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر میری گرویدہ ہو جائے۔اب میں تعریف کے آخر میں اپنے ساتھی کا نام دریافت کرنا نہ بھولتا۔کبھی کسی نے مجھے اپنا پورا نام نہیں بتایا۔کوئی نام کا پہلا لفظ کوئی درمیان کا لفظ کوئی آخیر کا لفظ اور کوئی بوجھو تو جانے کی سرگوشی سے میرا منہ بند کر دیتی۔

ایک دن باس نے اپنے کمرے میں بلا کر مجھے اطلاع دی کہ ہمارے فلاں شہر کو آپ کی بہت ضرورت ہے لہٰذا میں آپ کا تبادلہ وہاں کر رہا ہوں۔باس کی بات سُن کر میرے ہوش اُڑ گئے۔بیوی، بچے، گھربار کی سوچ کی بجائے میرے ذہن میں انجمنِ آزاد خیالی اور ماہانہ پارٹی کی لذت سے محرومی کا خوف لکنت کی شکل میں ظاہر ہونے لگا۔میں نے بہت کوشش کی کسی طرح باس کو اپنے حق میں مولڈ کر لوں تاکہ وہ میری جگہ کسی اور شخص کا تبادلہ کر دیں مگر باس نے میری اِسکل کا حوالہ دیتے ہوئے نرمی سے سمجھایا بھی اور یہ تسلی بھی دی کہ جیسے ہی آپ اُس آفس میں کسی آدمی کو ٹرینڈ کر دیں گے تو ہم آپ کو واپس بلا لیں گے۔

میرے ہاتھ میں ٹرانسفر لیٹر اور اُڑی ہوئی رنگت دیکھ کر ڈیلش صاحب میرے قریب آ کر دریافت کرنے لگے ''خیریت تو ہے؟'' میں نے اُن کی ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ حلق میں انڈیلے اور قدرِ لکنت کے ساتھ

ٹرانسفر آرڈر دکھاتے ہوئے بے بسی کا اظہار کیا تو ڈیش صاحب زور کا قہقہہ لگا کر بولے:

''میاں پہلے میرا آپ کے بارے خیال تھا کہ آپ سادہ طبیعت کے انسان ہیں مگر آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ سادہ ہی نہیں بلکہ عقل سے بھی پیدل ہیں۔''

''واہ۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ کیا کہنے۔۔۔ دوست ہو تو ایسا۔۔۔ کہ زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے۔۔۔ نمک پاشی کر رہا ہے۔۔۔''

''بھائی کون سے زخم۔۔۔ اور۔۔۔ کون سا نمک۔۔۔؟''

''ڈیش صاحب۔۔۔ آپ کا اندازہ درست ہے۔۔۔ اگر ہم عقل سے پیدل نہ ہوتے تو آپ کی بتلائی ہوئی راہ پر کیوں چلتے۔۔۔ کیوں۔۔۔ ہوا میں اُڑتی پتنگ کو تھامنے کی خواہش کرتے۔۔۔''

''اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔ دل تو چاہتا ہے کہ تمہیں کچھ دیر اور ستاؤں۔۔۔ مگر۔۔۔ تمہارے چہرے پر۔۔۔ اُڑتی ہوائیاں دیکھ کر۔۔۔ ترس آ گیا ہے۔۔۔ خوشی خوشی سامان باندھو۔۔۔ انجمنِ آزاد خیالی اُس شہر میں بھی پورے زور و شور سے ایکٹو ہے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ وہاں کی ممبر شپ تو یہاں سے ٹو ٹائم زیادہ ہے۔۔۔''

ڈیش صاحب نے صحیح کہا تھا اس شہر کی انجمنِ آزاد خیالی کا اگر اُس شہر کی انجمن سے مقابلہ کیا جائے تو گاؤں اور شہر یا دیسی اور ولایتی کی مثال بہ آسانی دی جاسکتی ہے۔

آپ اسے میرا خیال کہیں، خوش قسمتی سے تعبیر کریں کہ اُس کے بعد میری جس شہر میں بھی پوسٹنگ ہوئی انجمنِ آزاد خیالی اپنے استقبال کے لیے وہاں موجود پائی۔

ہر شہر کا کلچر، زبان اور فیشن میں تبدیلی سے بہت سے نئے رنگ، ذائقے اور لطف سے زندگی اسی دنیا میں جنت سے آشنا ہو گئی۔

چند پارٹیوں تک ہم دونوں ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے تجربات اور تاثرات شیئر کرتے رہے اُس کے بعد ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی پردہ نہ رہا۔ اب ہم میاں بیوی کم اور دوست زیادہ بن گئے تھے اور ایک دوسرے کی خوشی کو نہ صرف کھلے دل سے قبول کرتے تھے بلکہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کا کسی دوسرے سے تعلق گہرا ہو جاتا تو پارٹی کے علاوہ بھی اُس سے ملنے پر کوئی پابندی عائد نہ کرتے۔ گزشتہ دنوں میری ہمزاد ایکس کلے نیشن کے ساتھ ایک ہفتہ کے ٹرپ پر مشرقِ وسطیٰ کے فیشن شو میں شرکت کے بعد ڈھیر ساری شاپنگ کر کے لوٹی۔ میں بھی کو پچن مارک کے ساتھ تین دن کا ہلی ٹرپ کر کے جیب اور طبیعت ہلکی پھلکی کر کے لوٹا ہوں۔ بس یوں جان لیجیے آزادی سے جینا اور آزادی سے مرنا ہمارا ماٹو بن چکا تھا۔

شاید یہ میری پانچویں پوسٹنگ تھی یا چھٹی۔ لکی لی میری پوسٹنگ جہاں بھی ہوئی انجمنِ آزاد خیالی وہاں پر پہلے سے موجود پائی۔ اور یوں زندگی نئے رنگ، نئے ذائقوں اور نئے دوستوں سے آشنا ہوتی گئی۔ ہر پارٹی کے بعد دل سے یہی آواز نکلتی کہ اگر زمین پر کہیں جنت ہوسکتی ہے تو وہ یہیں ہے۔

چھٹی یا ساتویں پوسٹنگ کے بعد یہ پہلی پارٹی تھی۔ ہمیشہ کی طرح نئے دوستوں اور نئے ذائقوں کی نسبت ایکسائٹ منٹ بہت زیادہ تھی۔ ہونی بھی چاہیے تھی کیونکہ یہ شہر اپنے کلچر، زبان، لباس کے لحاظ سے بہت ایڈوانس مانا جاتا تھا۔ یہاں کے لوگ دوسرے شہروں کی نسبت ماڈرن گردانے جاتے اور زندگی میں آزادی کے بہت قائل تھے۔

خود کو ماڈرن اور آزاد پوز کرنے کے لیے ہم دونوں نے پھولوں کی دکان سے بہت سارے پھول اور خوشبو کی دکان سے بہت سارے پرفیومز خرید لیے تا کہ انجمن کے تمام ممبران کو فرداً فرداً پیش کر کے اپنا امیج بہتر بنایا جائے۔

ہمیں لدا پھندا دیکھ کر انجمن کی صدر میڈم ہوشربا نے حیرت کا اظہار کیا۔ جب میری ساتھی نے نہایت شستہ انگریزی میں اپنا منشائے مقصود بیان کیا تو انجمن کی صدر نے امریکن ایکسنٹ میں کئی بار نو نو کہہ کر ہمیں بتلایا کہ یہ انجمن کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس طرح سے ایکوئلٹی ڈسٹرب ہوتی ہے۔ سپوز ڈ ایک شخص انڈسٹریلسٹ کروڑ پتی یا ارب پتی ہے دوسرا اسیلریڈ پرسن یا مڈل کلاس بزنس مین ہے تو وہ ایک دوسرے کو کس طرح اکاموڈیٹ کریں گے۔ سو وی آر ایکول، بکوز وی آر انڈی پنڈنٹ۔

شاید ہم آنے والے آخری ممبر تھے۔ ہماری انٹری کے فوری بعد لائٹس آف کر دی گئیں، لوگ باگ جلد بازی میں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے اور ہمیشہ کی طرح اپنے اپنے ساتھی کے ساتھ الاٹ روم میں جاتے رہے۔ میں بھی اپنے روم میں جا کر نئے ساتھی کے ساتھ بہت پُر جوش تھا۔ اس کی وجہ اُس کی فٹنس، بولتے جسمانی خطوط اور کم عمری تھی۔ میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا وہ بھی اُسی طرح میرے اندر مدغم ہوتی گئی۔ فاصلے مٹتے گئے، حوصلے بڑھتے گئے۔ بدنی سیاحت کے بعد تیز سانسوں کی گرمی میں اختتامی مرحلہ قریب تھا، دونوں جسموں کا ہیجان عروج کو پہنچ چکا تھا۔

جذبات کی انتہا پر میں اُس کے ہونٹوں کی چاشنی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُس کے سینے پر جھکا تو نہایت مانوس خوشبو کی عطر بیز لہروں میں زور کا چھناکا ہوا اور میں کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ فضا میں میری آواز گونجنے لگی ۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔ (چند آوازوں کے بعد۔۔۔) نہیں معلوم کس جذبے کے تحت دوڑ کر میں نے لائٹ آن کر دی۔۔۔!

☆

آخری خبریں آنے تک کہانی کا راوی پاگل خانے پہنچ چکا ہے اور اُس کی ساتھی خودکشی کے باعث جہانِ فانی سے کوچ کر گئی ہے جس کا جنازہ اُس کے آبائی شہر والدین کی جانب روانہ کیا جا چکا ہے۔۔۔!!

''کشکولِ سخن''

عارف امام
(امریکہ)

طرزِ تنہائی کو آواز نہ بھائی میری
سببِ نالہ ہوئی نغمہ سرائی میری

فرشِ دالانِ نمائش ہے یہ صحرا مجھ کو
رنگ لاتی ہے یہاں آبلہ پائی میری

خاکِ مقتل سے بنایا مرا پردازِ نفس
پھر مرے خون سے تصویر بنائی میری

ایک دیوار میں چنوایا گیا تھا مجھ کو
کتنی دیواروں پہ صورت ابھر آئی میری

خاک میں مل کے ہوا خاک تو پہچانا گیا
ہائے کس وقت ہوئی جلوہ نمائی میری

کون زندہ ہے مرے شہر میں کس کو معلوم
کیا خبر کس نے یہاں لاش اٹھائی میری

آبِ امّید میسر تھا مجھے وقتِ سحر
اشکِ نمکیں سے ہوئی روزہ کشائی میری

قید ہو کر بھی میں آزاد نظر آتا ہوں
اُس نے کس ڈھنگ سے زنجیر بنائی میری

اتنا خالی تو نہیں ہے مرا کشکولِ سخن
ایک دو حرفِ شکستہ ہیں کمائی میری

○

نوید سروش
(میر پور خاص)

معراجِ فن کو پانے کے عزمِ سفر میں تھے
سب جانتے ہیں ہم اسی شہرِ ہنر میں تھے

قدموں کے پاس منزلِ مقصود تھی کھڑی
آثار کامیابی کے میری نظر میں تھے

لیتا رہا تجاہل و غفلت سے کام جو
میرے خیال و خواب اسی کے اثر میں تھے

آخر انھوں نے کھول دیا راز برملا
وہ اشک جو چھلکتے ہوئے چشمِ تر میں تھے

صدیوں کے بعد لوٹ کے آیا تھا جن کے پاس
گھر میں نہیں کہہ دیا حالاں کے گھر میں تھے

ہر دل کے آر پار ہوئے، خوں میں تر بہ تر
وہ تیر جو کہ یار کی تیغِ نظر میں تھے

ناکامیِ حیات پہ رویا تو تھا سروشؔ
شرمندگی کے زخم بھی اس کے جگر میں تھے

○

منوہر وجے
(لدھیانہ، بھارت)

اصولوں سے بغاوت کر رہا ہوں
میں دشمن سے محبت کر رہا ہوں

مجھے معلوم ہے انجام پھر بھی
تیری تجھ سے شکایت کر رہا ہوں

محبت میں شکستیں کھاتے کھاتے
میں اوروں کو نصیحت کر رہا ہوں

ہزاروں داؤں آتے ہیں مجھے بھی
ابھی تو میں شرافت کر رہا ہوں

جھکا کر اپنا سر خنجر کے آگے
میں قاتل پر عنایت کر رہا ہوں

مجھے بھی آ گیا جینا ''وجےؔ'' اب
سیاست سے سیاست کر رہا ہوں

○

کرشن گوتم
(چنڈی گڑھ، بھارت)

اب ذکر کوئی گردشِ ایّام کا نہیں
دل میں بھی کوئی شائبہ الزام کا نہیں

گزرے مرے قریب سے کتنے ہی آفتاب
اب رہ گیا سوال صبح و شام کا نہیں

اب ترا کام ہے تو بھلا کام کیا ترا
جو وقت کام کا ہے وہ آرام کا نہیں

تیرے لیے کیا تیری محبت بھی چھوڑ دوں؟
سونا بھی کھوٹ کے بغیر کام کا نہیں

اک سانس اب اٹکی ہے میرے اُسکے درمیاں
اب تک جو فاصلہ تھا وہ دوگام کا نہیں

○

شریف شیوہ
(لاہور)

پتھروں میں جی رہے ہیں یوں نگینے کانچ کے
جیسے رکھے ہوں کھلونے زندگی نے کانچ کے

ٹوٹنے کی کیا شکایت کیا خسارے کا گلہ
پتھروں میں گھر بنائے جب ہمی نے کانچ کے

سخت گیری میں مثالِ سنگ ہیں جن کے قلوب
روپ سب دھارے ہوئے ہیں وہ کمینے کانچ کے

ٹوٹنے سے کس طرح بچ پائیں ہم پتھراؤ میں
ہے بدن مٹی کا، دل شیشے کا، سینے کانچ کے

میرے غم پر اس ستم گر کی بھی آنکھیں رو پڑیں
ایک پتھر سے ابھر آئے دفینے کانچ کے

گامزن ہے اس طرح راہِ طلب میں زندگی
تیرتے ہوں آگ پر جیسے سفینے کانچ کے

کر دیا ہے ریزہ ریزہ ایک ٹھوکر نے انہیں
جو کھلونے چن لیے تھے زندگی نے کانچ کے

اللہ اللہ شیوہ اس چشمِ کرم کا معجزہ
پتھروں میں کر دیئے پیدا قرینے کانچ کے

○

عطاء الرحمٰن قاضی
(عارف والا)

افق پہ چاند یہ پچھلے کو سوچتا ہوگا
ہوا نے ریت کے ٹیلوں پہ کیا لکھا ہوگا!

حصار باندھ لیا خامشی کا جنگل نے
کنویں کی تہ میں ستاروں کا رتجگا ہو گا

میں آ گیا ہوں تحیّر کی آخری حد پر
اب اِس کے بعد خبر کچھ نہیں کہ کیا ہو گا

کسی کا درد ، مرا درد ہی سہی لیکن
کسی کا خواب، مرے خواب سے جُدا ہوگا

کہانیوں پہ فنا کے عذاب سے پہلے
رُتوں کا زہر، بدن میں اتر چکا ہو گا

سڑک پہ دوڑتی کاروں میں بے نشاں چہرے
کسی ہوا کے تعاقب میں واہمہ ہو گا

عطا یہ لمحہ بھی آخر غبارِ رنگ لیے
خزاں کی طرح، لہو میں اتر گیا ہو گا

○

عارف شفیق

(کراچی)

ٹوٹا کاسہ میلی چادر اور فقیری کیا ہوتی ہے
پوچھے خالی پیٹ کا پتھر اور فقیری کیا ہوتی ہے
دنیا بدلی لوگ بھی بدلے بدلے شام سویرے سارے
جاری ہے داتا کا لنگر اور فقیری کیا ہوتی ہے
ایسی قناعت ایسا توکّل پھر کب اس دنیا نے دیکھا
مولا علیؑ سے کون ہے بڑھ کر اور فقیری کیا ہوتی ہے
اللہ ہُو کی ایک صدا سے کیف کے چشمے جاری ہیں
وہ ہی وہ ہے دل کے اندر اور فقیری کیا ہوتی ہے
چھوڑ کے خواہش اس دنیا کی کر کے مسلک صبر و رضا کو
آ بیٹھا ہوں اُس کے در پر اور فقیری کیا ہوتی ہے
باندھ کے گھنگرو رقص کروں میں گلیوں گلیوں مست پھروں میں
میرے سخی شہباز قلندر اور فقیری کیا ہوتی ہے
کیسی عزت کیسی شہرت دنیا کیا ہے جائے عبرت
بس اس کا ہی نام ہے لب پر اور فقیری کیا ہوتی ہے
نانا نواسوں کا رشتہ بھی عارفؔ کیسا رشتہ ہے یہ
سجدے میں کٹ جاتا ہے سر اور فقیری کیا ہوتی ہے

○

مراق مرزا

(ممبئی، بھارت)

چہرۂ کون و مکاں پر بھی عیاں ہو جاؤں گا
میں کتابِ وقت ہوں اک دن بیاں ہو جاؤں گا
رازِ حق قطرہ پہ جب روشن ہوا ابھری صدا
لوٹ کر مصدر پہ اپنے بے کراں ہو جاؤں گا
اک چراغِ عرش جلنے کو ہے میری ذات میں
ایسا لگتا ہے کہ اب میں کہکشاں ہو جاؤں گا
خود سے ہی اک سنگریزے نے کیا کچھ یوں کلام
گر خدا چاہے گا میں بھی شائیگاں ہو جاؤں گا
تھا کوئی مجذوب وہ جس نے اندھیرے سے کہا
اختتامِ شب جو ہو گا لامکاں ہو جاؤں گا
منتشر ہو جائے گا اک دن عناصر کا مکاں
اور میں اٹھ کر زمیں سے آسماں ہو جاؤں گا
سرحدوں میں اُس کی جب آنے لگے بادل مراقؔ
بول اٹھا صحرا کہ اب میں گلستاں ہو جاؤں گا

○

جاوید صدیق بھٹی

(لاہور)

اے ہوا اُس پہ یوں اثر کرنا
سرد جذبات کو شرر کرنا
سنگ پگھلا تو یہ کھلا مجھ پر
کتنا مشکل ہے دل میں گھر کرنا
اُس مسیحا کو بھی نہیں آیا
زخمِ دل پر مرے، نظر کرنا
یہ ہے توہین آدمیت کی
کسی ظالم کو چارہ گر کرنا
رات کاٹو کسی تمنا میں
تم کو آ جائے گا سحر کرنا
کیسے جاویدؔ ہم کریں منزل
اپنی قسمت میں ہے سفر کرنا

○

اسداعوان

(جھنگ)

جنگ جیتے بھی تو مغلوب ہوئے مارے گئے
آنکھوں آنکھوں میں جومعیوب ہوئے مارے گئے
سچ سکھایا ہے زمانے کو ہمیشہ ہم نے
اس کی پاداش میں مصلوب ہوئے مارے گئے
شہر میں تیری طرح وہ بھی پری پیکر تھے
جو مری آنکھ کے محبوب ہوئے مارے گئے
اک تو بدنام ہوئے اپنی محبت کے عوض
تیری نظروں میں بھی معتوب ہوئے مارے گئے
یہ جو پھرتے ہیں تعاقب میں ہمہ وقت اسدؔ
ایسے لوگوں سے جو مرعوب ہوئے مارے گئے

○

ہاجرہ نورزریاب

(مہاشٹرا، بھارت)

زندگانی حباب کی سی ہے
جس کی تصویر خواب کی سی ہے
غور سے لوگ پڑھ رہے ہیں مجھے
میری صورت کتاب کی سی ہے
دیکھ ڈھلتے شباب کی صورت
ڈوبتے آفتاب کی سی ہے
آج دنیا کو غور سے دیکھا
یہ تو بالکل تراب کی سی ہے
لکھ رہے ہیں فرشتے روز وشب
زندگی احتساب کی سی ہے
اسکے کردار میں جو ہے خوشبو
وہ مہکتے گلاب کی سی ہے
دل کی حالت ترے بنا زریاب
آج خانہ خراب کی سی ہے

○

آفتاب خان

(لاہور)

بسر ہوئے ہیں مرے صبح وشام گردش میں
میں آ گیا ہوں سخن کی غلام گردش میں
نظر اُٹھا کے اُنہیں بھی قبول کر لیں آپ
نجانے کب سے پڑے ہیں سلام گردش میں
ابھی سے پھینک دیئے کیوں اُتار کر گھنگرو
ذرا سا ناچ طوائف ، ہیں جام گردش میں
یہاں سبھی کو کہاں اُن کی مل سکی سیتا
تمام عمر بھٹکتے ہیں رام گردش میں
نصیب ٹھیک ہے سب کا ، نظام ٹھیک نہیں
کہ لگ رہے ہیں سبھی خاص وعام گردش میں
سکوں کی نیند میسر نہیں جناب ہمیں
ہر ایک عہد میں کیوں ہیں عوام گردش میں
مجھے بھی کوئی نہ آوارگی سے اب روکے
بھٹک رہے ہیں ستارے تمام گردش میں
سُنا جسے بھی وہی گنگنا رہا ہے مجھے
قریب و دُور ہے میرا کلام گردش میں
اُسی کے گرد ستارے سبھی طواف کریں
ہے آفتابؔ سے ماہِ تمام گردش میں

○

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

موسمِ گل، بہاراں بہاراں — روحِ مضطرب، خزاں،خزاں
آنکھوں سے اشک، رواں،رواں — دھڑکتا دل، پریشاں ، پریشاں
بند ہونٹ نوحہ خواں — درِ دل پہ دستک کا گماں
اُٹھ گیا سر سے شفقت کا سائباں — ہاتھ کا رحل، دعاؤں کا گلستاں
چل بسے مکین، رہ گیا مکاں — جگمگائے گی نہ کبھی شمع فروزاں
راستے ڈھونڈیں گے قدموں کے نشاں — کاروانِ سکندر جا کے ٹھہرا قبرستاں
غم کی ماری ایک بیٹی، ایک بہن — پکارتی ہے الاماں الاماں

○

ابراہیم عدیل (جھنگ)

تیری آنکھوں کی زبانی دی ہے — جب بھی دریا کو روانی دی ہے
ٹھیک پہنی نہ گئی موسم سے — تو نے پوشاک جو دھانی دی ہے
شب کا دامن بھی تہی رہ جاتا — تیری زلفوں نے کہانی دی ہے
اک ستارے کی تمنا کی تھی — عمر بھر اشک فشانی دی ہے
بے معانی تھا سفر لفظوں کا — تو نے خوشبوئے معانی دی ہے
موسمِ گل نے بھی جاتے جاتے — خشک پتے ہی نشانی دی ہے
کچھ بھی معلوم نہیں حال ترا — دل نے تصویر پرانی دی ہے
مجھ کو تسلیم ہے یہ بات عدیؔل — زخم نے تازہ بیانی دی ہے

○

سید طاہر شیرازی (جھنگ)

- پنجابی غزل -

شوقاں سُولی چاڑے جُثّے — تھاں تھاں عشق لتاڑے جُثّے
اُٹھاں وانگ لدیندے وَتے — دُھپاں تے وی ماڑے جُثّے
دھی دے ہتھ نہ پیلے ہوئے — لُوڑ دی بھٹھی ساڑے جُثّے
یار دے راضی کرن دے کیتے — اپنے ہتھیں پاڑے جُثّے
قرضہ جان کے ماں دھرتی دا — کئی کئی وار اُگاڑے جُثّے
نفرت، لُوبھ، اَنا نے ہر دے — نرم، ملوک، وگاڑے جُثّے
مُڑوی طاہر مٹی ہو گئے — بھاویں پَل پَل جھاڑے جُثّے

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یو ایس اے)

قسط......۱۵

میں اپنے کمرے میں رمپارانی کی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا جو مجھے دیوانہ وار چومنے لگی تھی۔ وہ کبھی مرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومتی اور کبھی میرا سینہ چومتی۔ وہ مجھے چومتی جاتی اور جنونی انداز میں کہتی جاتی، مجھے یقین نہیں آ تا کہ یہ واقعی تم ہو رامو۔ یہ میرا سپنا نہیں ہے، رامو، یہ تم ہو۔ پھر اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا، اپنی دیوانی کو شدت سے پیار کرو رامو جی۔ مجھے جی بھر کے پیار کرو۔ مجھے اتنا پیار کرو کہ میں تمہارے پیار کی تاب نہ لا کر مر جاؤں۔ جواباً میں نے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا ایک لمبا بوسہ لیا تو وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر سکون سے ایسے ہانپنے لگی جیسے کسی تھکے ہارے مسافر کو منزل کا سراغ پا کر شانتی ملتی ہے۔ پھر میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کے انداز میں کہا، ہاں یہ میں ہی ہوں رمپا جی، یہ میں ہی ہوں، رامو۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک مجھ سے یوں چپٹی رہتی اگر دروازے پر ہلکی سی دستک نہ ہوتی۔ دستک نے شاید اسے مجازی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لا کر دھکیل دیا تھا اس لیے وہ میرے سینے سے ہٹ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ شاید وہ ہوٹل والوں یا کسی اور کی موجودگی میں میرے ساتھ نہیں دیکھا جانا چاہتی تھی۔ دروازہ کھولا تو ہوٹل کا عملہ میرا سامان لایا تھا۔ اسے سامان ایک جانب رکھنے کو کہا اور اس کی جیب میں چند نوٹ ڈال کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ جاتے جاتے وہ پیچھے سے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

مڑ کر دیکھا تو رمپا غسل خانے سے نکل کر واپس آ رہی تھی۔ اس کا چہرا اب بھی پہلے جیسا تھا لیکن جسم کچھ بھرا بھرا تھا۔ چار برس پہلے والی ناتجربہ کار شکل اب زمانے کے تجربات سے بہت کچھ سیکھ چکنے کے بعد کافی پختہ لگ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر میرے جسم سے چپک کر کھڑی ہو کر میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی، چار ورش میں تم پہلے سے زیادہ خوبرو ہو گئے ہو اور تمہارا قد بھی نکل آیا ہے رامو جی۔ اب تم لڑکے سے زیادہ ایک مرد لگتے ہو۔ لیکن تمہارا چہرہ اب بھی پہلے جیسا معصوم ہے۔ میں تو ائیر پورٹ پر تمہیں پہلی ہی نظر میں دیکھ کر پہچان گئی تھی۔ تم ائیر پورٹ پر کب آ ئی تھیں؟ میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ بولی۔ جس وقت تم اپنا سامان کسٹم والوں سے چیک کروا رہے تھے میں پاس کھڑی تمہیں دیکھ رہی تھی۔ دراصل میں ائیر پورٹ پر یہ دیکھنے گئی تھی کہ اس بار جسے میں نے بلوایا ہے وہ واقعی تم ہو یا کوئی اور ہے۔ تمہیں ایک نظر دیکھ کر میں پہچان گئی تھی۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ چار ورش بعد تمہیں اتنے قریب دیکھ کر مجھے خود پر قابو نہیں رہے گا اور میں اپنے چاکر کے سامنے بے قابو ہو کر اپنے ہوش نہیں کھونا چاہتی تھی اس کارن تم سے پہلی بار تنہائی میں ملنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے چاکر سے کہا کہ مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر تمہیں ائیر پورٹ سے ہوٹل لائے۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے میں نے یہاں دو کمرے بک کروائے۔ ایک کمرہ اپنے لیے اور دوسرا تمہارے لیے۔ اپنے کمرے کی چابی کے ساتھ تمہارے کمرے کی ایک چابی لے کر تمہارے کمرے میں آ کر تمہارا انتظار کرنے لگی اور تم نے دیکھا کہ تمہیں اتنے قریب دیکھ کر میں کتنی دیوانی ہو گئی تھی۔

وہ اب بھی میری آنکھوں میں دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پاس پڑے ہوئے صوفے پر بٹھاتے ہوئے حیرانی سے پوچھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے تم نے بلوایا ہے۔ مجھے تو نیتو اور وکرم نے اپنے کسی انکل رمیشن کے لیے بلوایا ہے۔ ہنس کر کہنے لگی، رمیش میرے پتی ہیں۔ اوہ اچھا، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اب یاد آیا کہ مجھے باپو نے راجہ رمیش کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ جنوبی افریقہ میں ہیروں کی کانوں کے حصہ دار ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔ ویسے تو وہ میرے قریب صوفے پر بیٹھی تھی لیکن اس کے جسم کا سارا بوجھ میرے جسم پر تھا اور اس کی آنکھیں مسلسل مجھ پر لگی تھیں۔ کہنے لگی اب میں تمہیں سانپ کے ڈسے جانے سے دل کے ڈسے جانے تک کی چار ورش لمبی داستانِ ہجر سناتی ہوں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی وارفتگی دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد مجھے اپنے بارے میں اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اچھا خاصا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے جذبات کی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہ ہوتی جب تک وہ اپنا سب کچھ مجھ پر اُگل نہ دیتی۔ اس لیے میں نے اسے بڑے پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا تم نے کچھ کھانا پینا ہو تو میں منگواؤں۔ کہنے لگی، میں تو تمہارے پیار کی بھوکی اور پیاسی ہوں رامو جی۔ تم بس اپنی داسی کو پیار کرو۔ مجھے اتنا پیار کرو کہ میری صدیوں کی بھوک اور پیاس مٹ جائے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے لب میرے ہونٹوں پر رکھ دئے جس کا جواب میں نے اسی گرمجوشی سے دیا۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھی اور مجھے اپنی گود میں سر رکھنے کو کہا جس کی میں نے تعمیل کی۔

ایک گہری لمبی اور پُر مسرت سانس لینے کے بعد اس نے اپنی چار برسوں پر مشتمل داستان شروع کرتے ہوئے کہا، انیس اپریل کا وہ دن مجھے کبھی نہیں بھولے گا رامو جی، کبھی نہیں بھولے گا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اسے وہ تاریخ تک یاد تھی۔ میں نے آگے سے لقمہ دیا۔ اس روز تم نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور ساڑی پر سنہری کام والا سفید رنگ کا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ تمہیں میرا لباس تک یاد ہے وہ خوشی سے کچھ اور زیادہ جذباتی ہو کر چہچہائی۔ کل تک میں یہ سوچ سوچ کر ڈر رہی تھی کہ شاید میں تمہیں یاد بھی نہ ہوں گی۔ پر میرا من کہتا تھا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں اگر اس کے لیے اتنی دیوانی ہوں تو وہ بھی مجھے نہیں بھولا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر میرے ہونٹ چومتے ہوئے کہا، اُس روز میں پانی میں پھسلی اور میرے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ میرے پاس اور کپڑے تو تھے لیکن

باڈی ایک ہی تھی جسے جھاڑیوں پر دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالا تھا۔ خشک ہونے کے بعد اسے اٹھا کر پہننے لگی تو اس میں چھپے سانپ نے مجھے کاٹا تھا۔ سانپ کو تو خیر چاکروں نے اسی وقت مار دیا لیکن درد تھا کہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ تمہیں تتلی سانپ نے کاٹا تھا جس کی رنگت سبز تھی اور کسی پنسل کی طرح پتلا اور اتنا ہی لمبا تھا۔ ہے نا؟ میں نے پوچھا۔ پتہ نہیں کچھ ایسا ہی سانپ تھا۔ تم اتنے سالوں بعد سانپ کی شکل وصورت کے بارے میں مجھے ایسے بتا رہے ہو جیسے تم نہ صرف اسے جانتے ہو بلکہ تم نے ہی اسے مجھے ڈسنے کو بھیجا تھا، اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر بولی، وقت کے ساتھ درد تیز سے تیز تر ہوتا گیا تو جھیل پر لوگوں نے ہمیں تمہارے ہاں جانے کا مشورہ دیا۔ جب تمہارے پتا نے میرا زخم دیکھنے کی بجائے تمہیں یعنی اپنے بچے کو سکول سے بلوایا تو میں اور زیادہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ لو اب میرا علاج کل کا ایک لونڈا کرے گا۔ وہ باپو کو میرا پتا سمجھ رہی تھی۔ میں نے بھی اس کی تصحیح کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی، خیر تم آئے اور پہلی نظر میں مجھے اچھے لگے تھے۔ تمہارا بھولا بھالا چہرہ اور تمہاری آنکھیں، ہائے رام کیا بتاؤں؟ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، قاتل ہیں قاتل۔ تم میرا عریاں بدن دیکھ کر کچھ دیر کو جیسے سن ہو گئے تھے۔ ہاں میں نے اقرار کرتے ہوئے کہا، تمہارا بدن میری زندگی کا پہلا اور آخری بن لباس کے دیکھا ہوا بدن تھا۔ جو میری آنکھوں کو خیرہ اور میرے ذہن کو سُن کرنے کے لیے کافی تھا۔ اگر میں کوئی سنگ تراش ہوتا تو تمہاری مورتی بنا کر بھوانی کے مندر رکھ آتا۔ اچھا، تمہیں میرا بدن اتنا بھایا تھا؟ اس نے چہک کر پوچھا۔ ہاں یہ سچ ہے میں نے سچائی سے اقرار کیا تو اس نے جذباتی لہجے میں کہا، اچھا تو یہ بدن اب تمہارا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ تم اسے جی بھر کر دیکھو اور اسے اپنی مرضی سے جیسے چاہو جب چاہو اور جہاں چاہو برتو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کرتا اور بلاؤز اتار کر پاس پڑی ہوئی کرسی پر پھینک دیا۔ اگر میں اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ پہلے سے نہ لگا چکا ہوتا تو اس کی حرکت پر میرا ردِ عمل شاید کچھ مختلف ہوتا۔ اس کی اس حرکت پر مجھے قطعی کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ میں خاموش رہا۔

ایک بار پھر اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ہائے رام کیا بتاؤں، جب تم نے میرے اندر سے سانپ کا زہر چوسنا شروع کیا تو مجھے یوں لگا جیسے تم میرے اندر اپنے عشق کا رس گھول رہے تھے۔ تم نے مجھے سانپ کی تکلیف سے بچا کر اپنے عشق کے روگ میں مبتلا کر دیا تھا۔ تم بڑے ظالم ہو جانی۔ اور جانی کیا بتاؤں تمہارے ہونٹوں کے اُس لمس کے سہارے میں نے اپنے چار ورش کیسے گزارے ہیں؟ ہر رات مجھے اپنے سینے پر تمہارے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوتا تو میں سوچتی تھی کہ کیا کبھی وہ لمس اس جیون میں مجھے پھر نصیب ہوگا؟ اسی لمس کی امید پر اتنے عرصے تک ہر رات کو تڑپتی رہی ہوں۔ مجھے وہ لمس آج پھر سے دے دو جانی۔ اس نے اپنا سینہ میرے منہ پر جھکا دیا اور میں اس کی خواہش پوری کرنے لگا۔ رمپا کا بدن کسی انگیٹھی کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک جذباتی آوازیں نکالتی رہی پھر ذرا سنبھلنے کے بعد بولی، اس روز سانپ کے زہر سے تمہارا اُترا ہو چہرہ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میری ایما پر میرے پتی نے تمہارے پتا سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گے، زہر کا اثر صبح تک جاتا رہے گا۔ جب تمہارے پتا نے کچھ رقم لینے سے انکار کر دیا تو میں جانے سے پہلے اکیلے میں تمہارے پاس آئی تمہارا منہ چوما اور اپنی انگوٹھی تمہاری جیب میں اڑس کر چلی گئی۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے انگوٹھی دکھاتے ہوئے کہا، یہ رہی تمہاری انگوٹھی۔ وہ میری چھوٹی انگلی میں اپنی دی ہوئی انگوٹھی دیکھ کر چہکی، تم نے اب تک یہ سنبھال کر رکھی ہے۔ لگتا ہے تم بھی میری آگ میں ویسے ہی جل رہے ہو جیسے میں تمہاری۔ میں اُسے نہ بتا سکا کہ اس کی دی ہوئی یہ انگوٹھی چار سال تک ایک گھڑے میں پڑی رہی تھی۔ رمپا نے اپنی کہانی آگے بڑھائی۔ تمہارے ہاں سے چلی تو گئی لیکن اپنا دل تمہاری کٹیا میں چھوڑ گئی۔ تمہیں اپنا نام بھی میں نے تمہاری نیم غشی کے عالم میں بتایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ غشی کے باعث تمہیں میرا نام سنائی بھی دیا تھا یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ دوسرے روز درد کا بہانہ بنا کر اپنے پتی سے کہوں گی کہ وہ مجھے تمہارے ہاں لے جائے۔ لیکن وہ میرے سانپ کاٹے کی وجہ سے سندر بن کے علاقے سے کچھ ایسا بدکا کہ اسی وقت واپسی کا قصد کیا۔ مجھے تمہارے بارے میں تمہارے نام کے علاوہ اور کچھ علم نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میں اس علاقے کا نام بھی سندر بن کی حد تک جانتی تھی۔ جتنا میں سندر بن سے دور ہوتی گئی میرے اندر کی اگنی تمہارے لیے اتنا زیادہ بھڑکتی گئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم سے پھر کیسے اور کن حالات میں ملاقات ہوگی۔ لیکن میں نے اپنے من میں تمہیں ہر قیمت پر پانے اور پا کر اپنانے کا اٹوٹ ارادہ کر لیا تھا۔ میرے من میں تمہاری یاد کو تازہ رکھنے کا بہانہ سانپوں سے متعلق تھا۔ اس لیے میں نے یہاں پہنچتے ہی ہر ہفتے بازار سے بے ضرر سانپ خرید کر رمیش لاج میں چھوڑنے شروع کر دئے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ میں اپنے پتی کے سامنے ہندوستان سے آنے والے مہمانوں سے سپیروں کے بارے میں پوچھتی اور میری تان سندر بن پر آ کر ٹوٹتی۔ اگر میرا ہندوستان سے آیا ہوا کوئی مہمان مجھے بتاتا کہ وہ سندر بن کے علاقے میں رہ چکا ہے یا اس نے سندر بدن کا علاقہ دیکھا ہوا ہے تو میں اس سے پوچھتی کہ کیا وہ وہاں پر کسی اچھے سپیرے کو جانتے ہیں؟ پھر انہیں رمیش لاج میں سانپوں کی مسلسل یلغار کے بارے میں اس امید پر بتاتی کہ اس علاقے سے کچھ جانکاری رکھنے والا میرا کوئی مہمان شاید تمہیں یا تمہارے پتا کو پہچانتا ہو۔

لیکن مجھے ہر بار ناکامی ہوئی۔ دوسرے سال میں نے اپنے پتی سے سندر بن لے جانے کی ضد کی تو وہ مان گیا۔ لیکن عین وقت پر اتنا بیمار پڑا کہ ہمیں اپنا سارا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ انیس اپریل یعنی ہماری ملاقات کی پہلی سالگرہ کی شب میں نے اپنے کمرے میں تمہاری یاد کا دیپ جلایا تھا اور وہ ساری رات میں نے جاگ کر کاٹی تھی اور تمہیں سوچتی رہی تھی کہ ایک سال بعد تم کیسے لگتے ہو گے۔ اُس رات میں نے پرارتھنا کی کہ کاش مرنے سے پہلے مجھے ایک بار صرف

ایک بار تمہارا قرب مل جائے۔ بیماری کے بعد میرا پتی کہیں آنے جانے کے لائق نہیں رہا تھا اس لیے ان کے ساتھ سندر بن جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے ورش میں نے اکیلے سندر بن آنے کا پروگرام بنایا لیکن نہیں جا سکی۔ اس کے بعد سے اب تک ہر انیس اپریل کی رات کو تمہاری یاد اور ملن کا دیپ جلا کر تم سے ملنے کی پرارتھنا کرتی رہی ہوں اور تمہارے لیے ایک تحفہ لے کر پدمنی کے حوالے کرتی رہی ہوں۔ پدمنی وہی عورت ہے جو سانپ کاٹنے کے دن میرے ساتھ تھی۔ وہ میری ماں جیسی ہے اور اسے میرے من کا سارا بھید معلوم ہے۔ چار ورش پہلے جب میں نے تمہیں دیکھا تھا اس وقت تمہاری مسیں پھوٹ رہی تھیں۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تم سکول جاتے ہو لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ تم اب بھی وہاں ہو یا کہیں اور چلے گئے ہو۔ سپیرے لوگ ایک جگہ کب ٹکتے ہیں۔ میں نے ہر ہفتے مندروں، درگاہوں اور مسجدوں میں جا کر دیپ جلائے اور تمہارے ملن کی منتیں مانی ہیں۔

ایک بار تو ہمارے ایک ہندوستانی مہمان نے ہمیں بتایا کہ وہ رامو نامی ایک سپیرے کو جانتا ہے۔ میں نے اسی وقت اسے بلوانے کے تمام انتظامات کیے۔ بلوانے پر اس رامو کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ رامو میرے پتی کی عمر کا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا، اس رامو نے رمیش لاج پر کچھ جنتر منتر کیے لیکن حویلی کے سانپ کم نہ ہوئے۔ اس واقعے کے بعد میں نے کسی رامو کو بلانے سے پہلے اس کے بارے میں جانچ پڑتال کرنا شروع کر دی۔

تین ہفتے پہلے وکرم بابو اور نیتو ہمارے ہاں آئے تھے۔ ان کے آنے کے دوسرے روز میں نے بازار سے خرید کر رمیش لاج میں سانپ چھوڑے اور پھر اسی حوالے سے سندر بن کا ذکر چھیڑا تو وکرم جی نے بتایا کہ رامو نامی ایک لڑکے نے نیتو کو سانپ کی کاٹ سے اپنا خون دے کر بچایا تھا تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ رامو نامی سپیرا نیتو کے ساتھ کانونٹ کالج میں پڑھتا ہے تو میں نے سوچا کہ وہ یقیناً تم نہیں ہو سکتے۔ کہاں ایک غریب سپیرا اور کہاں کانونٹ کالج۔ لیکن مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے نیتو سے دوستی بڑھائی۔ اسے اپنے ساتھ شاپنگ اور سیر پر لے جا کر رامو سپیرے کے بارے میں کرید کرید کر ایسے انداز میں سوال کرتی رہی کہ اسے کسی قسم کا شک نہ ہو۔

نیتو نے سانپ کے کاٹنے اور رامو کے ساتھ جھیل پر لڑائی کے بعد رامو کے گھر جانے کے بارے میں مجھے بتایا تو میں نے اس سے رامو کے گھر کا نقشہ پوچھا۔ وہ جوں جوں اپنے رامو کے گھر کا نقشہ بتانے لگی میں توں توں سن کے پاگل ہونے لگی۔ وہ مجھے میرے رامو کے گھر کا نقشہ بتا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ رامو کو اپنے دل کے مندر میں رکھ کر پوجتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے ماتا پتا ایک جھونپڑی میں پلنے والے لڑکے کو اپنی نازوں پلی اکلوتی بیٹی کیونکر دیں گے؟ تو نیتو نے جواب دیا تھا، جھونپڑی میں پلنا بڑھنا کوئی عیب تھوڑی ہے۔ رام چندر جی نے بن باس کے چودہ ورش بھی تو جھونپڑی میں گزارے تھے۔ میری ممی اور پاپا بھی رامو کو پسند کرتے ہیں۔ میری ممی کہتی ہیں کہ رامو پربھو ہے اور میرے پاپا کہتے ہیں کہ مجھے اپنی بیٹی کے لیے رامو سے بہتر لڑکا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ میں نے پورا ہفتہ نیتو پر سرف کیا اور ایک ہفتے میں اس نے مجھے اپنے رامو کے بارے میں اپنے من میں چھپی ایک ایک بات بتائی۔

پھر ایک دن نیتو نے اپنے پرس سے اپنے رامو کا ایک فوٹو نکال کر مجھے دکھایا۔ فوٹو دیکھ کر میں تو جیسے باؤلی ہو گئی۔ وہ مجھے میرے رامو کا فوٹو دکھا رہی تھی۔ وہی سبز آنکھیں وہی گھنگھریالے بال اور وہی معصوم چہرہ۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے تمہاری تصویر چومے بنا نیتو کو واپس کر دی۔ اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ نیتو اور میں ایک ہی رامو کی اسیر ہیں۔ رامو جی، نیتو اگر تمہیں مجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں چاہتی۔ وہ تمہاری دیوانی ہے اور تمہارے گن گاتی ہے رامو۔ تمہاری شخصیت ہی ایسی ہے۔ تم جادوگر ہو۔ یہ کہتے ہوئے رمپا نے اپنے بدن کو میرے چہرے پر گرا دیا۔ میرا سر ابھی تک اس کی گود میں رکھا تھا۔

نیتو نے اگرچہ رمپا کو اپنے من کے بھیتر ساری باتیں بتائی تھیں مجھے ایک بات کی خوشی ہوئی کہ اس نے پنچھی والا واقعہ رمپا کو نہیں بتایا تھا۔ میرے لیے یہ بھی ایک نئی خبر تھی کہ نیتو مجھے دیوانہ وار چاہتی ہے اور مجھے اپنا دیوتا سمجھتی ہے۔ میرے خیال میں ہم ایک دوسرے کے قریب تھے اور بس۔ نیتو نے یہ سب کچھ مجھ پر شاید اس لیے بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ میں نے اپنے لیے ایک حد قائم کر رکھی تھی۔ ایک معمولی سپیرے کا ایک ارب پتی باپ کی اکلوتی بیٹی کی محبت میں مبتلا ہو جانا کم از کم میرے لیے مشکل کام تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں اپنی حد سمجھتا تھا بلکہ اپنی حد میں رہنا بھی جانتا تھا۔ نیتو نے اپنے من کا حال رمپا کو اپنی سہیلی اور ہمراز سمجھ کر بتایا تھا۔ اس کے گمان تک میں یہ بات نہ ہو گی کہ اس کے دل کی بات رمپا کے ذریعے مجھ تک پہنچے گی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ نیتو کے پاس میری کوئی تصویر رکھی رہتی ہے۔ یہ تصویر اس نے شاید پاسپورٹ والے فوٹوؤں میں سے لی ہو گی۔

مجھے نیتو کے خیالات سے رمپا کی آواز نے نکالا جو کہہ رہی تھی اسی روز میں نے بازار سے کئی سانپ لا کر گھر میں چھوڑ دیے۔ زیادہ سانپوں کی موجودگی نے رمیش لاج کو زیادہ سانپ زدہ کر دیا تو میں نے نیتو سے بنتی کی کہ وہ اپنے پاپا سے کہہ کر جتنی جلدی ہو سکے تمہیں یہاں بلوائے۔ میری ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور انہوں نے تمہیں یہاں بلوایا۔ تمہاری ٹکٹ میں نے خود بنوائی اور جان بوجھ کر اپنی کاروباری ذمہ داری کا بہانہ بنا کر میں نے نیتو سے کہا، چونکہ رامو کی آمد کے روز میں ڈربن میں ہوں گی، اس لیے میں تمہارے رامو کو ائیرپورٹ سے کمبرلی لاؤں گی تو نیتو میری بات مان گئی۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ اس بار میں اپنے رامو کو بلا رہی ہوں۔ میں تمہیں ائیرپورٹ پر دیکھ کر ایک بار پھر تسلی کرنا چاہتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر ہوٹل آئی اور اپنے چاکر سے تمہیں یہاں لانے کو کہا۔ چاکر کے جانے کے بعد اور تمہارے ہوٹل آنے سے پہلے میں نے کمبرلی فون کر کے نیتو کو بتایا کہ تم

یہاں خیریت سے پہنچ چکے ہو۔ نیتو کمبرلی سے کہیں اور جانے والی تھی اس لیے وہ تم سے ضروری بات کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے جھوٹ بتایا کہ تم سفر کی تھکاوٹ سے ہوٹل کے کمرے میں آتے ہی سو گئے ہو تو اس نے تمہیں سوتے سے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے نیتو کو بتایا تھا کہ تمہاری تھکاوٹ کی وجہ سے ہم آج کی بجائے کل کمبرلی کے لیے روانہ ہوں گے۔ میں نے اسے تمہارے کمرے کا نمبر دے دیا ہے۔ وہ کل صبح تم سے فون پر بات کرے گی۔

تمہیں کمبرلی لے جانے سے پہلے ہی میں تمہارے قرب سے اپنے من کی اگنی بجھانا چاہتی تھی۔ جانی، مسلسل چار ورش سے اپنی دیوانی کے تپتے ہوئے بدن کو اپنی جوابی محبت کی صبا سے ٹھنڈا کر دو۔ وہ صوفے سے اٹھتی ہوئی بولی، چلو بستر پر چل کر لیٹتے ہیں۔ اس کے بدن کے اوپر کا لباس پہلے ہی اتر چکا تھا۔ بستر پر پہنچنے سے پہلے اس نے اپنی سکرٹ بھی اتار کر فرش پر پھینک دی اور مجھے بستر پر ڈھیر کر لیا۔ پھر وہ میرے جسم سے کھیلنے لگی اور وہ سب کچھ ہوا جو وہ چاہتی تھی۔ ایک بار نہیں بار بار۔ ہر بار اپنی آگ ٹھنڈی کر کے اس کے چہرے پر کسی ایسے فاتح جیسی مسکراہٹ ہوتی جس نے کوئی بہت بڑا قلعہ غیر متوقع طور پر فتح کیا ہو۔

اپنے جذبات کی اگنی بجھوانے کے دوران اس نے اپنی کہانی بھی وقفوں سے جاری رکھی۔ جذباتی لہجے میں بولی، آج سے چار ورش پہلے انیس اپریل کو میں نے جو سوچا تھا اور اس کے بعد سے ہر رات جو سپنا دیکھا تھا وہ آج پورا ہوا ہے۔ آج میری اکیسویں سالگرہ ہے اور تم میرے جیون کے پہلے مرد ہو۔ تمہارا قرب میرے لیے سہاگ رات اور میری سالگرہ کا ایک انمول تحفہ ہے۔ پھر بولی، تم نے میرے پتی کو تو دیکھا تھا۔ جس وقت میں سولہ ورش کی تھی اس کی عمر بہتر کی تھی۔ جوانی میں تو وہ ہر سال سولہ ورش کی نئی پتنی لاتا اور انیس سال والی کو چلتا کرتا تھا۔ مجھے بیاہ لایا تو مجھے معلوم ہوا کہ اب اس پر سلاجیت، کُشتے اور پلنگ توڑ گولیاں بھی اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس لیے اس نے میرے بعد کسی اور سے بیاہ نہیں رچایا۔ اس کھسرے کی بس ایک چھوکری ہندوستان میں بیاہی ہوئی ہے۔ پہلے تو باپ بیٹی کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ اب کہیں جا کر نواسی کی وجہ سے ان کی آپس میں کچھ صلح صفائی ہوئی ہے۔ کل اس کی بیٹی اور نواسی یہاں آئے ہیں۔ میرا پتی اب اَسّی کے پیٹے میں ہے اور اب تو بالکل ایک گوشت کے لوتھڑے کی مانند جیوے ہے۔ اس کا جیون بھی میرے کارن ہے۔ اس کو ٹھس ہونے میں کوئی دیر نہیں۔ اس کی ساری جائیداد، کاروبار اور پیسے کی میں ہی اکیلی وارث ہوں۔ رامو جی! میں تمہیں اس سنسار کا سب کچھ دینے کو تیار ہوں اگر تم میرے ہو جاؤ۔ اور ہاں میں نے اپنی عمر یا ایک ایسے مرد کے ساتھ گزاری ہے جو ایک وقت میں دس دس پتنیوں کے علاوہ کئی کئی رکھیلیں بھی رکھتا تھا۔ اس لیے تم اپنے لیے نیتو کے علاوہ اور بھی جتنی استریاں چاہو رکھ سکتے ہو۔ مجھے کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں تمہاری داسی بن کے رہوں گی۔ اپنی بھرپور تسلی کروانے یا سیر شدہ ہونے کے بعد رمپا اٹھتے ہوئے بولی، تمہارا ملاپ میرے جیون کی سب سے بڑی آشا تھی جو آج بھگوان نے سپھل کر دی، اب مجھے مرنے کا دکھ نہ ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے تمہارے کمرے میں دیکھے اس لیے میں اب اپنے کمرے میں جا کر آرام کرتی ہوں۔ ہم لوگ کل صبح کمبرلی کے لیے روانہ ہونگے۔ میرے سامنے کپڑے پہن کر وہ اپنے بال ہاتھوں سے سنوارتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے میں رکھی گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں ہوٹل میں دن کے ساڑھے گیارہ بجے پہنچا تھا۔ یعنی پچھلے ساڑھے بارہ گھنٹے میں رمپا کی زیرِ حراست تھا۔ اپنے بستر پر پڑا سوچتا رہا کہ میں یہاں کس چنگل میں آن پھنسا ہوں۔ میرے تجربے کے مطابق رمپا ایک خطرناک عورت تھی جس کی تمام عمر اپنے گرد طواف کرتے گزری تھی۔ اس کے خیال کے مطابق سارا جگ اسی کے گرد محوِ گردش تھا۔ اس کی سوچ کی حد بھی اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد ایک ایسا خود ساختہ شیش محل تعمیر کیا ہوا تھا جس میں اسے ہر زاویے سے اپنے علاوہ کوئی اور نہیں دِکھتا تھا۔ اسی کارن وہ خود یقینی سے کوئی بھی بات خود کو باور کرا لیتی تھی۔ اگر وہ حادثاتی طور پر میری محبت میں مبتلا ہو بھی گئی تھی تو اس نے مجھ سے ایک بار بھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ آیا میں بھی اس سے جوابی محبت کرتا ہوں۔ محبت دو کے درمیان ہوتی ہے۔ یک طرفہ محبت کو وسواس یا انگریزی میں Obsession کہتے ہیں۔ جو ایک بیماری ہے۔ وسواسی لوگ اپنے من کی مراد پانے کے لیے جھوٹ، مکر، فریب، لالچ، دھمکی جیسے ہتھیار عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ رمپا نے جھوٹ کا سہارا لے کر اپنے گھر میں ناگ چھوڑنے شروع کیے۔ پھر اسی جھوٹ کے سہارے نیتو سے اپنی دوستی کی پینگیں بڑھائیں۔ اس معصوم لڑکی کو استعمال کر کے مجھے یہاں بلوایا۔ پھر نیتو سے جھوٹ بولا میں سو رہا ہوں۔ اس کے برعکس نیتو نے جب سنا کہ میں سو رہا ہوں تو اس نے میرے آرام کا خیال رکھتے ہوئے مجھے سوتا رہنے دیا۔ اور پھر جس سے جتنی زیادہ محبت کی جاتی ہے اس کا اتنا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ پچھلے ساڑے بارہ گھنٹے میں اس نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا تھا کہ میرا سفر کیسے کٹا، مجھے بھوک یا پیاس تو نہیں لگی یا میں اٹھارہ گھنٹے کے تھکا دینے والے طویل ہوائی سفر کے بعد ذرا نہا کر تازہ دم ہو لوں یا کم از کم اپنے کپڑے ہی تبدیل کر لوں۔ یہاں تک کہ جاتے جاتے بھی وہ اپنے آرام کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس کے تجربے کے مطابق ہر مرد کی کمزوری یا تو اس کی ٹانگوں کے بیچ ہوتی ہے یا اس کی تجوری میں۔ وہ مجھے اپنی دولت کا اور دوسری عورتوں سے اپنے تعلقات رکھنے کا لالچ بھی دے گئی تھی۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں ایک سے زیادہ عورتیں رکھنے کے لالچ میں یا کروڑوں کی جائیداد کے چکر میں آ کر اس کی بات مان لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا کام لالچ سے نہیں نکلے گا تو وہ مجھے دھمکانے سے بھی باز نہیں آئے گی۔ اگر میری کسی حرکت سے اس پر یہ بات کھلتی کہ میں اس کی محبت کا جواب اس کی توقع کی عین مطابق نہیں دے رہا تو وہ مجھے دھمکانے اور نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہ کرے گی۔ وسواسی لوگوں کی یہی

باتیں ان کو دوسرے لوگوں کے لیے خطرناک بنا دیتی ہیں۔ وہ اپنی من مانی کرنے کے لیے کسی بھی جرم کا اور کسی بھی فعلِ بد کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں آتے۔ وسواسیوں کی چاہت اور ان کی نفرت دونوں خطرناک ہوتی ہیں۔ میں اس وقت اس کی خطرناک چاہت کا شکار تھا۔ اس دیارِ غیر میں اس کی نفرت مول لے کر اپنے اور اپنے پیاروں کے لیے کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو کسی صورت تیار نہیں تھا۔ سانپوں کے ڈسے پانی تو مانگتے ہیں، وسواسیوں کے ڈسوں کو تڑپنے کے لیے بھی وقت نہیں ملتا۔ مجھے آگے کا ہر قدم سنبھل کر رکھنا تھا۔ میرے آگے اب سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح اس بلا سے اپنی جان اور دامن بچا کر ہم تینوں ہندوستان واپس جائیں۔ نیتو اور وکرم نے انجانے میں اپنے اور میرے لیے جو مصیبت کھڑی کی تھی وہ میں انہیں بتائے بنا دور کرنا چاہتا تھا۔ کیسے؟ میرا ذہن اس سوال کا جواب سوچنے سے عاری تھا۔

پیاس لگی تو کچھ پینے کی طلب میں میں نے کمرے میں رکھے ہوئے فریج کو کھولا تو سامنے روسی شراب (واڈکا) کی ایک بوتل رکھی تھی۔ اب سے پہلے میں جب بھی کسی ذہنی کوفت سے گزرتا تو بابو مجھے دارو پلا دیتے جو مجھے سکون سے سلا دیتی تھی۔ اب سے پہلے میں نے اپنی کٹیا سے باہر شراب نہیں پی تھی۔ آج پہلی بار میں نے گھر سے باہر شراب کی بوتل کھولی اور قریب پڑے ہوئے گلاس میں انڈیل کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ ایسے میں مجھے احساس ہوا کہ میرا بدن ابھی تک کپڑوں سے بے نیاز تھا۔ کمرے کے قالین پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر پہنے اور بستر پر نیم دراز ہو کر تلخ واڈکا کی ساری بوتل ختم کی۔ شراب کے اثر سے میرے جسم کا اکڑاؤ ڈھیلا ہونا شروع ہو گیا اور واڈکا کی تلخی نے ذہن کی تلخی پر قابو پانا شروع کیا اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

کچھ کھانے کی شدید خواہش سے میری آنکھ کھلی تو گھڑی دن کے نو بجا رہی تھی۔ فون پر اپنے کمرے میں ناشتا منگوایا اور غسل خانے میں نہانے اور شیو کرنے کے لیے داخل ہوا تو مجھے یاد آیا کہ میرا سامان ابھی تک پچھلی رات سے دروازے کے قریب جوں کا توں رکھا تھا۔ سوٹ کیس کھول کر اپنے لیے کپڑے نکالے اور بیگ سے شیو اور ہائی جین کا ضروری سامان نکال کر غسل خانے میں جا کر شیو کرنے اور دانت صاف کرنے کے بعد ٹھنڈے پانی سے دیر تک نہاتا رہا۔ جھرنے کے نیچے نہانے کی عادت کی وجہ سے مجھے سردیوں میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہانا بھلا لگتا تھا۔ نہانے کے بعد تیار ہو کر باہر آیا تو ناشتہ کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ چونکہ ابھی کسی وقت ہوٹل چھوڑ کر جانا تھا اس لیے میں نے اپنا سارا سامان بیگ اور سوٹ کیس میں واپس رکھ کر سوٹ کیس بند کیا اور ناشتہ کرنے لگا۔

ابھی ناشتہ ختم ہی نہیں کیا تھا کہ کمرے کے فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو دوسری جانب نیتو تھی۔ اس نے سفر کے بارے میں پوچھا، تو میں اسے کچھ نہیں بتا سکا۔ اس لیے سب اچھا کی رپورٹ دی۔ کہنے لگی، میں نے کل تمہیں فون کیا تھا مگر تم سفر کی تھکن کی وجہ سے سو رہے تھے۔ تمہاری پہنچ کی اطلاع میں نے ہندوستان فون کر کے ممی کو دے دی ہے۔ اور کل فون کرنے کی دوسری وجہ یہ کہ میں نے تمہیں بتانا تھا کہ پاپا اور مجھے اچانک مصر جانا پڑ رہا ہے۔ ہم کل کمبرلی سے نکل آئے تھے اور میں اس وقت جوہانس برگ کے ائیر پورٹ سے بول رہی ہوں۔ ہمارا جہاز ایک گھنٹے میں قاہرہ کے لیے پرواز کرنے والا ہے۔ میں نے کہا تمہارے بنا میں ان اجنبی لوگوں میں کیا کروں گا؟ کہنے لگی تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔ رمپا میری بڑی اچھی سہیلی ہے وہ تمہیں اس ملک میں کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں ہونے دے گی۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے یہاں رمپا کی موجودگی سے تو گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ پھر بولی، پاپا نے تمہارا قاہرہ کا ٹکٹ بنوانے کے لیے رمیش جی کے منشی جمال سے کہہ دیا ہے۔ تم ایک ہفتہ بعد ہمیں قاہرہ میں ملو گے۔ پھر اس نے مجھے قاہرہ میں اپنا ایک فون نمبر لکھواتے ہوئے بتایا اگر تمہارے پروگرام میں کوئی تبدیلی ہو تو مجھے قاہرہ میں اس نمبر پر فون کر کے اطلاع کر دینا۔ اس بار قاہرہ کے ائیر پورٹ میں خود تمہیں لینے آؤں گی۔ وعدہ۔ میں نے کہا، تم نے پاپا کو قاہرہ جانے دیا ہوتا اور خود میرے ساتھ ایک ہفتہ بعد قاہرہ چلی جاتیں۔ وہ بولی دراصل یہ معاملہ بنک سے رقم اپنے ملک بھجوانے کا ہے اور بنک کا اکاؤنٹ میرے نام ہے اس لیے میرا جانا ضروری ہے۔ اگر رقم وقت پر نہ پہنچی تو کاروبار میں گھپلا ہو جائے گا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا اس کی آواز آئی، اچھا اب میں فون بند کرنے لگی ہوں۔ ہم اس وقت جہاز میں بیٹھنے جا رہے ہیں۔ اس نے فون بند کیا تو مجھے ایک خوشی ہوئی کہ کم از کم نیتو اور وکرم رمپا جیسی بلا سے محفوظ ہو گئے تھے۔ اب مجھے کسی نہ کسی طرح ایک ہفتے تک اس مصیبت کو سنبھالنا تھا۔

فون رکھ کر میں نے ناشتہ ختم کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ اس بار موہن بول رہا تھا، سر میں لابی میں ہوں۔ آپ بھی لابی میں آ جائیں رانی صاحبہ کے آتے ہی ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔ میں اپنا سامان اٹھا کر لابی میں آیا تو موہن بولا، سر رانی صاحبہ ابھی تک کمرے میں ہیں۔ میں نے موہن سے کہا، ان کے کمرے میں فون کر کے انہیں بتا دو کہ ہم تیار ہیں۔ اس نے میری جانب ایسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، آپ خود فون کریں۔ میں نے لابی کے کاؤنٹر سے فون اٹھاتے ہوئے موہن سے پوچھا، رانی جی کون سے کمرے میں ہیں۔ 1502 کمرے میں، اس کی بجائے کاؤنٹر کلرک نے جواب دیا۔ یعنی پندرہ منزل کے دوسرے سویٹ میں ہیں۔ میں نے رانی کے کمرے کا فون نمبر ملایا دوسری جانب دیر تک گھنٹی بجتی رہنے کے باوجود کسی نے فون نہیں اٹھایا تو میں نے موہن سے کہا، کچھ دیر بعد پھر کال کریں گے۔ ہم لابی میں بیٹھے رہے۔ پھر میں نے ہر پندرہ منٹ بعد فون کیا لیکن آگے سے فون کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا لیکن رمپا کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔

آخر تنگ آ کر میں نے کلرک سے کہا کہ پچھلے دو گھنٹوں سے رانی کے کمرے کے فون سے کوئی جواب نہیں آ رہا اس لیے مجھے ان کے کمرے کی چابی دیں تا کہ میں وہاں جا کر دیکھ آؤں۔ کلرک کہنے لگا ہم کسی غیر کو اپنے مہمان کے

کمرے کی چابی نہیں دیتے۔ میں نے جواب دیا کہ میں کوئی غیر نہیں ہوں ان کے ساتھ ہوں۔ انہوں نے ہی کل میرے لیے کمرہ بک کروایا تھا۔ اس نے کہا، وہ تو ٹھیک ہے سر، اس کے باوجود ہم ان کے کمرے کی چابی آپ کو نہیں دیں گے۔ میں نے کہا، اچھا آپ ہمیں چابی نہ دیں اپنا کوئی آدمی چابی دے کر ہمارے ساتھ ان کے کمرے تک بھیج دیں تا کہ ہم دیکھیں کہ آیا وہ کمرے میں ہیں بھی یا نہیں۔ اس پر وہ راضی ہو گیا۔ ہم ہوٹل کے ایک چابی بردار ملازم کی معیت میں کمرے کے دروازے پر پہنچے تو اس نے چابی ڈال کر دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے پہلے دروازے پر دستک دے کر چند لمحے انتظار کیا۔ کوئی جواب نہ آنے کی صورت میں دروازہ کھول کر دیکھا تو رمپا کو اپنے بستر پر بڑے سکون سے سوتے ہوئے پایا۔ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھ کر میں اس کے بستر کے قریب پہنچا اسے ایک بار پھر آواز دی۔ لیکن اس نے کوئی جنبش نہ کی۔ دوسری بار میں نے اسے رانی جی کی بجائے رمپا جی کہہ کر آواز دی تو بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر میں نے قریب جا کر اسے دیکھا تو بڑے پر سکون انداز میں سوئی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی وہی سیر شدہ مسکراہٹ رقصاں تھی جو کل رات میرے کمرے سے نکلتے وقت تھی۔ تھوڑا سا جھک کر میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو مجھے اس کے ٹھنڈے جسم سے اندازہ ہوا کہ وہ مر چکی تھی۔ سوچا شاید شادیِ مرگ اسی کا نام ہے۔

ہوٹل کے ملازم سے میں نے کہا، جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلا کر رانی جی کو چیک کرواؤ۔ ہم تینوں کمرے سے باہر آئے ملازم جلدی سے ایک سمت بڑھا جبکہ موہن اور میں کمرے سے باہر کھڑے ہو کر ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگے۔ میں نے موہن سے کچھ نہیں کہا تو اس نے مجھ سے پوچھا، راموبابو رانی جی ٹھیک تو ہیں؟ میں نے اسے جواب دیا، ڈاکٹر آ کر اس کا فیصلہ کرے گا۔ ڈاکٹر کو آنے میں کوئی دس منٹ لگے ہوں گے۔ ڈاکٹر نے آ کر اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ میں عجیب سے تذبذب کا شکار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کی بے وقت موت پر دکھی ہونا چاہیے یا اس کی زندگی کی پہلی اور آخری سہاگ رات کا جشن منانا چاہیے۔ جو لڑکی ابھی چند گھنٹوں پہلے کسی بلبل کی مانند چہک رہی تھی، کسی کوئل کی مانند کوک رہی تھی اور کسی ہنس کی چال چل رہی تھی اب اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے موندے بے حرکت لیٹی تھی۔ اسے اپنی زندگی کی اکیسویں سالگرہ کے دوسرے دن کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ کل تک اس کا جسم راکھ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ کیا زندگی کا دھاگہ اتنا کچا ہوتا ہے؟

ہسپتال کے عملے نے فون کر کے پولیس کو بلایا۔ پولیس اور پولیس کے ڈاکٹر نے اپنی تحقیق کی۔ ہم سے بیانات لیے اور اس کے بعد اس کی موت حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے بتانے کے بعد ہمیں رانی جی کی ارتھی لے جانے کی آ گیا دے دی۔ میں نے موہن کو کمبرلی فون کر کے رمیش لاج تک یہ غمناک خبر پہنچانے کو کہا۔ موہن نے روتے ہوئے اس بات کی اطلاع دینے کے بعد فون مجھے دیا۔ فون پر میں نے انہیں بتایا کہ میں ڈربن سے رانی جی کی ارتھی لے کر ابھی کمبرلی کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ گاڑی میں ارتھی ٹھونسی تو جا سکتی تھی رکھی نہیں جا سکتی تھی اس لیے میں نے ہوٹل والوں سے ایک وین کرائے پر لینے کو کہا۔ ہوٹل والوں نے ہمارے لیے ایک کرائے کی وین کا انتظام کروا دیا۔ موسم کی گرمی کے پیشِ نظر وین کے فرش پر برف کے بلاک رکھوا کر رمپا کو پھولوں میں سجی ہوئی ایک ارتھی میں رکھا اور ارتھی کو برف پر جما کر رکھا۔

موہن مسلسل روئے جا رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی تو وہ کہنے لگا سر میں گاڑی نہیں چلا سکوں گا۔ ہم نے ہوٹل والوں سے گاڑی وہیں کھڑی کرنے کی اجازت لی جو انہوں نے بخوشی دے دی۔ رمپا کی گاڑی وہیں چھوڑ کر ہم وین میں کمبرلی کے لیے روانہ ہوئے۔ موہن ڈرائیور کے ساتھ وین کی اگلی سیٹ پر بیٹھا اور میں رمپا کے ساتھ وین کے پچھلے حصے میں بیٹھا۔ ہمارا کمبرلی کا سفر شام کے سات بجے سے پہلے شروع نہیں ہوا تھا۔ رمپا کی ناگہانی موت سے اب تک مجھے چند لمحے سوچنے کا سمے نہیں ملا تھا۔ کہتے ہیں شیطان بھی مرنے والے کا پیچھا چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارا کمبرلی کا سفر شروع ہوا تو میں نے رمپا کے چہرے سے چادر ہٹائی اور پہلی بار سچے دل سے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا، گویا مرنے والی سے صلح کر لی۔ ایسے میں رمپا کے الوداعی الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے۔ اس نے میرے کمرے سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا تمہارا ملاپ میرے جیون کی سب سے بڑی آشا تھی جو آج بھگوان نے سپھل کر دی مجھے اب مرنے کا دکھ نہ ہو گا۔ مرنے کے بعد اس کے چہرے کی شانتی میرے لیے اس کی محبت کی سچائی کا کھلا ثبوت تھی۔

پھر مجھے اس کی وہ پرارتھنا یاد آئی جو اس نے ہماری ملاقات کی پہلی سالگرہ پر کی تھی۔ اس نے مجھے کل رات بتایا تھا ہماری ملاقات کی پہلی سالگرہ پر میں نے انیس اپریل کو اپنے کمرے میں تمہاری یاد کا دیپ جلایا تھا۔ میں نے وہ ساری رات جاگ کر کاٹی اور میں نے پرارتھنا کی تھی کہ کاش مجھے مرنے سے پہلے ایک بار تمہارا قرب مل جائے۔ اس کی کامنا سچی تھی اور اس کی پرارتھنا میں اس کی آتما کی گہرائی تھی۔ اور بھگوان بھی ایسی ہی پرارتھنائیں سنتے ہیں۔ بھگوان نہ صرف رمپا کی پرارتھنا کو سنا بلکہ اس کو قبولیت کا شرف بھی بخشا تھا۔ میں اس کی قربانیوں پر حیران ہو رہا تھا کہ اس لڑکی نے نہ صرف مجھے اتنی گہرائی سے چاہا تھا بلکہ پوجا تھا اور اس نے مجھے پانے کے لیے اپنی جان کی قربانی تک دینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے کی شانتی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ اس نے بھگوان سے کیا ہوا اپنا وچن ہنس کر نبھایا تھا۔ مجھے یقین ہے جب اس کی آتما لینے کے لیے فرشتے نے آ کر اسے بھگوان سے کیا ہوا وچن یاد دلایا ہو گا تو اس نے کسی جھجک کے بنا اپنی آتما اس کے حوالے کر دی ہو گی۔

رمپا ایک جرأت مند لڑکی تھی جس نے اپنے جذبات کا نہ صرف مجھ سے کھل کر اظہار کیا تھا بلکہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے تمام حجابات بالائے طاق رکھ دئے تھے۔ اس نے ایک بار بھی اپنے اور میرے درمیانی سماجی فاصلوں

کو بیچ میں لا کر اپنے لیے رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ایک رانی اور ایک سپیرے کے درمیان بہت بڑا سماجی اور معاشرتی فاصلہ ہوتا ہے اور رانی کی حیثیت سے اس کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ ایک سپیرے کے سامنے اپنے اندرونی جذبات کا نہ صرف یوں کھل کر اظہار کرے بلکہ اپنے اظہار کا جواب بھی مانگے۔ اگر وہ اس انتظار میں رہتی کہ ایک سپیرا پہل کرے گا تو وہ بھی روپا، نیتو اور پونم کی طرح ناکام رہتی۔ آج پیچھے مڑ کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میرا اندرونی کمپلیکس مجھے راجکماری روپا سے دور بھگا کر لے گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ روپا بھی میرے بارے میں نیتو اور رمپا جیسے جذبات رکھتی تھی۔ میں نے اسے بھی اپنے اندرونی خوف یا کمپلیکس کے پیشِ نظر اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کرنے کا موقع نہیں دیا تھا اور نہ ہی خود اس پر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ کیونکہ روپا کی موجودگی میں اس کی حویلی سے نکلنا میرے لیے مشکل ہو جاتا اس لیے اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر سے نکلتے وقت خوش تھا۔ میں نے پونم کی آنکھوں میں بھی اپنے لیے جذبات پڑھے تھے۔ لیکن اپنی حد سے گزرنے کے خوف سے ان کا اظہار نہ روپا سے کر سکا اور نہ ہی پونم سے اور نہ ہی ان کو اظہار کا موقع دیا۔

اگر رمپا نے اپنے چہار سو خود بینی کا خول چڑھایا ہوا تھا تو میں نے بھی اپنے گرد غربت کا خول چڑھا کر دوسروں کو اس میں داخل ہونے سے روکا ہوا تھا۔ اگر میں اپنی غربت کے کمپلیکس میں مبتلا تھا تو اس میں قصور میرا تھا نہ روپا کا اور نہ ہی پونم کا۔ روپا کو معلوم تھا کہ میں ایک معمولی سپیرے کی حیثیت سے اس کے گھر گیا تھا۔ پونم بھی جانتی تھی کہ میں معمولی سپیرا تھا جس نے اس کی پھوپھی کے لڑکے کو سانپ کی گرفت سے بچایا تھا۔ میرے بارے میں سب جانکاری کے باوجود انہوں نے مجھے پیار کرنے کا جرم کیا تھا لیکن میں اپنی جھونپڑی اور اپنی غربت کے کمپلیکس میں مبتلا ہو کر ان کے جذبات کا خیال کئے بنا ان کے جیون سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ آخر میں کب تک یونہی بھاگتا رہوں گا۔ اس بھاگ دوڑ میں شکست میری ہوگی۔ روپا، پونم اور نیتو جیسی خوبصورت لڑکیوں کے لیے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہو گی۔ اگر میں خود کو اس کمپلیکس سے نکال کر اپنے جذبات کسی کی جھولی میں نہیں ڈالوں گا تو کوئی اور مجھ سے پہل کر کے ان کی محبت جیت لے گا اور میں صرف خالی جھولی لئے اپنے چاہنے والوں کو کھو کر ہمیشہ کے لیے ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔

جاتے جاتے رمپا مجھے جرأت مندی کا درس بھی دے گئی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے رمپا کی آتما مجھ سے کہہ رہی ہو، اگر تم اپنی محبت کا بانگِ دہل اظہار کی جرأت نہیں رکھتے تو پھر تمہیں کسی سے محبت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں روپا کا اور پونم کا پیار کھو چکا تھا اور اب رمپا بھی چلی گئی تھی۔ مجھے نیتو کا خیال آیا جس کی میرے لیے چاہت رمپا سے کسی طرح کم نہ تھی۔ کسی کے لیے کسی دل میں محبت بھگوان پیدا کر دہ دیتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں نیتو سے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دوں گا۔ میں اسے کہوں گا کہ میں اسے بھی اتنا ہی چاہتا ہوں جتنا کوئی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں اس کے سنگ اپنا بقیہ جیون گزارنا چاہتا ہوں۔ رمپا نے مجھے بتایا تھا کہ نیتو کے والدین بھی مجھے پسند کرتے تھے۔ ان کی جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس راہ میں اگر کوئی رکاوٹ اب تک تھی تو وہ میری جانب سے تھی۔ میں نے ہی اب تک اسے اپنے من کا حال نہیں بتایا تھا اور نہ ہی اسے بتانے کا موقع دیا تھا۔ میں نے خود کو تیار کر لیا تھا کہ میں اپنے جیون کی ڈوری نیتو کے ہاتھوں میں تھما دوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے رمپا کے چہرے سے چادر اور پھول ہٹائے اور ایک بار پھر اس کے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے اس کی جرأت مندی کے درس کا شکریہ ادا کیا۔

نیتو مجھے یہاں رمپا کے پاس چھوڑ گئی تھی اور رمپا خود اُٹھ گئی تھی۔ اب رمیش لاج میں میرا کوئی جانکار نہیں تھا اس لیے میرا وہاں سے نکلنا آسان ہو گیا تھا۔ سوچا کہ اگر رمپا کا کریا کرم کل تک ہو گیا تو میں اگلے دن کمبرلی سے نکل کر جوہانس برگ جا کر قاہرہ کے لیے چند دن پہلے کی فلائٹ لے کر چلا جاؤں گا اور قاہرہ ائیر پورٹ سے نیتو کے دئے ہوئے نمبر پر فون کر کے اپنی دو دن پہلے آمد کی اطلاع دے دوں گا۔ جو بات مجھے کل رات تک اتنی کٹھن لگ رہی تھی وہ آج بھگوان کی کرپا سے اچانک آسان ہو گئی تھی۔

چلتے چلتے وین نے ایک تنگ موڑ کاٹا تو رمپا کے نیچے سے برف کے بلاک پگھلنے کی وجہ سے اس کی ارتھی برف پر پھسلنے لگی تو میں نے ڈرائیور کو گاڑی سڑک کے کنارے روکنے کو کہا۔ موہن اور ڈرائیور کی مدد سے رمپا کی ارتھی کو گاڑی سے نکال کر نیچے پانی خشک کرنے کے بعد برف کے بلاک درست کئے پھر اس کی ارتھی برف پر جما کر رکھی تا کہ پھسلنے نہ پائے۔ سفر کے دوران ہی مجھے سر درد اور جسم کے درد کے ساتھ گلے میں خارش شروع ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے منزل قریب آتی گئی میری طبیعت کچھ زیادہ خراب ہوتی گئی۔ سر کے ساتھ جسم میں درد اور پھر ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہونے لگا۔ رمیش لاج تک پہنچتے پہنچتے مجھ سے گاڑی میں بیٹھا تک نہیں جا رہا تھا۔ جب ہم رات بارہ بجے رمپا کی ارتھی لے کر رمیش لاج پہنچے تو میری حالت کافی پتلی ہو چکی تھی۔

گاڑی رمیش لاج رکی تو موہن مجھے دیکھ کر بولا، سر آپ کی صحت اچھی نہیں معلوم پڑتی۔ آپ میرے ساتھ اندر چل کر آرام کریں۔ باقی میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا سامان اٹھایا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں نے اسے کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے سر جھکائے اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے رمیش لاج کے اندرونی کمروں میں لے گیا۔ چند برآمدوں سے گزرتے ہوئے کچھ لوگوں سے ہماری مدبھیڑ بھی ہوئی لیکن میں کسی جانب دھیان دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ مجھے ایک کمرے میں لاتے ہوئے موہن بولا، رانی صاحبہ نے مجھے آپ کی رہائش کے لیے یہ کمرہ بتایا تھا۔ کمرہ کھول کر مجھے آرام کرنے کو کہہ کر موہن چلا گیا۔ میرا بدن اب اس قدر تھک رہا تھا کہ میں سیدھا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ آنکھیں کھلیں تو میرے بستر کے سامنے کرسی پر راجکماری روپا بیٹھی تھی۔

گرمشتاق برروئے زمیں است

زید بن عمار
(مدینہ منورہ)

نام: سرورق پر ملاحظہ کیجیے۔

خاندان: سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری کے سوا سب کچھ رہا ہے۔

پہچان: اوور کوٹ پہن کر بھی دُبلا دکھائی دیتا ہوں۔عرصہ سے مثالی صحت رکھتا ہوں۔اس لحاظ سے کہ جب لوگوں کو کراچی کی آب و ہوا کو برداشت کرنا مقصود ہو تو اتمام محبت کے لیے میری مثال دیتے ہیں۔

پسند: پھولوں میں رنگ کے لحاظ سے سفید گلاب اور خوشبوؤں میں نئے کرنسی نوٹ کی خوشبو مرغوب ہے۔

☆

ایک عرصہ پہلے ہم نے معلوماتِ عامہ کے نامعقول سے نامعقول سوالوں کے جواب رَٹ لیے تھے۔مثلاً کرکٹ کی گیندوں کا وزن، مکھی کی ٹانگوں اور بیل کے دانتوں کی تعداد۔نپولین کا قد، اگر بینک سے صرف سو روپے سات فیصد سود پر قرض لیے جائیں تو وہ کس طرح دو سو پچاس سال میں 2,217,902,400/- روپے ہو جائیں گے۔خالص سونا کتنے قیراط کا ہوتا ہے؟ بلی کی آنتوں کی لمبائی، کتا زبان باہر کیوں نکالے رکھتا ہے؟ انسان منہ کھولنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ اچھا خاصا (S اور RS) لکھ کر انہیں حرفِ غلط کی طرح کیوں کاٹا جاتا ہے۔تخلّص پر ڈوئی کیوں بنائی جاتی ہے؟ شیکسپیئر کے ہاں شادی کے کتنے ماہ بعد بچہ تولد ہوا؟ بانس پولا کیوں ہوتا ہے؟ ساری کی ساری تیاریاں دھری رہ گئیں جب ہم سے یہ سوال ہوا "اچھا یہ بتاؤ کہ جس سن میں تم پیدا ہوئے تھے اس سال اور کون سا بین الاقوامی سانحہ ہوا تھا؟" پھر خود ہی سنہ پیدائش دیکھ کر اندوہ گیں لہجہ میں کہا، اسی سال میرے باپ کا انتقال ہوا۔بڑا منحوس سال تھا وہ۔پھر پوچھا "تم یہ پیشہ اختیار کیوں کرنا چاہتے ہو؟" ذہن پر بتہیر از وردیاوہ اگر معقول کی بیخ نہ لگا تا تو ہم ایک ہزار ایک وجوہات گنوا سکتے تھے۔

☆

پسینہ ہے کہ کسی طرح خشک نہیں ہوتا۔جی چاہتا ہے بلائن پیپر کا لباس بنوالیں۔سچ تو یہ ہے کہ ایسی ستر کشا آب و ہوا میں کپڑے موسم سے بچاؤ کے لیے نہیں صرف قانون سے بچنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔عام طور سے فیشن موسم کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں۔آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ دوسرے شہروں میں اونچے گھرانوں کی فیشن پرست خواتین اہم تقریبوں میں خاص طور سے کپڑے پہن کے جاتی ہیں جبکہ کراچی میں کپڑے اتار کر تقریبات میں جاتی ہیں۔

سیاست میں یا سائیکل پر کسی بھی سمت نکل جائیں آپ کو ہوا ہمیشہ مخالف ہی ملے گی۔

☆

آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب کو ایک کیپسول میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے جسے وہ کوکا کولا کے گھونٹ کی طرح غٹک سے گلے میں اُتار لیں۔

☆

ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہے کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں۔

☆

وہ بیوی جو اپنے شوہر کو ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے اس بلی کی مانند ہے جو چوہے کو جان سے مارنے کے بعد بھی اُس سے کھیلتی رہتی ہے۔

☆

میرا خیال ہے کہ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے یا وہ خود ہی حالاتِ حاضرہ کا ذمہ دار ہے۔

☆

رونا تو یہی ہے جس میں رَس ہے اس پہ بَس نہیں اور جس پر بس ہے اس میں رَس نہیں۔

☆

گناہ گار عورتوں کو دوزخ میں اُن کے پکے ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔

☆

دولت، سیاست، عورت اور عبادت کامل یکسوئی سرتاپا سپردگی چاہتی ہے۔ذرا دھیان بھٹکا اور منزل کھوٹی ہوئی۔

☆

لاہور کے آسمان سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ خوش رنگ و شوخ ادا تو صرف ایک چیز ہے وہ ہے لاہور کی گل زمین۔چار سو برس پہلے بھی یہ زمین ایسی ہی فلک رنگ تھی جبھی تو نور جہاں نے کہا تھا

لاہور را بہ جان برابر خرید ایم
جاں دادہ ایم جنت دیگر خرید ایم

☆

پاکستانی بزنس مین، بیوروکریٹ اور بنکر کی ڈکشنری میں انٹلکچوئل سے زیادہ سڑی گالی کوئی نہیں۔

☆

آدابِ سخن

(چوبیس مشہور بحور مع ارکان و مثالی فقرہ)

محمد اسامہ سَرسَریؔ
(کویت)

بحر کا نام	بحر کے ارکان	مثالی فقرہ
بحر متقارب مثمن سالم	فعولن فعولن فعولن فعولن	بھلا ہے بھلا ہے بھلا ہے بھلا ہے
بحر متقارب مثمن محذوف	فعولن فعولن فعولن فعل	بھلا ہے بھلا ہے بھلا ہے بھلا
بحر متدارک مثمن سالم	فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن	خوب ہے خوب ہے خوب ہے خوب ہے
بحر ہزج مثمن سالم	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	بہت بہتر بہت بہتر بہت بہتر بہت بہتر
بحر ہزج مسدس سالم	مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن	بہت بہتر بہت بہتر بہت بہتر
بحر ہزج مسدس محذوف	مفاعیلن مفاعیلن فعولن	بہت بہتر بہت بہتر بھلا ہے
بحر ہزج مثمن مقبوض	مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن	کمال ہے کمال ہے کمال ہے کمال ہے
بحر ہزج مثمن اشتر	فاعلن مفاعلین فاعلن مفاعلن	خوب ہے بہت بہتر خوب ہے بہت بہتر
بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف	مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن	کیا خوب بہت خوب بہت خوب بھلا ہے
بحر ہزج مثمن اخرب سالم	مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن	کیا خوب بہت بہتر کیا خوب بہت بہتر
بحر رجز مثمن سالم	مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن	کیا خوب ہے کیا خوب ہے کیا خوب ہے کیا خوب ہے
بحر رجز مثمن مطوی مخبون	مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن	خوب بھلا کمال ہے خوب بھلا کمال ہے
بحر رمل مثمن محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن	خوب عمدہ خوب عمدہ خوب عمدہ خوب عمدہ
بحر رمل مسدس محذوف	فاعلاتن فاعلاتن فاعلن	خوب عمدہ خوب عمدہ خوب ہے
بحر رمل مثمن مخبون محذوف	فاعلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعِلن/فعْلن فعِلاتن فعِلاتن فعِلاتن فعِلن/فعْلن	خوب پیارا دل و جاں سے دل و جاں سے پیارا دل و جاں سے دل و جاں سے دل و جاں سے پیارا
بحر رمل مثمن مشکول مسکن	مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن	کیا خوب عمدگی ہے کیا خوب عمدگی ہے
بحر رمل مثمن مشکول	فعِلاتُ فاعلاتن فعِلاتُ فاعلاتن	دل و جان ہیں نچھاور دل و جان ہیں نچھاور
بحر متدارک مثمن مخبون مسکن	فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن	بے حد عمدہ بے حد عمدہ
بحر کامل مثمن سالم	متفاعلن متفاعلن متفاعلن متفاعلن	دل و جان سے وہ عزیز ہے دل و جان سے وہ عزیز ہے
بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف	مفعول فعلاتُ مفاعیل فاعلن	کیا خوب بہترین مضارع کی بحر ہے
بحر مجتث مثمن مخبون محذوف	مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن/فعْلن	عزیز ہے دل و جاں سے عزیز ہے بے حد
بحر منسرح مثمن مطوی مکسوف	مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن	خوب بھلا خوب ہے خوب بھلا خوب ہے
بحر مدید مثمن سالم	فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن	بہتریں ہے خوب ہے بہتریں ہے خوب ہے

پراسٹیٹ کینسر

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

پراسٹیٹ کینسر مردوں میں پھیپھڑے کے سرطان کے بعد سب سے زیادہ عام مرض ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر سال ایک لاکھ افراد میں ایک سو پندرہ افراد اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اور اس سے ہر سال کئی لاکھ اموات ہوتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ہماری اپنی کمیونٹی میں کئی افراد اس مرض کا شکار ہوئے اور اس سلسلے میں مجھے درجنوں فون آئے۔ آج اس مضمون کا مقصد عوام الناس کو اس مرض کے سلسلے میں معلومات بہم پہنچانا ہے تاکہ ان کو اس مرض سے آگاہی ہو اور اس کی جلد تشخیص اور علاج ہو سکے۔ یہ مرض پختہ عمر یعنی پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اعداد وشمار کے لحاظ سے پچھتر سال سے زیادہ عمر کے ہر چھ افراد میں سے ایک اس مرض میں مبتلا ہوگا۔ کچھ سال پہلے تک یہ ایک خطرناک مرض تھا اور آج بھی اگر اسکی جلد تشخیص نہ ہو تو یہ مہلک ہوسکتا ہے۔

پراسٹیٹ کیا ہے

پراسٹیٹ ایک غدود ہے جو مردانہ صلاحیتِ تولید میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اخروٹ کی شکل وحجم کی طرح کا غدود ہے جو مثانہ یعنی پیشاب کی تھیلی کے نیچے اس طرح واقع ہوا ہے کہ اس نے تھیلی سے نکلنے والی پیشاب کی نلکی کو مکمل گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ پیشاب کی نلکی جو یوریتھرا (URETHRA) کہلاتی ہے اس کے عین درمیان سے گذرتی ہے۔ اس کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ ایک چھوٹا سیب لیں اور اسکے بیچوں بیچ ایک سلائی گھسیڑ دیں۔ اسی وجہ سے جب یہ بڑھتا ہے تو پیشاب کی نالی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس غدود کا اہم کام ان رطوبتوں کی پیدائش اور اخراج ہے جو مادہ منویہ کا حصہ ہیں۔ اسکا وزن پچیس سے تیس گرام ہوتا ہے۔ غدود کی نشو و نما مردانہ ہارمون ٹیسٹس ٹرون TESTERONE پر منحصر ہے۔ عام حالات میں جب کبرسنی میں اس ہارمون کی کمی ہو جاتی ہے یہ غدود بھی سکڑنے لگتا ہے مگر کچھ افراد میں عمر کے اس دور میں یہ بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ زیادہ تر اس کا بڑھنا بڑی حد تک بے ضرر ہوتا ہے سوائے اس کے کہ یہ پیشاب کی نالی کو جکڑ کر پیشاب کے بہاؤ میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ بد قسمتی سے چند لوگوں میں اس میں سرطان کی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں یعنی اسکے خلیات کسی کنٹرول کے بغیر تقسیم ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ اپنے اطراف کے اعضاء میں پیوست ہو جاتا ہے جسکا اگر جلد علاج نہ کیا جائے تو یہ بیماری موت کا سبب ہوسکتی ہے۔ اس غدود میں ایسی تبدیلیاں کیوں ہو تی ہیں اسکا حتمی جواب میڈیکل سائینس کے پاس نہیں ہے۔

علامات

سب سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ شروع میں اسکی کوئی علامت نہیں اور مریض کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو یہ دیکھا گیا ہے کہ پہلی علامت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب مرض کافی پھیل چکا ہو۔ مگر جیسا لکھا جا چکا ہے کہ یہ غدود پیشاب کی نالی کو جکڑ لیتا ہے اس لئے اس کی پہلی علامت میں پیشاب کی دھار میں رکاوٹ ہے۔ پیشاب رک رک کر آتا ہے۔ اس کے علاوہ پیشاب کی تھیلی یعنی مثانہ مکمل طور پر خالی نہیں ہو پاتی اس لئے بار بار پیشاب آتا ہے اور خاص طور سے یہ حالت رات کو ہوتی ہے۔ کبھی کبھی پیشاب میں جلن ہوتی ہے اور مرض کے بڑھ جانے پر پیشاب میں خون کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ان علامات سے بہت پہلے مرض کی تشخیص ہو جائے۔ یہاں یہ لکھنا بیحد ضروری ہے کہ اولیں مدارج میں یہ بہت ہی زیادہ قابل علاج سرطان ہے اور اس وقت امریکا میں ایسے ستائیس لاکھ افراد زندہ ہیں جو پراسٹیٹ کے کینسر سے صحت یاب ہو چکے ہیں۔

سکریننگ

انسانی زندگی بچانے کے لئے علم طب نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اسکی وجہ اسکریننگ ہے۔ یعنی ایسے افراد میں، جن کو کسی قسم کی علامات نہیں، ان امراض کی سکریننگ کی جائے جو جلد تشخیص کی وجہ سے مکمل قابل علاج ہیں۔ پراسٹیٹ کا کینسر بھی شروع میں کوئی علامت ظاہر نہیں کرتا مگر اس اسٹیج پر بھی اسکریننگ سے اس کی تشخیص ہوسکتی ہے اور مرض کا مکمل قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ پراسٹیٹ سکریننگ کے دو طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ سہل ہے یعنی ہر سال میڈیکل چیک اپ کے دوران انگلی کے ذریعہ پراسٹیٹ کی جانچ کی جاتی ہے۔ مقعد میں انگلی ڈال کر پراسٹیٹ کو محسوس کیا جاتا ہے یہ بہت سہل اور بغیر تکلیف کے کیا جا سکتا ہے۔ دراصل امریکا میں قانونی طور پر ڈاکٹروں کے لئے یہ کرنا لازمی ہے سوائے اس کے کہ مریض اس پر راضی نہ ہو۔ صرف اس تشخیصی طریقے نے لاکھوں کی جانیں بچائی ہیں۔ میں گمان کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں رسم ورواج کی پابندیوں کی وجہ سے شاید یہ طریقہ عام نہ ہو مگر میں اس کی سفارش کرتا ہوں کہ ہر شخص کو ڈاکٹروں سے اس جانچ کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ پراسٹیٹ کی سطح پر کسی قسم کی بے قاعدگی یا سخت ابھار مشکوک ہو تے ہیں اور اگر ایسا ہو تو بائیوپسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بائیوپسی ایک نسبتاً بے ضرر پروسیجر ہے۔ اس میں ایک بہت باریک سوئی کے ذریعہ غدود کا بیحد چھوٹا ٹکڑا حاصل کیا جاتا ہے اور اسکی خوردبین کے ذریعہ جانچ کی جاتی ہے

دوسرا طریقہ بھی کوئی مشکل نہیں۔ اس طریقہ میں خون میں ایک ''مارکر''، یعنی PSA کی مقدار کا تعین کرنا ہے۔ عام طور پر خون میں اسکی مقدار 2 سے 4 ہے۔ یہ پروٹین پروسٹیٹ سے خارج ہوتی ہے اور کینسر میں اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ بڑھی ہوئی مقدار کو کئی بار جانچا جاتا ہے اور اگر یہ بتدریج بڑھتی رہے تو پراسٹیٹ کی بائیوپسی ضروری ہے۔ اگرچہ کینسر کے علاوہ پروسٹیٹ کی

دوسری بیماریوں میں بھی اس کی مقدار بڑھ جاتی ہے مگر طبیب کے لئے ان میں تفریق کرنا مشکل نہیں۔یہ دونوں طریقے آسان ہیں اوراس سے مرض کی ابتدائی حالت میں تشخیص ہوسکتی ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ پابندی سے سالانہ ڈاکٹری معائنہ کروائیں جس میں پراسٹیٹ کی انگلی سے جانچ شامل ہواور اس میں غفلت نہ برتیں۔ان لوگوں کے لئے جن کے خاندان میں کینسر کی ہسٹری ہوانکے لئے یہ اور بھی ضروری ہے۔

پراسٹیٹ کینسر کے مدارج

اگر کینسر صرف غدود کے اندر تک محدود ہے تو یہ پہلی سٹیج ہے اور تقریباً سو فیصد قابل علاج ہے۔اگر یہ قریبی اعضا میں پھیل گیا ہے تو دوسری اسٹیج اور اسکا علاج مشکل ہے اور اگر اس نے دور دراز کے اعضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے تو اس کا علاج تقریباً ناممکن ہے۔دور کے اعضا میں یہ خاص طور سے ہڈیوں میں پھیلتا ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرض کی تشخیص اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ اسکی علامات پراسٹیٹ کی بجائے جسم کے کسی دوسرے حصے میں کینسر پھیلنے کی وجہ سے ہوتی ہیں جو ایک سنگین مرحلہ ہوتا ہے۔حقیقتاً مریضوں کی ایک بڑی تعداد ڈاکٹروں کے پاس ہڈیوں میں شدید درد یا پھر بغیر کسی حادثہ کے ہڈیوں کا ٹوٹنے کی وجہ سے جاتے ہیں۔بدقسمتی سے اس مرحلے پر اسکا علاج اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

علاج کے طریقے

اگرچہ ہر مرض برا ہے مگر پھر بھی پراسٹیٹ کینسر نسبتاً اس لئے کچھ بہتر ہے اگر چہ اسکے علاج میں تاخیر ہوجائے تو بھی اسکا مریض بہت طویل عرصے جی سکتا ہے۔اس لئے کچھ ماہرین یہ کہتے ہیں اگر اسکی تشخیص بہت بڑھاپے یعنی اسی (۸۰) کی دہائی میں ہو تو شاید کسی علاج کی ضرورت نہیں اور صرف مریض کو زیر مشاہدہ رکھا جاسکتا ہے۔مگر اس پر سب ماہرین کا اتفاق نہیں ہے۔

پہلی اسٹیج میں سرجری سب سے عام اور موثر طریقۂ علاج ہے۔سرجری نسبتاً بڑی سرجری ہے۔اسے RADICAL PROSTATECTOMY کہا جاتا ہے۔سرجری کے ذریعہ، جو ناف کے نیچے پیٹ چاک کر کے کی جاتی ہے پراسٹیٹ کے غدود کو اسکے اطراف کی ٹشوز کیساتھ مکمل طور پر نکال دیا جاتا ہے اس کے بعد کچھ مریضوں کو پیشاب پر قابو نہیں رہتا اور ان کی مردانہ صلاحیت بھی مجروح ہو جاتی ہے۔دوسرا طریق علاج ریڈیائی شعائیں ہیں۔ریڈیو بیم کے ذریعہ پراسٹیٹ کو نشانہ بنا کر اس پر شعائیں پھینکی جاتی ہیں جو کینسر کے خلیات کو تباہ کردیتی ہیں۔اس میں یہ مسئلہ ہے کہ یہ شعائیں پراسٹیٹ کے نارمل حصے کو اور کبھی کبھی کوشش کے باجود اس غدود کے قریبی اعضا کو بھی نقصان پہنچاتی ہیں۔اس طرح اسکے ثانوی اثرات کافی زیادہ ہیں۔عام طور پر اس میں فوٹون استعمال ہوتے ہیں مگر اب کچھ سالوں سے پروٹون ایجاد ہوگئے ہیں جو بہت موثر ہیں اور صرف ٹیومر کو ہی نشانہ بناتے ہیں۔مگر یہ سہولت امریکا میں بھی چند ہی ہسپتالوں میں ہے۔میری معلومات کے مطابق یہ پاکستان میں مہیا نہیں ہے۔

آج کل ریڈیائی شعاؤں سے لبریز کچھ بیج جو چاول کے دانوں کے برابر ہوتے ہیں پراسٹیٹ میں سوئیوں کے ذریعہ پرو دئے جاتے ہیں۔یہ صرف پراسٹیٹ میں کینسر کو نشانہ بناتے ہیں اور مرض کا خاتمہ کردیتے ہیں۔علاج کے دوران پیشاب میں جلن، پیشاب کا بار بار آنا اور نچلے حصے میں بے آرامی کی شکایت ہوتی ہے مگر چھ ہفتے میں یہ تکالیف رفع ہوجاتی ہیں۔اور عام حالات میں مریض مکمل طور پر شفایاب ہوجاتا ہے۔اس وقت سب سے عام طریقہ علاج یہی ہے۔

کچھ ایسے مریضوں کا جنکا مرض بڑھ گیا ہو اور وہ تیسری اسٹیج میں ہوں، علاج ہارمون تھیراپی سے بھی کیا جاتا ہے۔اس میں ٹیسٹرون مخالف دواؤں کا استعمال شامل ہے۔کچھ مریض جنکا مرض بہت پھیل گیا اور انکو مرض کی وجہ سے بیحد تکلیف ہوانکے لئے آخری حربے کے طور پر اور انہیں تکلیف سے نجات کے لئے سرجری کے ذریعہ خصیوں کا نکالنا بھی ضروری ہوجاتا ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ پہلی اسٹیج میں پراسٹیٹ کینسر تقریباً سو فیصد قابل علاج ہے مگر اس کا دارومدار اس پر ہے کہ اسکی تشخیص جلد سے جلد ہو اور فوراً اسکا علاج شروع کیا جائے۔تو اہم بات یہ ہے کہ ایک ایسا مرض جو ہر چھ ماہ میں خون کے ٹیسٹ اور انگلی سے پراسٹیٹ کی جانچ سے نہایت اولیں مرحلے میں تشخیص ہوکر قابل علاج ہوسکتا ہے اس کے لئے کیوں کر بے توجہی برتی جائے۔

مین آف دی گولڈن آرم

آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں مقیم مسٹر جیمز ہیریسن اپنے نام کے بجائے مین آف دی گولڈن آرم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آسٹریلیا کی بلڈ ریڈ کراس سروس کے بقول اکیاسی برس کے جیمز ہیریسن نے ساٹھ سال کے عرصے میں ایک ہزار ایک سو ایک مرتبہ خون کا عطیہ دیا ہے۔جیمز ہیریسن کی اس عظیم خدمت کے باعث بیس لاکھ سے زیادہ بچوں کی جانیں بچائی جا چکی ہیں۔آخری مرتبہ جیمز ہیریسن نے ایک ایسی ماں کو خون کا عطیہ دیا جو زندگی بچانے والی دوائیوں کے استعمال کی بہتات کے باعث اُس کے خون سے پیدا ہونے والے بچے کی جان کو خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔

☆

مثلِ تیغِ بُرّاں

ہونے اور نہ ہونے کے درمیاں

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

ہونے اور نہ ہونے کے
درمیان بھی
کچھ ہے

ہے یقیں۔
نہیں کچھ بھی
ہاں۔گماں بھی
کچھ ہے
آسماں نہیں لیکن
آسمان بھی کچھ ہے
ہونے اور نہ ہونے کے
درمیان۔۔سورج کی
روشنی نہیں جاتی
کوئی رَو تمازت کی
بھی۔۔کبھی نہیں جاتی
فکر اور دانش کی
آگہی نہیں جاتی

ہونے اور نہ ہونے کے
درمیان جانے کا
بال سے مہیں رستہ
یعنے درمیاں کا پُل

مثلِ تیغِ بُرّاں ہے
پُل کے پار جانا ہے
دوسری نہیں کوئی
رو گزار۔۔۔

جانا ہے
سیفِ تیز جیسی ہے
پُل کی دھار
جانا ہے
جبر ہو کہ شاید ہو
اختیار۔۔۔
جانا ہے۔۔۔!!

''آوارۂ عالم''

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

کہتے کہتے، ہچکچاتی تھی جسے تیری زباں
کہہ رہی ہے
خلقِ خدا، تیرے تعلق سے، غائبانہ
''فیروز عالم، آوارۂ عالم''
سیّاحی اور اولدگی میں ہے تیرا اپنا مقام!

اے کہ تو ہوتا تھا کبھی
یاروں کا یار، ڈھونڈ لی کیوں تونے راہِ فرار
ہوگیا ہے، بے نیاز و بے پرواہ
یاروں کے کوچے کی جانب
اُٹھتے نہیں اب تیرے پاؤں!

شہر شہر، ملکوں ملکوں کی سیّاحی
اور اُن کی فلک پیما، بلند و بالا
حسین و جمیل، سنگ خشت کی عمارتیں
لے اُڑی ہیں
تیرے بے لوث و مخلص چاہنے والوں کی جا
کونسا ایسا خدا ہے تونے ڈھونڈا
جس کے بدل میں تونے
تج دیئے ہیں
مخلص و بے لوث، پیارے پیارے یار!!

مان لیا کہ وہ ہیں بے مصرف
کم مایہ،
اور گمنام بھی
لیکن
دُور افتادہ کسی یار سے ملاقات
کرنا بھی نہیں ہوتا کسی زیارت سے کم!!!

بے حرمتی و ناقدری ، بے لوث یار نہ کر
یہ انمول تحفۂ پروردگار ہے ، نہیں تمکو خبر

خوش طالع وہ لوگ ہیں تشنہؔ جن کو بے لوث یار ملے
لاثانی اس تحفے کو ایدوست تو بیکار نہ کر

میں نے باغ کی جانب پیٹھ کرلی

(اساطیری نظم)

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

میں نے دجلہ وفرات کے مشرق میں
ایک قدیم اور روشن پیڑ کے نیچے
سجدوں کا خراج وصول کیا
اور پھل دار درختوں سے ڈھکے
باغ میں مقیم ہوا
جسے میرے اور اس عورت کے لیے
آراستہ کیا گیا تھا
جس کی جنم بھومی
میری دائیں پسلی تھی!

میں نے پہلی بار اسے
زندگی کے پیڑ کی سنہری شاخوں کے درمیان
رینگتے دیکھا
وہ
پیڑ کی حفاظت پہ مامور تھا
اس کی کاسنی آنکھوں میں
قائل کرلینے والی
چمک تھی!

میں نے اپنی بھوک
امتناع کے پھل پہ تسطیر کی
تو میری آنکھیں
اس عورت کے جسم کے آرپار
دیکھنے لگیں
اور
باغ کے سبز پیڑ
میرے سر سے
اپنے سائے کی چھتریاں سمیٹنے لگے!

میں نے زندگی کے پیڑ سے لپٹے اژدھا کو
تین برابر حصوں میں تقسیم کیا
ایک حصے سے
اپنے سر کے لیے شملہ ایجاد کیا
دوسرے حصے کو
ازار بند بنا کر کمر کے گرد لپیٹا
جو بچ رہا
اسے اپنی ساتھی عورت کے
بالوں میں گوندھا
اور
باغ کی جانب پیٹھ کرلی!

میری عورت نے مجھ سے چھپ کر
اس کی سیاہ جلد سے
اپنی نیلی آنکھوں کے لیے
سرمہ ایجاد کیا
اور رات کے پچھلے پہر
اپنے دودھ سے
اس کی ضیافت کرنے لگی
میں نے مقدس پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی
اسے دان کی
اور اپنی پیشانی
خاک پہ رکھ دی!

بفرضِ محال

عبدالرحمٰن عبد

(نیویارک)

اگر میں فوج میں کپتان ہوتا
مرا بنگلہ بھی عالیشان ہوتا
بڑھاتا اس قدر، میں اپنی مونچھیں
زمانہ دیکھ کر حیران ہوتا
مرے غصّے سے ہر اک شخص ڈرتا
میں اپنی ذات میں طوفان ہوتا
دکھاتا نہ کبھی گاڑی کے کاغذ
بھلے سو مرتبہ چالان ہوتا
میں خاصا دیر سے جلسے میں جاتا
سپیکر پر میرا اعلان ہوتا
میں لے لیتا کئی سرکاری تمغے
یہ سب میرے لیے آسان ہوتا
رہی حسرت کبھی اے کاش میں بھی
گورنر ہاؤس میں مہمان ہوتا
اگر بالفرض، میں ہوتا منسٹر
تخلص میرا ’’پھنّے خان‘‘ ہوتا
میری ٹی پارٹی جہلم میں ہوتی
تو استقبال گجرخان ہوتا
میں آئے روز، دورے کے بہانے
کبھی سکھر کبھی ملتان ہوتا
قیامت کی نہ مجھ کو فکر ہوتی
اگر منصف وہاں انسان ہوتا
کفن میں اور کچھ لے کر نہ جاتے
فقط رشوت کو کچھ سامان ہوتا
سفر کرتا میں سرکاری خرچ پہ
میرا چیک اپ بھی انگلستان ہوتا

○

میگھارے

ضمیر درویش

(مراد آباد، بھارت)

کسی کی باتوں میں مت آنا میگھا رے،
کہیں نہ جانا طیبہ جانا میگھا رے

جانوں ہوں مَیں پھولا نہیں سماتا تُو،
یہاں سے ہوتے ہوئے روانہ میگھا رے

وہاں تو ہے ذرّہ ذرّہ خود نورانی،
وہاں نہ یہ بجلی چمکانا میگھا رے

بڑی بڑی بوندیں نہ گرانا گنبد پر،
ننھی بوندیں ہی ٹپکانا میگھا رے

جس پر مر مٹنے کی حسرت ہے تجھکو،
اسی شمع کا مَیں پروانہ میگھا رے

بات چلے جب وہاں ہمارے عصیاں کی،
آنکھوں میں آنسو بھر لانا میگھا رے

انکے در پر جانے کی دونوں کو تڑپ،
تُو بھی اور مَیں بھی دیوانہ میگھا رے

خاکِ طیبہ پر رکھ دینا اپنے ہونٹ،
تُو بھی اپنی پیاس بجھانا میگھا رے

تیرے پیروں کو بوسے دے گا 'درویش'
شہرِ مدینہ گھوم کے آنا میگھا رے

○

''بے خیالی میں تخلیق''

سبیلہ انعام صدیقی (کراچی)

خیالات واحساس!
جو بے ساختہ لکھ دیے ہیں
نہ جانے وہ کب سے دِل و جاں کے اندر چھپے تھے,
کسی راز جیسے
قلمبند ہونے کو بے چین تھے
کئی درد, الجھے سوالات
جو صفحے پہ سجنے کو بیتاب تھے
وہ سب
قلم سے مرے موتیوں کی طرح
اب برسنے لگے ہیں
سبھی رقص کرنے لگے ہیں
مری چشمِ پُرنم
جو سیلاب روکے ہوئے ہے
ستارے چمکتے ہیں میری پلک پر
انھیں میں رقم کر رہی ہوں
جو طوفان ہے موجزن میرے اندر
وہ ارمان, وہ خواب
کئی لاشعوری مضامین بن کر
وَرق در وَرق جگمگانے لگے ہیں
سبھی رقص کرنے لگے ہیں
اور اب
اسی جذب واحساس کے زیرِ سایہ
غزل پھول بن کر مہکتی ہے
کبھی نظم گاتی ہے وہ گیت
کہ جو بے خیالی میں تخلیق ہو کر
بناتی ہے رنگین پیکر
یہ بزمِ سخن کو سجانے پہ مائل
خیالات سب رقص کرنے لگے ہیں
قلم سے مرے موتیوں کی طرح
اب برسنے لگے ہیں
سبھی رقص کرنے لگے ہیں

رقصِ حیات

نیلم احمد بشیر (لاہور)

محبتوں کے ناچ گھر میں ناچتے تھے دو بشر
تھام کر ہاتھوں میں ہاتھ، پیر اٹھتے ساتھ ساتھ
اک حسینہ پھول سی، اک دیوانہ شوخ سا
زندگی کے والٹز waltz کی دھن بج رہی تھی شان سے
کیسی تھی مدھر مدھر،
اڑ رہے تھے چار سو، ان گنت گلابی شرر
تھرکتے تھے دو بدن، ہو رہا تھا جنتوں میں روح کا حسیں ملن
دم بدم، قدم قدم، دلِ میں تھا نہ کوئی غم
دھیرے دھیرے محوِ رقص، جیسے ہوں دو ہنس راج
ہنستے ڈولتے ہوئے، ناچتے برسطحِ آب
کیسی خوشیاں ناچتی تھیں اک رخِ ماہتاب پر
اتنے تھے قریب دونوں جیسے ہوں وہ اک وجود
ماسوا ان دونوں کے کوئی نہ ہو وہاں موجود
ڈال کر بازو کمر میں کھینچتا جب پیار سے
سانس روک لیتی وہ بھی دیکھ کر دُلار سے
قربتیں تھیں بے پناہ، فاصلہ کوئی نہ تھا
پیار کا بپھرا سمندر، کیسا ٹھاٹھیں مارتا
خون میں مچتی دھمال
عشق کا بہتا سیال
گھومتی تھی کائنات
جھومتا تھا پات پات
رقص سرور انگیز تھا
کھلتا دلِ نوخیز تھا
لے کے جادو میں وہ دونوں گم ہوئے اور کھو گئے
ایک دوجے کے ہی بس ہوتے رہے اور ہو گئے
پھر تھما میوزک، کھلی آنکھیں، سحر ٹوٹا
ہاتھ لڑکی کا دیوانے ہاتھ سے چھوٹا
توڑ کر بازوؤں کا دلکش حِصار
جھٹک کے معصوم لڑکی کا پیار
وہ نئی ہم رقص کی جانب بڑھا
ڈانس کا تھا پارٹنر بدل گیا

ایک معصوم دعا

ڈاکٹر ظلّی وبھانازلی
(ہمیر پور، بھارت)

میری تنہائی کوشائستہ بنانے والے!
ہاتھ میں دے کے قلم، سطر لکھانے والے!
سجدۂ شکر تجھے، دنیا چلانے والے!
روح کا نور، مریدوں کو دکھانے والے!
ہاں، میری روح کی محراب میں تو شمع جلا!

تیری نکہت سے مہکتا ہے سدا گھر میرا
میری تخیل میں ہے صرف تصور تیرا
خواب میں دیکھتی ہوں چہرۂ منوّر تیرا
میرے فن میں، میرے شعروں میں ہے جوہر تیرا
میرے سنگیت میں ہے بولتا اعجاز ترا
ہاں، میری رُوح کی محراب میں تو شمع جلا!

ذکر ہونٹوں پہ ترا، آٹھوں پہر، ہر لمحہ
ذہن میں یاد تری شام وسحر، ہر لمحہ
تیری تصویر پہ رہتی ہے نظر، ہر لمحہ
میری تحریر پہ ہے تیرا اثر، ہر لمحہ
بارور ہوگی یقیناً میری معصوم دعا
ہاں میری روح کی محراب میں تو شمع جلا!

میں گنہگار ہوں، تو عفو مجھے کر دینا!
بندگی ہی میں جو تری خم رہے، وہ سر دینا!
پردہ پوشی کو میری، رحم کی چادر دینا!
میرے سجدوں کے لیے اپنا ہی تو دَر دینا!
نازلی کو غم وآفات سے یارب! تُو بچا!
ہاں، میری روح کی محراب میں تو شمع جلا

○

سپردِ خاک

شگفتہ نازلی
(لاہور)

سارے جو مرحلے ہیں وہ تو جینے سے جُڑے۔۔۔
سب مرحلے تمام، جونہی اُن سے ہم مُڑے۔۔۔
سانسوں کی ریل پیل سے ہی بھاگ دوڑ ہے۔۔۔
اس ساری تگ ودو میں رہ کا موڑ موڑ ہے۔۔۔
جینے کا کیا جواز، کبھی کھوجتے نہیں۔۔۔
اور آنے والی ساعتیں بھی سوچتے نہیں۔۔۔
مثبت رویوں کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔۔۔
منفی وطیروں کی ہمیں کوئی فکر نہیں۔۔۔
کچھ اس طرح سے جینے میں مشغول رہتے ہیں۔۔۔
کہ اس کے بعد مرنے کو تو بھول رہتے ہیں۔۔۔
رہتا نہیں ہے یاد کہ اگلے پڑاؤ پر۔۔۔
زیرِ زمیں۔۔۔ کہیں۔۔۔ سپردِ خاک۔۔۔ ہونا ہے!

○

تعارف میری شاعری ہے

ڈاکٹر تقی عابدی
(کینیڈا)

غزل اُردو شاعری کی آبرو بھی ہے اور اُردو شاعری کا سنگار بھی ہے۔ بعض شاعروں نے اس کی تنگ دامنی کا شکوہ کیا تو بعض نے کہا: ع: ''سلیقہ ہو تو گنجایش بہت ہے'' کسی نے غزل کو نیم وحشی صنف کہا تو کسی نے اس کی گردن زدنی کا حکم دیا۔ ان تمام فرمان اور فتووں کے باوجود آج بھی گلشن شاعری میں غزل کی خوشبو مہک رہی ہے۔ یہ سچ ہے اچھی غزل کہنا مشکل ہے لیکن فطری شاعر اس مشکل کو سہل اور آسان بنالیتا ہے اور تغزل کی چاشنی سے اُسے دیگر اصناف سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ غزل کی کہنہ مشق اور منفرد لب و لہجہ شاعرہ ڈاکٹر سکینہ ساجد پنہاںؔ کے کلام سے ظاہر ہے۔

دورِ حاضر کے شاعروں اور شاعرات میں شاید ہی کسی نے مقطعوں میں غزل اور اچھی شاعری کے مطالب کو حُسنِ تخلص کے ساتھ ایسا پیش کیا ہو جو پنہاں نے کیا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ پنہاںؔ پر غزل کی ساخت و بافت کے رموز عیاں ہیں جو ہر شاعر کی قسمت میں نہیں جیسا کہ مولانا روم نے کہا کہ ہر پرندے کا لقمہ انجیر نہیں ہوتا:

ع: طعمہ ہر مرغ کہ انجیر نیست

غزل کا خاص جوہر ایجاز سے اعجاز پیدا کرنا ہے۔ جب ساز کے تار میں حرکت یا کپکپی پیدا ہوتی ہے تو نغمہ کا جنم ہوتا ہے۔ ان تصورات کو ذہن میں رکھ کر غزل کی تعریف سُنیے:

بس یہی تعریف ہے پنہاںؔ غزل کی اور کیا
ارتعاشِ تار دل تا نغمۂ ساز حیات

غزل ہے شاعری کی جان پنہاںؔ
مگر نازک ہنر کے مسئلے ہیں

یعنی صرف بحر ردیف و قافیے سے غزل نہیں ہوتی بلکہ اس میں شاعر کی الہامی قوت اور فنی ہنرمندی کی ضرورت ہے اور سچے شاعر کو آمد بے قرار کرتی رہتی ہے۔ پنہاںؔ کہتی ہیں۔

غزل کی بے قراری کم نہیں پنہاںؔ
اسے اب اور کیسی بات کرنی ہے

میرے بس میں تو فقط مشق سخن ہے پنہاںؔ
خود غزل چاہے کہ ہوجائے یہ تب ہوتی ہے

آج کے اس خود فروش دور میں کچھ شاعر نما داد و تحسین کی بھیک مانگتے مشاعروں میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اصرار پر انھیں تحسین ناشناس مل بھی جاتی ہے لیکن شاعر خود اس شعری اسرار سے ناواقف رہتا ہے جس کی طرف صائب تبریزی نے اشارہ کیا کہ شعر کی منزلت کو دو ہی چیزیں مٹا دیتی ہیں ایک ناشناس کی داد اور دوسرے سخن شناس کی خاموشی۔

صائبؔ دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس سکوت سخن شناس

اب آیئے پنہاںؔ کی آسودگی اطمینان اور شعری وقار دیکھیے:

داد و تحسین کی پروا نہیں ہم کو پنہاںؔ
ہم غزل کہہ کے ہی سرشار ہوئے بیٹھے ہیں

جو سچ پوچھو غزل کا فن تو پنہاںؔ
خود اپنی داد ہوتا جارہا ہے

خود پہ نازاں رہے غزل پنہاںؔ
ہم نہیں داد کے تمنائی

سراہیں گے تری غزلوں کو پنہاںؔ
خرد مندوں میں کچھ پاگل بھی ہوں گے

مگر پنہاںؔ بالکل مطمئن ہیں:

کچھ اور توقع تو زمانے سے نہیں ہاں
پنہاںؔ تری غزلوں کو سدا یاد کرے گا

غزل منبر اور دار سے سُنائی جاسکتی ہے۔ غزل جدیدیت اور روایت دونوں سے جڑی رہتی ہے۔ غزل حدیث دل ہے اور دلوں کی کیفیت کا بیان ہے۔ یہاں گفتگو کبھی تشبیہات، استعارات، اشارات اور علامات میں ہوتی ہے اور کبھی اَن کہی داخلی اور خارجی واردات میں۔ ذیل میں پنہاںؔ کے کچھ اشعار کسی مزید تشریح کے بغیر ہمارا مدعا ہیں۔

ارتقا کی تو حمایت میں غزل ہے پنہاںؔ
بس روایت سے بغاوت نہیں کرنے دیتی

غزل کو ڈر ہے کہ زندہ نہ دفن ہو پنہاںؔ
سزا ملے نہ صداقت کی بے حجابی کو

انھیں کی تہہ میں پنہاںؔ گوہر مقصود بھی ہوں گے
غزل میں استعاروں کے جو قلزم رقص کرتے ہیں

عموماً پنہاںؔ غزل کے مقطعوں میں غزل کی قدر و قیمت، وسعت، کرشمہ سازی، معنی آفرینی، حسن کاری اور طلسم کاری کی گفتگو کرتی ہیں۔ اگر ان

اشعار کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو غزل کا مزاج اور اس کے رتبے کا احساس ہو جائے اور یہ غزل کا قصیدہ بن جائے۔ پنہاںؔ شاعری سے خود کو الگ نہیں کرتیں اور ان کی تعلّی جو شاعرانہ درد و گداز کے ہمراہ ہے ان کو جچتا ہے۔ وہ اپنے کرب اپنی گوشہ نشینی اپنے فنی استغنا کے ساتھ خود شناس بھی ہیں۔

ہو کے پیدا بھی رہے جو پنہاںؔ
کون شاعر ترے جیسا پیدا

شاعری نشتر زخم پنہاںؔ
یہ مصیبت ہمیں اچھی دی ہے

خود میں پنہاںؔ کو عیاں کر لینا
خود شناسی ہی تو فن ہے میرا

اپنی غزلوں میں پنہاںؔ کو جو شاعری سے لگاؤ اور رچاؤ جو ایک مرض کی طرح پوری فکر کو بے قرار کیا ہوا ہے اس کو انھوں نے بڑے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ یوں تو ان کی غزل میں انتخاب مشکل ہے لیکن پھر بھی ذیل کے چند اشعار سے ان کے دل کے نہاں خانہ میں پہنچنا مشکل نہیں۔

جان من راحت جانِ پنہاںؔ
شاعری تنگ بہت کرتی ہے

زندگی خواب غزل خواب محبت پنہاںؔ
خواب در خواب جیا جائے تو کیا ہوتا ہے

شاعری سے ہی پوچھ لو پنہاںؔ
ایک احساس شاعرانہ ہوں
جہاد شاعری واجب تو پنہاںؔ
غزل پرچم غزل شمشیر میری

غبار دل سے ہے زرخیز پنہاںؔ
سحاب درد غزلیں رو گیا ہے

پنہاںؔ کی شاعری میں فلسفہ اور رمزیت بھی پنہاں اور عیاں ہے۔ مضامین کی بوقلمونی اور بالیدگی کے ساتھ فنی تقاضوں کا خاص احترام ہے۔

شعر کہیے تو شعر یوں کہیے
جس پہ نازاں ہو شاعری پنہاںؔ

زندگی بے ثبات ہے جاناں
عشق آب حیات ہے جاناں

میرے چہرے پر مری عمر رواں
وقت کے آذر کا فن آذری

وہ خالق نادیدہ پس پردہ تخلیق
پنہاںؔ میں عیاں ہو کے بھی پنہاں مرے آگے

پنہاںؔ کے یہاں عورت ہونے کا احساس اور اس کے ساتھ صدیوں کے صنف نازک پر ظلم اور موجودہ دور کی گھٹن کا احساس ہے لیکن اس احساس میں آزادی اور حریت کا جذبہ ہے وہ اپنے حق کو شکوہ اور حق کے ساتھ مانگتی ہے اور کسی قسم کے رحم کی طالب نہیں۔

انسان کو انسان نے انساں نہیں سمجھا
عورت ہوں میں صدیاں ہیں پشیماں مرے آگے
خوف آتا ہے کہ خود میں نہ کہیں
دفن زندہ کوئی عورت ہو جائے

بھائی کو دلائی گئی دنیا کی ہر اک چیز
میں روئی تو رکھ دی گڑیا مرے آگے

پنہاںؔ کے پاس موجودہ دور کی حسیت بدرجہ اتم موجود ہے یہاں ماحول کا درد اور اخلاقیات کا زوال اور فضیلت انسان کی رونمائی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دل کی ہُوک انسان کو انسان بنانے کے لیے ہے اور پنہاںؔ کی شاعری کا مقصد یہی ہے۔

غزل انسان کی دم ساز پنہاںؔ
تقاضے ہیں یہی شعر و ادب کے

جنگ میں جیت ہو کسی کی بھی
ہار انسانیت کی ہوتی ہے

پنہاںؔ کا انسانی درد شعروں سے عیاں ہے۔ وہ جانتی ہیں۔

انساں نے کر لیا ہے سفر تا بہ ماہتاب
باقی ہے دشت ذات مگر لق و دق ہنوز

اسی لیے تو کبھی کہتی ہیں:

دل سے لگ کر تری غزل پنہاںؔ
ساری دنیا کے درد روتی ہے

کاش پنہاںؔ کے دل جلے اشعار
روشنی تیرگی کی کر جائیں

پنہاںؔ کے سر میں محبت کا سودا ہے وہ اسی لیے امیدوار ہے کہ انسانوں کے دلوں میں دوسروں کے لیے جگہ بنے۔

ایمان و عبادت کا تو دعویٰ نہیں لیکن
انساں کی محبت کا ہے سودا مرے سر میں

قلبِ انساں ہو پنہہ گاہ جہاں
اس میں آفاق سی وسعت ہوجائے

غزل کی زبان اور اس کی ترکیبی ہیئت پر پورا غلبہ پنہاںؔ کی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ ویسے تو ان کے پاس چھوٹی چھوٹی بحر میں بڑے سے بڑے مضامین کوزے میں دریا کی مانند سمودیے گئے ہیں لیکن مہارتی تجربات غزلوں میں تھیکا پن اور جدت کے نقوش دکھاتے ہیں۔ یہاں ایسی بھی غزلیں ہیں جہاں مصرعوں میں صرف ایک لفظ قافیہ باقی سب ردیف ہے چھوٹی بحر میں لمبی ردیف کے ساتھ موزوں قافیہ کی کھپت آسان نہیں۔ خصوصاً پہلے سادہ مصرع کے ساتھ مصرعہ ثانی کو اٹھا کر محرابِ معانی میں سجا دینا۔ مطلع اور مقطع دیکھنے میں سطحی طور پر عام ہیں لیکن خوبصورتی یہ ہے کہ یہ معانی کے دفتر ہیں جسے کھول کر جو چاہے جی بھر کر پڑھ لے۔ یہاں تین قافیے زندگی آگہی اور شاعری نے ردیف کو گیرائی گہرائی کے ساتھ تہہ داری بھی دی ہے۔

زندگی میں دکھ بہت ہے
آگہی میں دکھ بہت ہے
جانے کیوں پنہاںؔ تمھاری
شاعری میں دکھ بہت ہے

اسی غزل کے دو اور شعر جو تضاد پر کھڑے کیے گئے ہیں معانی کے مینار ہیں۔

تاب گویائی نہیں اور
اَن کہی میں دکھ بہت ہے
تھا اندھیرا ہی غنیمت
روشنی میں دکھ بہت ہے

چھوٹی بحر میں بغیر کسی ترکیب اور خارجی الفاظ کے خوب صورت انوکھے مضامین سے غزل کا گلدستہ سجانا پنہاںؔ کی حسن کاری ہے جو درحقیقت غزل پر اجارہ داری ہے کہ جس لفظ کو جیسے چاہے تراش کر مصرعہ میں جڑ دیا۔

سارے گاما پا دھانی
سُر میں لیں سانسیں جانی
آئینے میں
حیرانی سی حیرانی
آنکھوں سے مت چھلکانا
اجڑے دل کی ویرانی

ہم نے جانتے ہوئے پنہاںؔ کی غزل میں محاسن بیان اور صنائع لفظی و معنوی کے ہمراہ محاوروں اور روزمرہ سے پیدا شدہ سادگی سلاست اور روانی کا اس لیے بھی ذکر نہیں کیا کہ جو عیاں ہو اس کا کیا بیاں ہو۔ دوسرا اس مختصر تحریر میں پورا پنہاںؔ کی شاعری کا جہاں یا کہکشاں کیسے نہاں ہو۔ مضمون کی تجزیاتی اُپج کے تحت ہم یہاں ایک غزل کے چند اشعار کا سطحی تجزیہ اور پھر کچھ فکر انگیز نادر اشعار سے شعریت کے ذہنی سلسلے کو ذہنوں میں زندۂ جاوید کرتے ہیں:

جانے کیسے دل سے دل ایسے ملے
سُر کوئی جیسے کسی لے سے ملے

مطلع ہی میں غزل کی زبان کا رچاؤ اور دلآویزی ہے۔ شعر کی غنایت تشبیہہ کی نغمگی سے غنی ہے۔

ایک انجانا فسوں ہے درمیاں
اُن کی نظروں سے نظر کیسے ملے

شعر رومان پرور اور دل رُبا ہے۔ دو لفظ انجانا فسوں شعر کی جان ہیں جس کی وجہ سے مضمون میں لطف پیدا ہوگیا۔ یہاں حیرت کے ساتھ ابہام بھی شاملِ حال ہے۔

زندگی ہم کو اگر ایسی ملی
زندگی کو بھی تو ہم ایسے ملے

یہ پورا شعر طلسم آفرینی پر مبنی ہے جس کو دو معمولی لفظ ’’ایسی‘‘ اور ’’ایسے‘‘ نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ یہاں شعر کی تشریح اور تفسیر ہر فرد کی ذوقِ فکر پر ہے۔ دیکھنے میں داغؔ کا رنگ ہے لیکن تاثیر میں کئی درجے بڑھا ہوا ہے۔ مقطع میں بانسری کے خالی پیکر کو اپنی خلوت سے ملا کر پنہاںؔ نے اپنی شاعری کو اسی خلا اور تنہائی کا درد کہا ہے۔

دل میں جو پنہاںؔ خلا اندر خلا
نغمہ زار جاں اسی نے سے ملے

آخیر میں نئے مطالب اور نادر فکر و خیال کے چند اشعار پڑھیے اور سر دُھنیے:

ٹوٹ جائیں نہ زخم کے ٹانکے
درد پھر لے رہا ہے انگڑائی

ہم اپنے رنگ میں رنگتے ہیں اُس کو
خدا بے رنگ سی اک روشنی ہے

بس زمیں پیرہن بدلتی ہے
جب بدلتا ہے آسماں موسم

یہ شاید شاعری ہی بتا سکے؟

شاعری سے یہ پوچھنا پنہاںؔ
لوحِ محفوظ میں لکھا کیا ہے

خزاں کا گیت

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

زیرِ نظر کتاب ''خزاں کا گیت'' کے مصنف ڈاکٹر فیروز عالم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ افسانہ نگار ہیں۔ وہ اردو ادب سے والہانہ محبت رکھنے والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو تقسیمِ ہند کے بعد مراد آباد (یوپی) سے ہجرت کر کے میر پور خاص (سندھ) منتقل ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میر پور خاص اور لیاقت میڈیکل کالج کراچی سے مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خاطر امریکہ چلے گئے جہاں مزید تعلیم و تربیت مکمل کرنے کے بعد بطور ماہر امراضِ گردہ وغیرہ (Urologist) لگ بھگ تیس سال خدمات سرانجام دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اردو ادب کے حوالے سے لاس اینجلز کے ادبی حلقوں میں بھی ایک مقبول شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے رہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کو اردو ادب سے بے انتہا لگاؤ اپنی باذوق تعلیم یافتہ والدہ سے ورثہ میں ملا۔ جنہوں نے بچپن سے ہی انہیں شعر و ادب سے اتنا منسلک کئے رکھا کہ اردو ادب سے محبت ان کی رگوں میں رچ بس گئی۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ گیارہ سال کی عمر میں لکھا جو بچوں کے صفحہ پر روزنامہ ''امروز'' میں شائع ہوا۔ کالج کی تعلیم کے دوران وہ کالج کے اردو رسالہ کے نائب مدیر اور بعد میں لیاقت میڈیکل کالج کے رسالہ کے مدیرِ اعلیٰ کے طور پر ادبی سرگرمیوں کا محور بنے رہے۔ اردو ادب سے ان کے گہرے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرحلہ پر انہوں نے میڈیکل تعلیم ترک کر کے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن والدہ کے سمجھانے اور اصرار پر انہوں نے میڈیکل تعلیم جاری رکھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر فیروز عالم گو کہ ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن مزاج کے طور پر وہ ادب کے شیدائی اور ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔

قارئین کے لیے یہ امر باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ان کے والدین نے پیدائش کے بعد ان کا نام ڈاکٹر فیروز عالم رکھا اور یہی نام داخلہ کے موقع پر سکول میں درج کرایا چنانچہ وہ شروع سے ہی ڈاکٹر فیروز عالم کہلائے جانے لگے اور یہ بات کم ہی دیکھنے یا سننے میں آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''خزاں کا گیت'' ڈاکٹر فیروز عالم کے تحریر کردہ انتہائی دلچسپ اور سنسنی خیز اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں زیبِ داستاں کے لیے غیر ضروری مکالمے یا ڈرامائی رنگ بالکل شامل نہیں بلکہ ہر افسانہ اپنے موضوع سے قریب تر سچی کہانی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' کے نام سے پیش کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''ہوا کے دوش پر'' اپنی ذاتی زندگی کے پہلے دور کا تفصیلی اور دلچسپ بیانیہ اور مشہور غیر ملکی افسانوں کے اردو تراجم ''اُفق کے اُس پار'' کے نام سے کتابی صورت میں قارئین کی نذر کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔ اسی طرح عوام کی خدمت کے جذبہ کے تحت آگاہی کے لیے آسان اور شفاف اردو میں مختلف امراض کے بارے میں بنیادی اور ضروری طبی معلومات پر مشتمل مضامین روزنامہ ''جنگ''، ''چہارسُو'' اور دیگر جرائد میں سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔

دنیا بھر میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے اور اردو ادب سے محبت کرنے والے پاک و ہند کے علاوہ دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں۔ اردو ادب کی تخلیق و ترویج ان گنت ادیبوں، شعراء، ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی قابلِ قدر کاوشوں کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا شمار بلاشبہ انہی معروف شخصیات میں ہوتا ہے۔

حساس طبیعت اور دردِ دل رکھنے والے ڈاکٹر فیروز عالم کی زندگی محنت، لگن، خدمتِ خلق اور گہرے مشاہدے اور تجربات کی داستان ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اپنے پیشہ ورانہ تجربات اور مشاہدات پر مبنی انہوں نے جو کہانیاں تحریر کی ہیں انہیں پڑھتے ہوئے قاری ان میں یوں کھو جاتا ہے کہ وہ اسے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑ سکتا اور کہانی کے اثرات دیر تک اس کے ذہن پر حاوی رہتے ہیں۔

''خزاں کا گیت'' میں شامل ان کا ''ناموس کی قیمت'' ایک ایسے فرد کی داستان ہے جو اپنے علاقائی رسم و رواج اور اقدار کو اپنے اندر بسائے غمِ روزگار میں امریکہ جا کر آباد ہو گیا۔ شادی کے بعد اُن کے ہاں ایک پیاری بیٹی نے جنم لیا جسے وہ دل و جان سے چاہتا اور پیار کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس نے عہدِ شباب میں قدم رکھا تو مغربی تہذیب کے اثرات اُس کے اطوار و عادات سے عیاں ہونے لگے جبکہ یہ تبدیلی احمد شاہ کے لیے کسی طور قابلِ قبول نہیں تھی جس کے نتیجہ میں مشرقی اور مغربی اقدار کے تصادم سے ایک ایسا دردناک انجام ظہور پذیر ہوا جسے پڑھ کر نہ صرف رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ آنکھیں بھی پُرنم ہو جاتی ہیں۔

افسانہ ''باوقار تدفین'' ایک باہمت نوجوان کی داستان ہے جسے بچپن سے ہی فائر مین بننے کا بے حد شوق تھا۔ والدین نے اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے بھرپور تعاون کیا اور یوں اس نے اپنا نصب العین حاصل کر لیا۔ فائر مین بننے کے کچھ ہی عرصہ بعد 9/11 کا اندوہناک واقعہ پیش آیا جس میں ہزاروں لوگ آناً فاناً لقمۂ اجل بن گئے۔ آگ کے شعلوں اور ملبے تلے دبے بدنصیب افراد کی جانیں بچانے کے لیے جو ریسکیو ٹیمیں اور فائر بریگیڈ کا عملہ پوری جانفشانی سے برسرِ کار تھا انہی میں یہ باہمت اور پُرجوش نوجوان باب (Bob) بھی شامل تھا جس نے انتہائی بہادری اور جرأت سے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے اپنی جان

قربان کردی۔اس دردناک سانحہ میں لاتعداد لوگ راکھ کے ڈھیر میں یوں تبدیل ہوئے کہ اُن کے والدین اور دیگر چاہنے والے ان کا نام ونشان تک نہ پا سکے۔ انہی بدنصیب افراد میں باب کے والدین آہ وبکا کرتے ہوئے دعائیں کررہے تھے کہ کاش انہیں اپنے بیٹے کے جسم کا کوئی ذرہ برابر حصہ ہی مل جائے جسے وہ دفن کر کے کچھ سکون حاصل کرسکیں۔ان کی یہ خواہش کیسے پوری ہوئی مصنف نے ''باوقار تدفین'' میں نذرِ قارئین کیا ہے۔

''گئے دنوں کی کہانی'' بنتی بگڑتی قسمت کی ایک انوکھی داستان ہے جو ایک انتہائی خوبرو نوجوان اور تعلیم یافتہ لڑکی کی کہانی ہے جب وہ اپنی جوانی کے عروج پر تھی اور ہر کوئی اس کی خوبیوں، حسن وجمال اور دلکش آواز پر رشک کرتا تھا۔ اس کی زندگی میں اچانک ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے اُسے ایک مشکل امتحان میں ڈال دیا کیونکہ اس کی خوبیاں ایک حادثہ کے نتیجے میں جزوی طور پر معذوری میں تبدیل ہوگئیں۔حالات نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر وہ روشن مستقبل کے خواب دیکھنے لگی لیکن کاتبِ تقدیر نے اس کی قسمت میں ایک اور بڑی آزمائش لکھی ہوئی تھی جب منزل کے بالکل قریب پہنچ کر وہ ایک شدید جذباتی دھچکہ سے دوچار ہوئی جس پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔باوجود اس کے کہ وہ ہر بار معصوم اور بے قصور تھی۔ ''گئے دنوں کی کہانی'' ایک جذباتی داستان ہے جو قاری کو اپنی پوری گرفت میں لے لیتی ہے۔

گذشتہ صدی کی ساٹھ ستر کی دہائیاں عالمی، معاشی اور سیاسی تناظر میں خاص اہمیت اور دلچسپی کا باعث تھیں۔اس عرصہ میں مشرق وسطیٰ کے ممالک تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باعث تعمیری سرگرمیوں میں مصروف تھے لیکن وہ افرادی قوت کی قلت کا شکار تھے۔تیسری دنیا کے لوگ روزگار کی تلاش میں بیرونِ ملک جارہے تھے۔انہی لوگوں میں احمد نامی ایک نوجوان بھی شامل تھا جس نے اپنے حال کو مستقبل پر قربان کردیا اور کام کے لیے معقول معاوضہ حاصل کرنے کے لیے سعودی عرب چلا گیا۔''آج رات جھوم لے'' اسی نوجوان کی داستان ہے۔وہ سال میں دوبار اپنی بیوی اور والدین سے ملنے وطن جاتا اور ہر سال دومرتبہ اپنی بیوی کو دو ہفتوں کے لیے اپنے پاس سعودی عرب بلا لیتا۔گو کہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ایک پیار کرنے والی رفیقۂ حیات عطا کی تھی۔احمد دن رات محنت کر کے اتنی رقم جمع کرنا چاہتا تھا جس سے وہ اپنا ایک آرام دہ گھر بنا کر باقی عمر آرام سے گزار سکے۔اس تگ ودو میں عمر عزیز کا ایک قیمتی حصہ سعودی عرب میں ہی گزار دیا۔اس جدوجہد میں احمد نے کیا کھویا اور کیا پایا اور اپنے مقصد کے حصول میں وہ کس حد تک کامیاب رہا یہ جاننے کے لیے ''آج رات جھوم لے'' پڑھنے کے بعد ہی قاری فیصلہ کرسکتا ہے۔

''خزاں کا گیت'' میں شامل تمام افسانے موضوع کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ اور سنسنی خیز ہیں جنہیں پڑھ کر ڈاکٹر فیروز عالم کی تخلیقی اور قلمی صلاحیتوں کا بجا طور پر اعتراف لازم ہے۔

Beautiful 10 lines

1). PRAYER is not a "spare wheel" that YOU PULL OUT when IN trouble, but it is a "STEERING WHEEL" that DIRECT the RIGHT PATH THROUGHOUT LIFE.

2). Why is a CAR'S WINDSHIELD so LARGE & the REAR VIEW MIRROR so small? BECAUSE our PAST is NOT as IMPORTANT as OUR FUTURE. So, LOOK AHEAD and MOVE ON.

3). FRIENDSHIP is like a BOOK. It takes a FEW SECONDS to BURN, but it TAKES YEARS to WRITE.

4). All THINGS in LIFE are TEMPORARY. If they are GOING WELL, ENJOY them, they WILL NOT LAST FOREVER. If they are going wrong, don't WORRY, THEY CAN'T LAST FOREVER EITHER.

5). Old FRIENDS are GOLD! NEW friends are DIAMONDS! If you GET a DIAMOND, DON'T FORGET the GOLD! To HOLD a DIAMOND, you ALWAYS NEED a BASE of GOLD!

6). Often when WE LOSE HOPE and THINK this is the END, GOD SMILES from ABOVE and SAYS, "RELAX, SWEETHEART; it's JUST a BEND, NOT THE END!"

7). When GOD SOLVES your PROBLEMS, you HAVE FAITH in HIS ABILITIES; when GOD DOESN'T SOLVE YOUR PROBLEMS, HE has FAITH in YOUR ABILITIES.

8). A BLIND PERSON asked GOD: "CAN THERE be ANYTHING WORSE THAN LOSING EYE SIGHT?" HE REPLIED: "YES, LOSING YOUR VISION!"

9). When YOU PRAY for OTHERS, GOD LISTEN to YOU and BLESSES THEM, and SOMETIMES, when you are SAFE and HAPPY, REMEMBER that SOMEONE has PRAYED for YOU.

10). WORRYING does NOT TAKE AWAY TOMORROW'S TROUBLES; IT TAKES AWAY today's PEACE.

نادیدہ فصیل

نازیہ پروین
(فیصل آباد)

دوروز قبل باؤجی (گلزار جاوید... چہارسو) نے مجھے اطلاع کی کہ انہوں نے انل ٹھکّر جی کی کتاب بھیجی ہے اور ساتھ ہی یہ اطلاع کہ میرا اور ٹھکّر جی کے آباواجداد کا تعلق ایک ہی جنم بھومی سے ہے۔ میرے لیے خوشی کا باعث تھا۔ دھرتی کی کشش بھی خون کی روانی سے پورا پور اسنبد ھ رکھتی ہے۔ وزیر آغا کا نظریہ "دھرتی پوجا" تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ کیا کر دیا باؤجی آپ نے کہ ان دیکھے مان کے پوتر سمان کے تخت و تاج کی منصبی کے لیے میرا نام منتخب کیا تو کیوں کر میں تو ادب کی ادنیٰ اور نکمی طالبہ ہوں۔ یہ مان سمان بھی عجیب تعلق کی ڈور ہے جو سانسوں اور خیالات کو ان دیکھے رشتے میں یوں باندھتی ہے کہ پھر عمر بھر کے لیے اس کی مقدسیت کے سامنے پلکیں نظر بار نہیں ہو سکتیں اور دل کی ڈھرکن کی رفتار کو یکبارگی طلاطم خیز بناتی ہے اور جزبات کو اس طرح انگیختہ کرتی ہے کہ سکون اور فخر کی فضا چاروں اوور چھا جاتی ہے۔ انل ٹھکّر صاحب میرے لیے انجان ہستی تھے۔ باؤجی نے صرف نام سے روشناس کروایا تھا اور کچھ نہیں جانتی تھی مگر اس مجموعے "نادیدہ فصیل" کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میری تو جنم جنم سے ان سے شناسائی کا رشتہ ہے بلکہ ہر انسان کا ہی جس طرح ٹھکّر صاحب نے احساسات کو قلم کی نوک سے لفظوں کا لباس عطا کیا وہ معاشرتی بے اعتدالی کے رستے ہوئے ناسور پر مرہم پٹی کرنے کی عمدہ مثال ہے۔ "نادیدہ فصیل" نام پڑھتے ہی ایک طلسماتی کشمکش نے جنم لیا کہ اس نام میں کیا کشش ہے پس پردہ اور زیریں سطح پر اس لفظ کی بنیادوں میں کیسا سوگ اور نوحے کرلا رہے ہیں اور اس کتاب کے صفحات میں کیا دفینے چھپے ہوئے ہیں جن کے آگے مصنف نے نادیدہ فصیل کھڑی کی ہے، کس راز کی پردہ پوشی مطلوب اور کس کی پردہ کشائی مقصود ہے اس کتاب کے سرورق پر رات کی تاریکی، جزبات کی شدت سے زیر بار طوفان میں کڑکنے والی بجلی، دہشت اور خوف کی عکس بندی سیاہ اور نیلے رنگ سے کی گئی ہے جو زندگی کے اتار چڑھاؤ کا بہترین امتزاج کی علامت ہے۔ جس نے اس مجموعے کی پراسرایت میں اضافہ کیا اور میرے جیسی نکمی اور نالائق قاری کے شوق مطالعہ کے اسپ کو مہمیز کرنے کے لیے چابک کا کام کیا۔ اشاعتی ادارے اور پبلشر کی منصف سے دلی وابستگی کا عمدہ ثبوت ہے۔ نادیدہ فصیل مصنف کی محنت شاقہ اور کاوش کی عرق ریزی کا اظہار صفحات پر موتیوں کی شکل میں جزبات کے بے کراں سمندر کو سموئے اور سمیٹے ہوئے ہے۔ انتساب وینکیا کامل کلادگی کے نام مصنف سے قربت کا خوبصورت اظہار ہے۔ مجموعہ میں نو افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ اپنی جگہ باکمال ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نو افسانے نہیں بلکہ نورتن ہیں جیسے جیسے ایک کے بعد ایک افسانہ نظر کے سامنے آیا۔ وہ ایسا جڑاؤ نگینہ تھا۔ تاج محل کی سی شان، بان اور آن لئے اپنی جگہ ایستادہ نظر آیا اور فیصلہ کرنا مشکل ہوتا گیا کہ کسے سراہا جائے اور کس افسانے پر تنقید کی جائے۔ ہر افسانے کے عنوان سے لے کر پلاٹ، کردار، فضا بندی، مکالمے، زبان دانی اور جزبات کی عکاسی اتنی جاندار اور بھرپور نظر آئی کہ ڈھرکن کا زیر و بم متن کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔

"ایک پیالی چائے کی" کی کہانی ہلکے پھلکے انداز میں شروع ہوئی اور اختتام اتنا سبق آموز اور جان آور کہ روایات اور اقدار کے سامنے کاروباری اصول وقوانین ہیچ نظر آتے ہیں، قرض کی مد میں سود کا اژدھا زندگی کے سکون کو ہڑپ کر جاتا ہے اور زندگی کا بیشتر حصہ ساہوکار کے ہاتھوں تزلیل کا سامنے کرتے گزر جاتی ہے۔ اور ایک چائے کی پیالی اور مہمان نوازی کی روایت عقل اور شعور کو ششدر کر دینے کی پوری طاقت رکھتی ہے

"خوشبو" کا نام پڑھتے ہی پروین شاکر بے ساختہ یاد آ ئیں۔ وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا۔ تو اس افسانے کی خوشبو بھی اعصاب پر سوار محسوس ہوئی جو ذات پات، مزہب، عقیدوں اور رنگ ونسل کے طوق سے آزاد ہو کر ہر طرف مہکا گیا اور بے ساختہ زبان پر سبحان اللہ اور پلکیں نم نظر آ ئیں۔

"اب کہ جب میں رنگے ہاتھوں پکڑ آ گیا ہوں لوگ مجھے دہشتگرد تصور کر رہے ہیں آپ بھی شیطان کے لقب سے نوازنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجبوراً مجھے کہنا پڑ رہا ہے......سب عبادت میں محو رہتے میں طہارت خانوں میں اینٹ کے ڈھیلے ہٹا ہٹا کر ایک طرف رکھتا تا کہ غیر متحرک پیشاب اپنے ساتھ بدبو کو لے کر رواں ہو جائے اور آپ سب سکون سے طہارت سے فارغ ہو کر پاک سانس سے نماز پڑھ سکیں"

احساس وجذبات کا عمدہ مرقع ہے" کیا نام دیں" کو پڑھتے ہوئے دل بہت اداسی اور بوجھل کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے کہ ایک طرف برسوں کی پرانی دوستی کا مان اتنا مضبوط ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست کی خوشی کی خاطر اپنے اہم اور ضروری کام پس پشت ڈال کر قرض لے کر دیار غیر میں شرکت کے لیے آتا ہے جبکہ دوسری طرف ایک باپ وسوسے اور دل میں چھپے خوف کے زیر اثر برسوں پرانی دوستی کا اتمان کرتا نظر آتا ہے۔ اور دوستی کے لازوال رشتے پر جزباتیت اور ذہنی خوف کی فضا بھاری نظر آتی ہے۔

"سرپرست "ایک ایسے خوف کا سایہ اوڑھے ہوئے ہے جس میں جوانی کے داغ دار ہونے کا ذہنی خوف حاوی اور خونی رشتہ دب جاتا ہے مگر آنسوؤں کی رم جھم میں دو بھیگی آنکھیں اور کپکپاتے لب بے خوفی سے محبت کی چاشنی کو آنچ دیتے دکھائے گئے ہیں۔ "علامت فردا" معاشرتی جرائم (چھوٹی عمر کی بچیوں سے زنا اور زیادتی) نے پڑھے لکھے طبقے کے والدین کے دل ودماغ اور چہروں پر عصمت دری کے واقعات کی وجہ سے خوف وہراس کی چادر تنی ہوئی ہے۔ نیند جسے

ذہنی سکون کا زینہ سمجھا جاتا تھا وہاں بھی اب خوف کے آسیب نے بسیرا کر رکھا ہے۔

"نادیدہ فصیل" کی بنیادوں میں دو دلوں کی ڈھرکن، آنکھوں کا انتظار اور ویرانی، ہونٹوں سے ہنسی کی چھنکار بے خبری میں چھن کر چپ کا قفل ماتم کناں ہے۔ وقت کی پانچ دہائیوں کے سفر نے مسافروں سے انمٹ دوری کو پاٹنے کا حق چھین لیا ہے۔ تین بول "طلاق" زمانے سے ٹکر لینے والے تازہ اور نوخیز ذہنوں بوسیدگی اور پچھتاوے کے جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہاں زندگی بھر اپنے حصے کا ایندھن ڈھونے میں عمر بیت جاتی ہے۔ اور زندگی کی رمق ختم ہونے پر بھی دو آنکھوں کا انتظار ختم نہیں ہوتا۔ یہ کیسا بندھن تھا کہ تین لفظوں کے کاری وار جیسے ناگ سے ڈسنے اور نادیدہ فصیل اٹھ جانے کے بعد بھی دل سے دھڑکن جدا نہیں ہوئی جو عمر بھر ایک دوسرے کے لیے رواں دواں تھی۔" یک لخت اسے خیال آیا کہ سحر کی انکھیں کس کی منتظر تھی"

"لمس" ایک پورے جہان اور انوکھی دنیا کا نام ہے۔ جس سے آشنائی بھی بری اور ناآشنائی بھی۔ لمس کبھی پورے وجود میں حسرت بھر دیتا ہے تو کبھی دہکتے انگارے تو کبھی فرحت اور نشاط کی دل فریبی کا قوی احساس... لمس صرف اور صرف سچ ہے اس کا تعلق جذبات خواہ وہ اچھے ہوں یا برے.... بعض الفاظ کا لمس انسان کے لئے تازیانے کا کام کرتا ہے اور اس اذیت میں پوری زندگی کا محور ڈھڑا ڈھڑ تڑپتا نظر آتا ہے۔ اس کی اذیت کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جاتی ہے"۔ بدچلن اس لفظ کا بھی ایک لمس تھا اس نے محسوس کیا جیسے اس کی روح کو جھلسا کر رکھ دیا ہے"

"سنک" انجانے میں پیدا ہونے والی غلط فہمی اور لہجے کا کاٹ سے روح دہلا دینے والی تحریر ہے۔ بعض لہجے اور نظر کی کاٹ سچ کو بھی جرم بنا دیتی ہے یہ افسانہ ماں کے جزبات اور زندگی بھر کی اذیت ناکی کی بھرپور داستان ہے۔

"جنت کا راستہ" اس کہانی سے منصف نے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں مزہب، عقیدت، احترام اور پاکیزگی کا نام ہے تو دوسری طرف معاشرے کے چند عناصر مزہب کو بھی بیوپار بنا لیتے ہیں۔ مذہب کی آڑ میں انسانیت کی تزلیل، روایات سے انحراف اور مغربی تہذیب سے اثر پزیری پر گہری چوٹ دکھائی دیتی ہے یہ لوگ مزہب کے نام پر دھوکہ دہی، فریب اور خیانت اپنا لیتے ہیں اور نئی نسل کے ذہن کو پراگندہ کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

مصنف کے تمام افسانوں میں ندرت خیالی، اسلوب کی سلاست اور زبان کی روانی جیسا وصف نمایاں ہے۔ مصنف کے قلم نے جزبات انسانی۔ آنکھوں کی ویرانی اور لہو کی روانی میں چھپے کرب کو صفحۂ قرطاس پر لانے کا حق ادا کر دیا۔ شروع سے آخر تک قاری کے جزبات و احساسات کو لفظوں کے اتار چڑھاؤ اور ان دیکھی دنیا کے طلسم نے اپنا گرویدہ بنا لیا......

- بقیہ -

سمے کی کہانی

باہر ویلفیئر سنٹر کی گاڑی ہارن پہ ہارن دے رہی تھی۔ انیسہ بیگم نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

ماما! دادو کہاں جا رہی ہیں۔ سونی اور شانی زور زور سے رونے لگیں۔

ہاں! اماں جی آپ کیوں جا رہی ہیں؟ بچیاں اچھی بھلی آپ سے Attached تھیں نغمانہ مصنوعی پیار جتاتے ہوئے بولی۔

انیسہ بیگم پلکوں میں ڈھیروں آنسو چھپائے گھر پہ ایک الوداعی نظر ڈالتیں گاڑی میں آ کے بیٹھ گئیں۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی انہوں نے بے اختیار کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا مگر ان کے گھر کا دروازہ بند تھا۔

☆

شعری مشین

"۔۔۔ایک بار میں حضرت سیماب کے دولت کدہ پر ایک دن کے لیے ٹھہرا بھی تھا، بڑی تواضع سے پیش آئے۔ صبح کے وقت ان کا معمول تھا کہ نماز پڑھ کر شہد اور انڈے کا ناشتہ کرتے اور تھوڑی دور ٹہلنے کے لیے نکل جاتے۔ پھر میں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قصرالادب میں ایک تکیہ کے سہارے تخت پر جھکے ہوئے بیٹھے ہیں، شاگردوں کی غزلیں اور نظمیں پھیلی ہوئی ہیں اور اصلاح دیتے چلے جاتے ہیں۔

اردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ادارہ؟ تصنیف و اصلاح قائم کیا جہاں اجرت پر ناول، کتابیں، نظمیں، غزلیں اور سہرے لکھے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک اشتہار میں 'دیوان' کی اجرت پانچ سو روپے درج تھی۔ حضرت سیماب کی شاعرانہ قوتیں دوسروں پر کافی صرف ہوئیں، کاش وہ تمام کی تمام انھی کے کام آتیں۔ پُرگوئی اور زُودگوئی کا یہ عالم تھا کہ نثر کی طرح کاغذ پر شعر لکھتے جاتے تھے۔ وہ دس بارہ منٹ میں ایک غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کا دماغ کثرتِ شعرگوئی کے سبب شعرسازی کی سچ مچ ایک مشین بن گیا تھا۔۔۔"

مولانا ماہرالقادری

کشور ناہید سے کشور آپا تک

فرح کامران
(نیویارک)

پچھلے دنوں مشہور شاعرہ اور حقوق نسواں کی جدوجہد میں پیش پیش کشور ناہید سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی بڑی شخصیت سے مل کر انسان کو ایک اعزاز سا محسوس ہوتا ہے اور طبیعت ایک عرصے تک خوشگوار رہتی ہے۔ کشور ناہید سے مل کر خوشی تو ہوئی لیکن اس کیساتھ طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا۔ پھر یہ بات سمجھ میں آئی کہ اپنے اندر کی ہلچل/ جذبات کو کاغذ پر اتار دینا ہی مسئلے کا حل ہے۔ بس یہ ہی سوچ کر میں نے بھی کشور ناہید سے ملاقات کے بارے میں اپنے احساسات کو قلمبند کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں میں نیویارک کے ایک لوکل ٹی وی چینل پر شاعروں اور ادیبوں کے انٹرویو کیا کرتی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ حلقہ ارباب ذوق نیویارک کے سالانہ مشاعرے میں اس بار پاکستان سے کشور ناہید تشریف لا رہی ہیں، دل میں خواہش ہوئی کہ ان کا بھی انٹرویو کرلیا جائے۔ لیکن اس خیال سے ہی مجھ پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی اور خون خشک ہونے لگا۔

کشور ناہید گزشتہ کئی برسوں سے اسلام آباد میں مقیم ہیں اور میرا تعلق بھی اسلام آباد سے ہی ہے، تو ایسا نہیں کہ ان کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بارہا سامنا ہوا لیکن بس دور سے دیکھنے پر اتفاق کیا، بات کرنے یا ساتھ تصویر بنوانے کی ہمت کبھی نہ پڑی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہی نہیں تھی کہ وہ ایک معروف شاعرہ تھیں یا حقوق نسواں کی نمایاں اور سرگرم رکن تھیں۔ یہ ہچکچاہٹ اس لئے تھی کہ میں نے ان کے بارے میں بہت سی باتیں سن رکھی تھیں۔ مثلاً بہت سخت مزاج ہیں، زبان کی بہت تیز ہیں، جب دل چاہے لوگوں کی بے عزتی کر دیتی ہیں اور اس کے علاوہ اور بہت سے ذاتی باتیں، یہاں تک کہ اچھی عورتوں کو ان سے نہیں ملنا چاہئے، کسی نے یہاں تک کہہ دیا کہ کیا تمھیں پتا نہیں کہ یہ وہ ہیں کہ ان سے مردانی عورتوں کا پردہ کراتے ہیں۔ تو اب انٹرویو کرنے کی خواہش سے دل نے تو گھبرانا ہی تھا۔ لیکن اب جب ارادہ کرلیا تھا تو بہتر یہ سمجھا کہ کشور ناہید سے امریکہ آنے سے قبل ہی رابطہ کر کے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا جائے، تا کہ اگر ان کو میری یہ بات ناگوار گزرے تو منہ در منہ بے عزت ہونے سے بچا جا سکے۔

کشور ناہید سے رابطہ کرنے کے لئے جو پہلا نام میرے ذہن میں آیا وہ ہمارے بہت ہی عزیز دوست ارشد رضوی کا تھا، وہ کئی بار مجھ سے اس بات کا ذکر کر چکے تھے کہ ان کے کشور ناہید سے اچھے دوستانہ مراسم ہیں۔ انھوں نے ہی میری اس خواہش کی تکمیل کے ابتدائی مراحل طے کرائے اور مجھے کشور ناہید کی اجازت سے ان کا ای میل فراہم کیا اور یوں میں نے کشور ناہید کو ای میل کر کے اپنا مختصر تعارف کروایا (جو کسی بھی طرح سے ان پر کوئی تاثر قائم کرنے کے لائق نہ تھا) اور اپنا مدعا بیان کر دیا۔ میری توقع کے برعکس فوراً ہی ان کا جواب آ گیا کہ ان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ یہاں نیویارک میں ڈاکٹر سعید نقوی کے گھر ٹھہریں گی اور میں ان سے اس سلسلے میں رابطہ کرلوں۔ میرے حوصلے کچھ بلند ہوئے۔ افسانہ نگار، ناول نگار، شاعر، مترجم ڈاکٹر سعید نقوی، اور نظم اور غزل میں اپنی منفرد پہچان رکھنے والی شاعرہ شہلا نقوی نے کشور ناہید سے ملاقات کے باقی مراحل طے کرانے میں میری مدد کی جس کے لئے میں ان کی شکر گزار ہوں۔

ان کے علاوہ جس تیسری شخصیت نے اس سلسلے میں میری مدد کی وہ نیویارک یونیورسٹی میں اردو کے شعبہ سے وابستہ پروفیسر طاہرہ نقوی ہیں جنھوں نے کشور ناہید کے نیویارک پہنچنے کے اگلے ہی دن ان کے اعزاز میں دئے ہوئے کھانے پر مجھے بھی مدعو کرلیا اور یوں میں ایک معروف شاعرہ، تحریک نسواں کی علمبردار اور ایک قدآور ادبی شخصیت کے سامنے کھڑی تھی۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "یہ فرح کامران ہیں" طاہرہ نقوی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔۔۔ "اوہ تو تم ہو فرح کامران، کب سے کر رہی ہو یہ کام"۔۔۔ "بس ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا ہے۔۔۔ میں نے بڑے سنبھل کر جواب دیا۔۔۔

کشور ناہید۔۔۔ درمیانہ ڈیل ڈول رکھنے والی، سادہ سے شلوار قمیض میں ملبوس، بظاہر مجھے خاصی سادہ سی خاتون لگیں۔ گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ ابھی مجھ پر طاری تھی، یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اور کشور ناہید ایک ساتھ ہیں۔ وہاں پر ہم پانچ خواتین تھیں؛ میں، کشور ناہید، طاہرہ نقوی، شہلا نقوی اور جانیکی۔ گفتگو عورت کے مسائل کے گرد گھومتی رہی۔ جانیکی نے کشور ناہید کی مشہور نظم "ہم گناہ گار عورتیں" پر ایک کتھک بیلے تیار کیا تھا، ہم نے وہ اور اس کے ساتھ ہی عورت کے موضوع پر اردو شاعرات کی نظموں پر مبنی کئی اور کتھک بیلے دیکھے۔ یوں کشور ناہید کے ساتھ بے تکلفانہ ماحول میں چند گھنٹے گزارنے کا موقع مل گیا۔ اس ملاقات کا پہلا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مجھے کشور ناہید کو جاننے کا موقع ملا، جو یقیناً صرف ٹی وی انٹرویو کرنے کی صورت میں نہ ملتا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے انٹرویو کے سلسلے میں جو گھبراہٹ مجھ پر طاری تھی، اس میں خاصی کمی آ گئی۔ ان کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے میں نے جانا کہ کشور ناہید بے حد سادہ، پیار کرنے والی سچی اور کھری لیکن دبنگ خاتون ہیں۔ زندگی، حق و صداقت، انصاف اور حقوق نسواں پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہیں، اس سے چاہے ان کی اپنی ذات کو کوئی بھی نقصان پہنچے۔ اپنی نصف صدی کی اس کوشش کو وہ کسی قسم کی قربانی کا نام دینے کو بھی تیار نہیں کہ بقول ان کے، "جو کیا شعور سے کیا"۔

یہ شاید کشور ناہید کی ملاقات کا اثر تھا کہ ذہن کہیں ماضی کی حسین وادیوں میں بھٹکنے لگا۔ پھول، تتلیاں، جگنو، گڑیاں۔ کاغذ کی کشتیاں، ہم جولیاں، بغیر کسی وجہ کے اونچے اونچے قہقہے دل کے دروازے پہ آہستہ آہستہ دستک دینے لگے۔ میری ساری زندگی اسلام آباد میں گزری۔ بظاہر پڑھنے لکھنے پر کوئی پابندی

نہیں تھی۔ بلکہ والد صاحب ہمیشہ اعلیٰ تعلیم کی تلقین کرتے رہے۔ یہ ہی نہیں ان کے لئے میں ہمیشہ ہی ان کے بیٹوں کے مقابلے میں قابل فخر رہی، گھر سے باہر نکلتے ہوئے سر پہ دوپٹہ لینے کی کوئی ایسی پابندی بھی نہ تھی، گھر سے باہر جانے یا سہیلوں سے ملنے کی بھی کسی حد تک آزادی تھی لیکن مجھے یہی لگتا تھا کہ معاشرے کی نظریں میرا تعاقب کررہی ہیں، یہ نظریں مجھے یہ احساس دلاتی رہتی کہ میں کچھ غلط کررہی ہوں۔۔۔ بولتی زیادہ کیوں ہوں، اتنا ہنستی کیوں ہوں، ہر ایک سے بلا جھجک بات کیوں کرلیتی ہوں، لڑکوں سے بات کیوں کرتی ہوں، ہر ایک سے فوراً دوستی کیوں کرلیتی ہوں، اتنی زیادہ خوداعتمادی کیوں ہوں۔۔۔ یہ سب میرے عیب تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں ہر وہ کام کروں جو میرے بھائی کرتے تھے۔۔۔ لیکن لوگوں کے مطابق یہ سب غلط ہورہا تھا اور لڑکی ہونے کے ناطے یہ سب کچھ مجھے زیب نہیں دیتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ لوگ میری امی سے کہہ دیتے تھے کہ "آپ کی لڑکی بہت تیز ہے" "یا" آپ نے اپنی لڑکی کو بہت آزادی دے رکھی ہے" مجھے امی کے چہرے کی وہ شرمندگی آج بھی یاد ہے۔ شاید معاشرے کی انھیں باتوں کی وجہ سے امی کی کڑی نگاہ ہر وقت مجھ پر رہتی تھی۔ میں سہانے سپنے دیکھنا چاہتی تھی لیکن میری ماں مجھے بھیانک تعبیروں سے روشناس کرواتی رہتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میرا اپنے خوابوں کی دنیا میں جینا میری ماں کو کیوں اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان کی بے جا روک ٹوک کبھی کبھی مجھے الجھا دیتی اور مجھے یہ بھی سمجھ میں نہ آتا کہ میں کیا غلط کررہی ہوں۔ کیونکہ میں تو کوئی غلط کام کر ہی نہیں رہی تھی۔ غالباً ساری مشرقی ماؤں کی طرح میری ماں کی تربیت کا بنیادی مقصد بھی یہ تھا کہ میں شادی کے بعد اپنے شوہر کا ہی نہیں بلکہ اپنے سسرال والوں کا بھی دل جیت سکوں، اور صرف اس طرح سے میں ان کو معتبر کرسکوں گی۔ گویا دوسرے لفظوں میں وہ مجھے صرف ایک خدمت گار، وفا شعار بیوی اور بہو بنانا چاہتی تھی۔ اسی لئے ان کو میری خوداعتمادی ذرا پسند نہ تھی۔ ان کے خیال میں میری یہ ساری خصوصیات میری آنے والی زندگی کو خراب کردیں گی۔ ان کو گویا اس بات کا یقین تھا کہ میں سسرال جا کر ان کی ناک ضرور کٹوانے والی ہوں۔ یہ اور بات کہ جب وقت آیا تو ماں کی ناک بھی اونچی کی اور بابا کا شملہ بھی کہ عورت تو صرف محبت کرنا جانتی ہے۔ خود سری اور بغاوت تو اس کے شریر کا حصہ ہیں ہی نہیں۔ میں یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ:

میں عورت ہوں مجھے جھکنا ہی ہوگا
مری ماں مجھ کو یہ سمجھا گئی ہے

اور جھکنے میں کبھی کوئی عار بھی نہیں محسوس ہوا کہ محبت تو خود سپردگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ میں نے اپنی محبت سے تعلق رکھنے والے ہر رشتے کو دل و جان سے چاہا، ان کی خدمت اپنی اولین ذمہ داری سمجھا۔۔۔ میری ماں کی تربیت رائگاں نہیں گئی۔

خیر، یہ تو وہ باتیں ہیں جن سے بڑے شہروں میں رہنے والی لڑکیوں کو سامنا کرنا پڑتا ہے، جنھیں بہر حال زیادہ آزادی حاصل ہے۔ لیکن گاؤں میں رہنے والی ملالہ یوسف جیسی لڑکیاں محض اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کے لئے کن مسائل کا مقابلہ کررہی ہیں، ان کا ہم بڑے شہروں میں رہنے والی لڑکیاں اندازہ بھی نہیں کرسکتیں کہ گاؤں دیہاتوں میں رہنے والی ان لڑکیوں پر کیا گزرتی ہوگی جن کے اپنے گھر والے ان کی سودے بازی کرلیتے ہیں۔ جہاں شادی کے بعد ان کو شوہر کی ہی نہیں بلکہ سسرال والوں کی بھی کنیزی کرنی ہوتی ہے، جہاں وہ ذرا ذرا سی بات پر چولہا پھٹنے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ میں ان لڑکیوں کے دلوں کا حال نہیں جان سکتی کہ جہاں اگر کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ جنسی زیادتی کرتا ہے تو گاؤں کی اندھی اور ظالم پنچائیت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ بدلے میں اس مرد کی بہن کے ساتھ بھی جنسی زیادتی کی جائے گی۔ یعنی مرد کے جرم کی سزا بھی دوسری عورت ہی بھگتے گی۔ ہم عورت ہو کے بھی ان عورتوں کے دکھوں کا اندازہ نہیں لگا سکتیں تو مرد تو دور کی بات ہیں۔ ایسے میں کشور ناہید کا تصور ذہن آتا ہے جو عورتوں کے حقوق کا علم اٹھائے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جنھوں نے معاشرے کے ہر طبقے اور ہر حصے میں رہنے والی عورتوں کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی۔ ان کے قلم نے ایسی ایسی نظمیں تخلیق کی جن کی چبھن صرف پاکستان تک ہی محسوس نہیں کی گئی بلکہ دنیا میں جہاں جہاں عورتوں کے حقوق کی پامالی ہوئی ہے وہاں وہاں اس درد کو محسوس کیا گیا۔ ان کی لکھی ہوئی نظموں نے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں عام سی لڑکیوں کے ساتھ ہونے زیادتیوں کی ایسی تصویر کھینچی جو دنیا کے ہر کینوس تک پہنچی۔ ان کی مشہور نظم "ہم گناہ گار عورتیں" کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر دنیا بھر میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی ترجمانی کررہی ہے۔ یہ ہی نہیں کہ وہ عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اجاگر کرکے دنیا کے سامنے لائیں، انھوں نے عورتوں کے اندر یہ احساس بھی پیدا کیا کہ وہ اس معاشرے کا جیتا جاگتا وجود ہیں اور ان کو بھی معاشرے میں ویسی ہی بھرپور زندگی گزارنے کا حق ہے جیسا مردوں کو ہے۔ انھوں نے عورت کے حق میں اپنے جہاد کو صرف قلم تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ وہ عملی طور پر اس میدان میں اتری۔ ان کے اس عمل نے صرف عورت کو ہی خوداعتمادی نہیں دی بلکہ وہ کسی حد تک مردوں کی سوچ بھی بدلنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ بقول ان کے،"میری لکھی ہوئی نظموں نے معاشرے کو بدلا تو نہیں لیکن یہ شعور تو دیا کہ ہم عورتیں سوچتی کیا ہیں"۔ یہ یقیناً کشور ناہید کا بہت بڑا کارنامہ ہے، جس کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

کشور ناہید سے اس ملاقات کے وقت میری زندگی ایک بڑے طوفان سے گزر چکی تھی اور جس کے اثرات سے میں ابھی تک باہر نہیں آسکی تھی۔ اب میرے سر پر رنگین آنچل کے بجائے سفید چادر تھی۔۔۔ اب میں اسلام آباد میں رہنے والی کم عمر، بات بات پر بغیر کسی وجہ کے ہنسنے والی لاابالی لڑکی نہیں تھی، اب میں امریکہ میں رہتی تھی، دو بیٹوں کی ماں تھی، اب میں کالج کی طالبہ نہیں تھی بلکہ امریکہ میں اپنا بزنس چلانے والی ایک ذمہ دار خاتون تھی۔ لیکن عورت ہونے کا عذاب ویسا ہی تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ جو شادی سے پہلے تھا۔ اس وقت پھر میری حفاظت کے

لئے میری ماں موجود تھی۔لیکن اب اپنی نیک نامی کی حفاظت مشکل لگنے لگی۔ایسا لگتا تھا کہ جیسے سارے مسائل میں سب بڑا مسئلہ اپنے کردار کی حفاظت کرنا ہو۔ایک بار پھر یہ محسوس ہونے لگا کہ معاشرے کی نظریں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ پھر سے میرے ہنسنے، بولنے، اٹھنے، بیٹھنے حتیٰ کے رونے تک پہ نظر رکھی جانے لگی۔ مجھے اکیلا دیکھ کر لوگوں نے مجھ پر انگلیاں اٹھانے میں کچھ ماہ کا بھی انتظار نہ کیا۔اپنے دوست جیسے شوہر کو کھو دینے کے صرف پانچویں دن اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو سمیٹ کر گھر سے قدم نکالنا اور آفس جا کر بزنس کو اکیلے سنبھالنا میرے بس کی بات نہ تھی لیکن ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔ورنہ کامران کی آخری آرام گاہ کے ساتھ خالی زمین کا مصرف تو میں نے اسی دن بھانپ لیا تھا جس دن انھیں سپرد خاک کیا تھا اور اس زمین کو اپنے نام منتقل کروانے میں دیر نہ لگائی۔لیکن حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ڈھائی سال کے عرصے کی طویل بیماری کے نتیجے میں لمبے میڈیکل بلز، توجہ نہ دینے کی وجہ سے ڈوبتا ہوا بزنس، اور منہ کھولے ہوئے معاشی مسائل مجھ سے کچھ اور چاہتے تھے۔۔۔ جو وقت گزر گیا تھا وہ بہت کڑا تھا لیکن آنے والے وقت کی سنگینی بھی کچھ کم نہ تھی۔ گزرے ہوئے کل میں نحیف ہی سہی لیکن کامران کا وجود میرے ساتھ تھا اور ڈاکٹر کے بار بار کم وقت کے اعلان کے باوجود ایک موہوم سی امید کا چراغ روشن تھا کہ جنگ لڑنے والے سپاہی کے حوصلے ہارے ہوئے سپاہی سے بہر حال بلند ہوتے ہیں، چاہے جنگ ہارنے کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے ہوں۔کامران کینسر کی جنگ ہار چکے تھے لیکن مجھے ابھی اور لڑنا تھا۔کامران ہمیشہ کے لئے جا چکے تھے، میں ایک جنگ ہار چکی تھی لیکن دوسری جنگ ہارنے کا خطرہ نہیں لے سکتی تھی۔ میں عدت کاٹنا چاہتی تھی کہ ایک جنگ ہارنے کے ساتھ ہی دوسری جنگ شروع کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ مجھے اپنے آپ کو اتنے بڑے سانحہ سے سنبھلنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔ مجھے یقین ہے عدت کا یقیناً ایک یہ بھی جواز ہوتا ہوگا جس کو ہم یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ہم کو تو صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ بیوہ ہوتے وقت اگر اس کی کوکھ میں بچہ ہے تو اس کی ولدیت پہ شک نہ رہ جائے۔عزت ذات کا کیا اعتبار۔

مجھے صرف پانچویں دن آفس جانے کا فیصلہ کرنا پڑا تو ایسے میں مجھ پر اسلامی عقاید سے منحرف ہونے کا الزام لگا دیا کہ میری عمر میں بیوہ ہونے کی صورت میں عدت سے چھوٹ نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ شوہر کے ساتھ بے وفائی کا الزام لگایا گیا کہ ابھی تو شوہر مرا ہے، اور اس کی اڑان دیکھو۔اب میرے پاس ماں کی گود تھی اور نہ ہی باپ کا سینہ کہ جس میں میں اپنے آپ کو دنیا سے چھپا لیتی۔۔۔ مجھے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی اکیلے مقابلہ کرنا تھا۔۔۔ مجھے مضبوط بننا تھا، بہت مضبوط کیونکہ میں اب اپنے بیٹوں کے لئے صرف ماں نہیں تھی، باپ بھی تھی۔اب مجھ سے ہی انھوں نے عورت کی نرمی، پیار اور محبت سیکھنا تھی اور مجھ سے ہی مرد کی بہادری۔جان لیوا کینسر کی تشخیص سے ایک زندگی داؤ پر نہیں لگی تھی، تین زندگیاں داؤ پر لگی تھی۔۔۔ایک کے جان سے جانے کا اندیشہ تھا تو دو کی زندگی بھر کے خواب مٹی میں مل جانے کا خوف۔ مجھے اپنے اس عمر کے خواب بھولے نہیں تھے۔کامران کو بچانے کی میری ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں لیکن ان دو زندگیوں کے رہے سہے خواب میں ہر صورت بچانا چاہتی تھی۔ میں ان کا کھویا ہوا شفیق باپ تو واپس نہیں لا سکتی تھی لیکن ان کو اس احساس سے ضرور بچانا چاہتی تھی کہ اب وہ ویسی زندگی نہیں گزار سکتے جیسے وہ اپنے باپ کی موجودگی میں گزارتے تھے۔ایسا کرنے کے لئے مجھے دنیا کی پرواہ کئے بغیر، اپنے تمام آنسو اور آہ و زاریاں بالائے طاق رکھ کر جلد سے جلد اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔لیکن معاشرے کے لئے یہ میرا روپ عجیب تھا۔۔۔اتنی المناک موت اور میری یہ دنیا داری۔۔۔ ان کے نزدیک تو مجھے سفید چادر تلے اپنا وجود ختم کر لینا چاہئے تھا، کہ شوہر سے وفاداری صرف اسی صورت میں ثابت ہو سکتی ہے۔ہم اس معاشرے میں رہتے ہیں جہاں کسی مرد کی بیوی مر جائے تو فوراً اس کو دوسری شادی کر لینے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور اگر عورت بیوہ ہو جائے تو اس موقع کی تلاش میں لگ جاتے ہیں کہ اس کی کردار کشی کب اور کیسے کی جائے۔عورت کے سر پر سفید چادر ڈالنے اور چوڑیاں توڑنے کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ایسے ایک واقعہ کی میں چشم دید گواہ ہوں۔ جب ہمارے محلے میں ایک عورت کا شوہر ایکسیڈنٹ میں مر گیا تھا تو اس کے اپنے گھر والوں نے لوگوں کو بلا کر باقاعدہ اس کے سر پر سفید چادر ڈالنے کی رسم ادا کی تھی۔اس عورت کی آہ و زاری کی وجہ سے میں کتنی راتیں سو نہیں پائی تھی۔اب یہ باتیں میری سمجھ میں آ رہی تھیں کہ اس رسم کے پیچھے معاشرے کا یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں یہ کھلتے ہوئے رنگ اور چوڑیوں کی کھنک عورت کے اندر زندگی کی رمق دوبارہ پیدا نہ کر دیں کہ یہ اب اس کا حق نہیں ہے۔انھیں کیا معلوم کہ کم عمری سے ایک شہزادے کا خواب دیکھنے والی ایک مشرقی عورت جب اپنے خوابوں کا شہزادہ پا کے کھو دیتی ہیں تو اس کی کائنات میں کچھ نہیں بچتا۔۔۔ایسی باتیں کر کے کسی بیوہ کو زندہ درگور کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

کشور ناہید کا انٹرویو کرنے کے لئے میں ٹی وی سٹیشن کے لئے نکلی۔

اب گاڑی میں صرف میں اور وہ تھیں۔ٹریفک کی وجہ سے آدھے گھنٹے کا سفر سوا گھنٹے میں طے ہوا اور یہ سوا گھنٹا میرے لئے حاصل زندگی بن گیا۔تب میں تھی اور کشور ناہید۔اس تمام وقت میں وہ مجھ سے میری ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھتی رہیں۔۔۔زندگی کیسے گزارتی ہو؟ معاشی وسائل کی صورت حال کیا ہے؟ کیا بچوں کی تعلیم و تربیت کے اخراجات پورے کر پا رہی ہو؟؟ اور یہ کہ اکیلے ہونے کی وجہ سے ابھی اور کیا کیا پریشانیاں آئیں گی اور ان کو کس طرح جھیلنا ہے۔ وہ سارے راستے مجھے اس بات پر سراہتی رہیں کہ اچھا ہوا باہر نکل پڑی۔ اسی طرح آگے بڑھتی رہنا، لوگوں سے مت ڈرنا، معاشرے سے مت گھبرانا۔۔۔ ایسے جیسے وہ میرے گزرے ہوئے اور آنے والے مسائل سب سے واقف تھیں۔ وہ باتیں کیئے جا رہی تھیں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرا من ہلکا پھلکا ہوتا جا رہا ہے، اندر کے سارے خوف جیسے یکدم سے ختم ہو گئے۔۔۔صرف چند گھنٹوں کی ملاقات اور ان کی میرے لئے اتنی فکر مندی۔۔۔تب میں نے جانا کہ کشور ناہید تو بس کشور آپا

ہیں جو ہم عورتوں کے لئے ڈھال بنی ہوئی ہیں۔ دنیا چاہے ان کے بارے میں جتنی باتیں کرے، اس کی ان کو پرواہ نہیں، وہ تو بس ایک ہی مشن لے کر چل رہی ہے کہ عورت اپنا حق پہچانے اور مرد عورت کا حق تسلیم کرے۔

میری ماں جن لوگوں کا دل جیتنے کا سبق سکھاتی رہی ان کی طرف سے فرمان جاری ہو گیا کہ اس غیر عورت سے ہر قسم کا ناطہ توڑ دیا جائے کہ "خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے"۔ میں اپنی زندگی کے 23 برس کی محبت اور خدمت کے صلے کے طور پر انصاف طلب کرتی رہی لیکن۔۔۔ خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔۔۔ میں اپنے اس نئے گھر کی سب سے زیادہ خدمت گزار، پڑھی لکھی عورت، اپنے باپ کی لاڈلی شہزادی، اپنے شوہر کے دل پر راج کرنے والی اپنے گھر کی ملکہ۔۔۔ پانی تھی۔۔۔ اور وہ بھی گدلا پانی۔۔۔

کامران کی موت کی وجہ کینسر کو نہیں مجھے بنایا گیا۔۔۔ حالانکہ وہ کون سی دعا یا دوا تھی کہ جس کا اہتمام اور انتظام میں نے نہ کیا ہو، امریکہ کے سارے بڑے کینسر کے ہسپتال سے لے کے اسرائیل کی تازہ ترین ریسرچ۔ کہاں تک رسائی نہیں کی۔۔۔ کیمو، کلینیکل ٹرائلز (Clinical Trials)، ہربل دوائیں (Herbal Medicines) ہومیوپیتھی اور گھریلو ٹوٹکوں میں نہار منہ کلونجی، کریلے کا جوس، ادرک، ویٹ گراس (Wheatgrass) گاجر کا جوس، انار کا جوس۔۔۔ کیا باقی رہ گیا تھا۔۔۔ مجھے یاد ہے کسی نے کہا تھا کہ تلسی کینسر کے لئے بہت فائدے مند ہے تو میں نے گھر میں تلسی کا پودا لگایا جس کا خیال میں اس طرح رکھتی جیسے اس میں کامران کی جان ہو، وہ تلسی کا پودا کامران کے جاتے ہی سوکھ گیا۔ میں ہر وقت مختلف ریسرچ پڑھتی رہتی تھی اور پھر جو کچھ ممکن ہوتا وہ کرتی۔۔۔ میں نے دعا کرنے کے طریقے بدلے کہ مانگنے کا کوئی تو انداز ہو گا جو اوپر والے کو بھا جائے گا۔۔۔ میں نے اس کو نہ جانے کتنے ہستیوں کے واسطے دیئے کہ کوئی حوالہ تو اس کے لئے معتبر ہو گا۔۔۔ میں نے تو سن رکھا تھا کہ وہ دل سے مانگی ہوئی کسی دعا کو رد نہیں کرتا۔۔۔ لیکن سب بے سود۔۔۔ کامران کی موت کی وجہ میں تھی۔۔۔

میری ماں کا خوف صحیح نکلا۔۔۔ تقریباً دو دھائی پہلے مرے ہوئے میرے ماں باپ میرے نا کردہ گناہوں کے لئے موردالزام ٹھہرائے گئے کہ یہ ان کی غلط تربیت کا نتیجہ تھا۔ اور ہاں یہ یقیناً ان کا ہی قصور تھا کہ انھوں نے پیدا ہوتے ہی میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیا تھا۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں اس بات کی شکایت کروں کہ مجھے میری ماں نے یہ سب کیوں سکھایا یا اس کی محبت پر رشک کروں کہ جیسے وہ جانتی تھی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور وہ اپنے طور سے مجھے معاشرے کے اس عذاب سے بچانا چاہتی تھی۔۔۔ لیکن میری بھولی ماں کیا جانے کہ میں ایسی نہ ہوتی تو یہ پہاڑ جیسی مصیبت کیسے جھیلتی۔ میرے بچپن کی ساری مستیاں میری تربیت میرا حوصلہ ثابت ہوئی۔ اوپر والا تو اس سے بھی آگے کی دیکھ رہا تھا جہاں تک میری ماں دیکھ سکتی تھی۔۔۔ شاید اسی لئے اس نے مجھے دوسری لڑکیوں سے ذرا مختلف بنایا۔۔۔ اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ میں جو مشکل کے اس تمام دور میں اس بات کی خواہش کرتی رہی کہ کاش میری ماں زندہ ہوتی تو کوئی کاندھا میرے لئے بھی ہوتا اور اس کے کاندھے پر میں بھی سر رکھ کر کچھ دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ لیکن اب میں شکر کر رہی تھی کہ یہ دن دیکھنے اور یہ باتیں سننے کے لئے وہ زندہ نہیں ہے۔ میں اس سے آنکھیں کیسے ملاتی۔۔۔ بیٹی تھی نا۔۔۔ آخر اس کو نا معتبر کرنے کا جواز بن گئی۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ اتنی دعاؤں اور منتوں کے باوجود اللہ نے مجھے بیٹی سے نہیں نوازا۔ کاش ہم لوگ یہ سمجھ پاتے کہ جیتی جاگتی زندگیاں عزت اور ناموس سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں۔

میری کوکھ سے جنم لینے والے بچے اب میرے نہیں تھے، ان کے اصل حقدار اب کوئی اور لوگ تھے۔ اس دنیا میں لوگوں کا بس چلے تو وہ اللہ کی طرف سے بخشے ہوئے اعزاز کو بھی چھین لیں کہ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں وہ ہی ہوں کہ لوگ نئی نویلی دلہن کو جس کا چہرہ دکھایا کرتے تھے۔ میری زندگی میں ہونے والے فقط ایک حادثے نے میری اہمیت اور حقیقت ہی بدل ڈالی اور وہ حادثہ جس میں میرا کوئی قصور بھی نہیں تھا کہ موت اور زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس حادثے نے مجھے منحوس، بد کردار، بے وفا، خودغرض اور نجانے کیا کیا بنا ڈالا۔

میری زندگی ایک ایسی اندھیری سرنگ کی طرح تھی۔ جس میں میں آگے تو بڑھ رہی تھی لیکن بار بار گرنے سے زخمی ہو رہی تھی اور خدشہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ میں بیچ راستے میں ہمت ہار جاؤں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اپنے دکھوں کی فریاد کرتی تو سننے کو ملتا کہ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتی ہے۔۔۔ پھر اپنے دکھوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ہنستی تو کہا جاتا کہ اس کو شوہر کے مرنے کا دکھ نہیں ہے۔ کشور ناہید سے کشور ناہید آپا تک کے اس سفر نے ایسا تو نہیں کیا کہ مجھے سرنگ کے دوسری طرف پہنچا دیا ہو لیکن وہاں تک ضرور پہنچا دیا کہ جہاں سے مجھے روشنی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور میں قدم جما جما کر رکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ زندگی کیسے گزارنی ہے وہ راستہ مجھے صاف دکھائی دینے لگا۔ کامران سے بچھڑنے کا دکھ ایک ناسور کی طرح اب بھی ہے اور ساری زندگی رہے گا۔ وہ میرے ذات کا مستقل حصہ ہیں۔ میں آج جو بھی ہوں کامران کی وجہ سے ہوں۔ میں، میرا گھر، میرے بچے، میرا بزنس۔ میری شاعری، میری نثر سب میں وہ ہی تو ہیں۔ میرے کمرے کی الماری میں ان کے کپڑے، دیواروں پر کامران کی تصویریں، سائیڈ ٹیبل پر ان کی پسندیدہ کتابیں، ان پر ان کی عینک، دراز میں ان کا بٹوہ، بٹوے میں ان کے کریڈٹ کارڈ اور کیش، ان کی پانی کی بوتل میں آدھا بچا ہوا پانی، آدھی کھائی ہوئی انرجی بار، دواؤں کی آدھی بھری شیشیاں، میرے ٹوتھ برش کے ساتھ ان کا ٹوتھ برش آج بھی اسی طرح ہیں۔ کوئی چلا جاتا ہے تو لوگ اس سے تعلق رکھنے والی ساری چیزیں ہٹا دیتے ہیں، مجھے بھی یہ ہی مشورہ دیتے تھے کی اس سے بھولنے میں آسانی ہوتی ہے، لیکن میں نے کچھ نہیں ہٹایا کہ میں کامران کو بھولنا چاہتی ہی نہیں ہوں۔ کشور آپا کی ان باتوں سے میرا اپنی ذات پر اعتماد بحال ہو گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلی ضرور ہوں لیکن کمزور نہیں ہوں اور بغیر کسی

خوف وخطر کے زندگی گزارنا میرا حق ہے اور میں گزاروں گی۔۔۔

کشور ناہید کے دلچسپ انٹرویو کی ریکارڈنگ ختم ہو چکی تھی۔۔۔میں نے ان کو واپس پہنچایا اور اپنا واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

کامران کی بیماری کے سلسلے میں جو ہاسپس سہولت (Hospice services) مہیا کی گئی تھی، وہ کامران کے جاتے ہی ختم ہو گئی لیکن ان کی طرف سے اکثر مجھے مشورے کے خطوط آتے رہتے کہ میں اپنی زندگی کے مسائل کا مقابلہ کس طرح کروں۔ کچھ عرصہ قبل ہی ان کا لیٹر آیا تھا جس میں مجھے مشورہ دیا گیا تھا کہ اب مجھے کوشش کر کے اپنی شادی کی انگھوٹی کو دوبارہ پہن لینا چاہئے جبکہ مجھ میں تو اس پر نظر ڈالنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ میں کشور آپا کو پہنچا کر گھر پہنچی، اور اپنی سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اپنے تھکے ماندے چہرے پر ایک آخری نظر ڈالی۔۔۔اپنا زیورات کا ڈبہ کھول کر ہاتھوں میں کامران کی دی ہوئی انگھوٹیاں پہنیں، کانوں میں بالیاں ڈالیں، ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر اس نام نہاد معاشرے کی فرسودہ رسموں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ سامنے آئینے میں کامران کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے مخصوص سٹائل میں ہاتھ باندھے، چہرے پر مسکراہٹ سجائے، رشک اور پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہے ہوں "یہ ہوئی نا بات میری فرح" ان کے اس انداز نے میرے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ میں اپنے ہاتھوں میں ان کے ہاتھوں کی گرمی محسوس کر رہی تھی۔ یوں میرا غم میری طاقت بن گیا، لوگوں کی باتیں جو شاید مجھے کمزور کرنے کے لئے کی گئی تھیں ان کے بارے میں سوچ کر میں اپنا آپ اور مضبوط محسوس کرنے لگی نفرت کی آگ جو۔ مجھے جلانے کے لئے بھڑکائی گئی تھی اس نے مجھے کندن بنا دیا، میں اپنے اندر فولاد کی سی قوت محسوس کر رہی تھی۔ اب میں بار بار ہارنے والی وہ پرانی فرح کامران نہیں تھی۔ اس نئے عزم اور مضبوط ارادوں نے مجھے ایک نیا روپ دے دیا تھا، مجھے نہیں پتا کہ میرے اس نئے روپ سے اس بے رحم معاشرے میں ایک گناہ گار عورت کا اضافہ ہوا یا ایک اکیلی عورت نے معاشرے کی سنگینی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ جس راستے کا انتخاب میں نے کیا ہے اس پہ چل کر میرے پاؤں ہی لہولہان نہیں ہوں گے میری روح بھی چھلنی ہو گی۔۔۔لیکن مجھے اس کی پروا نہیں کہ بند کمرے میں اکیلے بیٹھ کر وقت اور حالات کی ناانصافیوں پر رو رو کر اپنے دکھوں پر ماتم کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ چہرے پر مسکراہٹ سجا کر، کوئی مشن یا پیغام لے کر باہر نکلا جائے۔

کشور آپا۔۔۔امریکہ سے واپس جاتے ہوئے جو قدموں کے نشان آپ یہاں چھوڑ کر گئی ہیں، خواہش ہے کہ انھیں قدموں پر قدم رکھ کر میں بھی وہاں پہنچ جاؤں جہاں آپ ہیں اور میں بھی وہی کروں جو آپ کر رہی ہیں اور کسی ایک عورت کے لئے میں بھی مشعل راہ بن جاؤں۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہے۔۔۔ کارواں بنتا رہے۔۔۔زمانہ تو بدلے گا ایک دن۔۔۔اور ہم عورتیں بھی اپنی مرضی کی زندگی گزار سکیں۔

کشور آپا۔۔۔ہم بری اور گناہ گار عورتیں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کریں۔ میرے جیسی ہزاروں مظلوم مگر اس معاشرے کی نظر میں ہمیڑی دعاؤں کی صورت ادا کرتی رہیں گی۔

جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاوں میں چھالے ہوں گے
ہاں وہی لوگ تمھیں ڈھونڈنے والے ہوں گے

"You start dying slowly"

You start dying slowly;
if you do not travel,
if you do not read,
If you do not listen to the sounds of life,
If you do not appreciate yourself.
You start dying slowly:

When you kill your self-esteem,
When you do not let others help you.
You start dying slowly;

If you become a slave of your habits,
Walking everyday on the same paths,
If you do not change your routine,
If you do not wear different colours,
Or you do not speak to those you don't know,
You start dying slowly;

If you avoid to feel passion
And their turbulent emotions;
Those which make your eyes glisten
And your heart beat fast.
You start dying slowly;

If you don't risk what is safe for the uncertain,
If you do not go after a dream,
If you do not allow yourself,
At least once in your lifetime,
To run away,
You start dying - Slowly...!

Pablo Neruda
Nobel Prize for Literature in 1971

"ہمارے رانا خان"

ملک زادہ جاوید

(نوئیڈا، بھارت)

اچھے اور کُشادہ ذہن و دل رکھنے والوں سے یہ دنیا دھیمے دھیمے خالی ہوتی جا رہی ہے، لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسے لوگ اب اس دنیا میں نہیں رہے، ہاں ایسے لوگوں کا ملنا، عام طور پر کبھی کبھی اتفاق سے ہوتا ہے؟۔اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اندر بھی وہ سب خوبیاں موجود ہونی چاہیں، جو سامنے والے میں پائی جاتی ہیں۔۔"فیس بک" پر ایک صاحب جنکا نام رانا خان تھا اُن سے میری دوستی ہوئی، وہ پاکستان کے فیصل آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں چک نمبر ۳۵۲ جہانگیر کلاں سے تعلق رکھتے تھے انکے بزرگ ہندوستان کے ٹنڈالہ گاؤں ضلع جالندھر ریاست کپورتھلہ جالندھر کے تھے، انکا پورا نام امتیاز رانا خان تھا، وہ راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے رانا خان کے دو بھائی اور ہیں، جنکے نام فیاض احمد خان اور آفتاب احمد خان ہے، رانا خان پاکستان سے نکل کر کاروبار کے لئے جاپان گئے اور وہاں انہوں نے قالین کا کام شروع کیا، کھانے کے ہوٹل کھولے جہاں کے پاکستانی کھانوں کی کچھ ہی دنوں میں دھوم مچ گئی اور پھر رانا خان نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اپنے کاروباری سلسلہ کو اپنی کڑی محنت سے پاکستان، جاپان، امریکا، کوریا، چائنا، تک پہنچا دیا اور ان ملکوں میں اور بھی دوسری چیزوں کا کاروبار کیا جس میں خدا نے انکو بہت ترقیوں سے نوازا، دبئی میں اپنے کاروبار کو بڑھانے کے لئے اپنی ایک برانچ رانا خان نے کھولی جہاں وہ خود بیٹھا کرتے تھے، رانا خان کے چار بیٹے ہیں جن میں عزیز احمد خان، شہرام احمد خان ، حمزہ احمد خان اور عمار احمد خان ہیں، رانا خان کے بیٹوں میں سے صرف میری ملاقات شہرام اے خاں سے ہی ہے جو کہ دبئی میں کا کاروبار دیکھتے ہیں۔

رانا خان، میرے والد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے مداحوں میں تھے، حالانکہ میرے والد مرحوم سے انکی کبھی ملاقات نہیں تھی مگر وہ انکو (یو ٹیوب) Youtube پر مشاعروں کی نظامت کرتے ہوئے، کلام سناتے ہوئے دیکھا اور سُن چکے تھے، تبھی سے میرے والد کے گرویدہ اور مداح وہ ہو گئے تھے، پھر تو اُن سے ایسی میری دوستی ہوئی کہ ہر موضوع پر اُن سے بات چیت ہونے لگی فنون لطیفہ Fine Arts پر انکو دسترس حاصل تھی شاعری ہو، نثر نگاری ہو، غزل گائیکی ہو، مشاعرے ہوں، اسکے علاوہ کسی بڑی نثری، ادبی شخصیت کی کون کون سی کتابیں آ چکی ہیں اور کس شاعر کے کتنے مجموعے کلام چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں، اور اُن ادیبوں اور شاعروں کی حیثیت ادب میں کیا ہے اور کتنی ہے، ان کی خصوصیات کیا ہیں، ان سب کی بھرپور جانکاری رانا خان صاحب رکھتے تھے، علم کی پیاس انکو اتنی تھی کہ وہ کسی کتاب کے بارے میں سُن کر اُس کتاب کو حاصل کرنے کے لیئے بیتاب ہو جاتے تھے۔

ایک دن رانا خان صاحب سے دوران چیٹنگ میں نے بتایا کہ میں دبئی آ رہا ہوں ایک مشاعرے میں، سُن کر وہ بڑا خوش ہوئے اور مجھ سے کہا کہ آپ اپنے والد کی سوانح حیات "رقص شرر" ضرور لیکر آیئے گا اور اتنا وقت لیکر آیئے گا کہ ایک پورا دن ہم لوگ ساتھ گزاریں، مگر مشاعرے کے کنوینر نے واپسی کا ٹکٹ مشاعرے کے دوسرے دن کا ہی تمام شعرا کا کروا رکھا تھا پھر جب رانا خان سے میری بات ہوئی تو اُنکو میں نے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا، انہوں نے کنوینر سے ایجنٹ کا نام پوچھ کر اپنے اخراجات سے میرے ٹکٹ کو ایک ہفتہ آگے کا بڑھوا دیا اور اسکی اطلاع انہوں نے فون پر مجھے چند گھنٹوں میں ہی دے دی، دبئی میں ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں مشاعرے کے دوسرے دن رانا خان نے میری دعوت کی اور میری قیام گاہ سے مجھے گاڑی بھیج کر بلوایا، میں نے انکو تب پہلی بار دیکھا، درمیانہ قد، رنگ گیہواں، چہرے پر ایک عجب سی کشش، نرم لہجہ اور انکے انکسار نے مجھے بہت متاثر کیا، دو گھنٹے کی اس ملاقات میں کھانے کے دوران ہماری ڈھیروں باتیں ہوئیں، انکی محبتیں، انکی اپنائیت ، انکا خلوص اور انکا ویژن vision دیکھ کر مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں ایک پٹھان سے مخاطب ہوں جو کہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر جاپان، امریکہ، گلف، جاپان، کوریا، پاکستان میں اپنے کاروبار کی حکومت قائم کر چکا ہے اور اسے کئی زبانوں پر دسترس حاصل ہے، دوران گفتگو رانا خان نے پوچھا کہ آپکے بچے کیا کرتے ہیں، میں نے جب بتایا کہ بڑے بیٹے نے اسی سال M.B.A کیا ہے اور وہ ملازمت تلاش کر رہے ہیں تو انہوں نے بغیر ایک پل گنوائے مجھ سے کہا کہ میرا ایک شوروم Cars used کا جاپان میں ہے جسے میرا ایک بیٹا سنبھال رہا ہے، وہ وہاں چلے جائیں اور اسکے ساتھ مل کر کام دیکھیں، میں سارا بندوبست کرتا ہوں میرا جو بیٹا وہاں یہ کام دیکھ رہا ہے وہ بہت سمجھدار اور اچھا ہے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

رانا خان سے دن بہ دن میرے تعلقات کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور ہم لوگوں کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک جزبہ ہمیشہ درمیان میں رہا، ایک دوسرے سے ہم لوگ اپنے دکھ سکھ شیئر کرتے اور FineArts (فنون لطیفہ) پر بات کرتے، دبئی پھر کئی بار میرا مشاعروں کے سلسلہ میں جانا ہوا، ہر بار رانا خان اگر دوبئی میں رہے تو میرے ساتھ ساتھ انکا کافی وقت گزرتا تھا، مشاعرہ سنتے تھے، اپنے آفس لے جاتے تھے، ہم لوگ ساتھ ساتھ گھومتے اور ٹہلتے تھے، اچھے اور بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے تھے اور اردو شاعری و ادب پر گفتگو کرتے، مختلف گلوکاروں کی آواز میں انکی کار کے ٹیپ پر ہم غزلیں سنتے تھے، اردو شاعری سے انکی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ جہاں جہاں وہ رہے اپنی زات میں خود ایک انجمن رہے، دیار غیر میں کئی ہنگاموں سے منسوب رہے، ایک بار میں نے اپنا شعری مجموعہ اُنکو پیش کیا تو انہوں نے اسکی طباعت وغیرہ دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ آپکا

اگلا شعری مجموعہ میں چھپواؤنگا اور اسکا نام ''کرسٹل'' تجویز کیا آپ خرچ کی پرواہ مت کریں بہتر سے بہتر چھپوائیں سارے اخراجات کا ذمہ میرا ہے۔

آخری بار انکی حیات میں، میں نے فون پر بتایا کہ رانا بھائی میں فلاں تاریخ کو دبئی فرحان واسطی کے مشاعرے میں آرہا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ بیدی صاحب کی سوانح حیات کی تلاش میں بہت دنوں سے ہوں اگر ہندوستان میں کہیں مل جائے تو لیتے آئیگا۔ میں کسی سے بھیج کر آپ جہاں قیام کریں گے، وہاں سے منگوالونگا اور پھر انہوں نے بتایا کہ وہ کاروباری سلسلہ سے جاپان میں رہینگے انکا آنا بہت مشکل ہے، میں، دبئی کا کوئی تصور رانا خان کے بغیر نہیں کرسکتا تھا چنانچہ اداس من سے دبئی پہنچا مگر جیسے ہی میں پہنچا ایک ٹیلیفون آیا ادھر سے رانا خان کی آواز سنائی دی بولے ملک زادہ جاوید صرف تمہارے لیئے میں جاپان سے دبئی چلا آیا کہ میرا یار کہیں یہ نہ سوچے کہ میں اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

شیخ راشد آڈیٹوریم دبئی میں انہوں نے پورا مشاعرہ سُنا، پھر تو دبئی میں جب تک میں رہا وہ ایک لمحہ مجھ سے غافل نہیں رہے۔ایک نہایت شاندار ڈنر کا اہتمام ''گولف کلب'' دبئی میں انہوں نے میرے اعزاز میں رکھا جسمیں میں اور پہلی بار دبئی گھومنے گئی میری بیگم کے علاوہ عباس تابش، قیصر وجدی، محشر آفریدی شامل رہے بے تکلف گفتگو، شاندار ماحول، میعاری شاعری اور کھانے نے اس شام کی یادوں کو تاریخی بنا دیا اُن سے میری آخری ملاقات یہیں رہی اور میں ہندوستان لوٹ آیا۔

ایک صبح میرے موبائل پر مجھے ایک میسیج ملا کہ اپکے دوست رانا خان کا دبئی میں ہارٹ فیل ہوگیا اور وہ انتقال کر گئے وہ لمحہ میرے لئے بے حد کرب اندوہ ثابت ہوا، میری آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ فون پر اس خبر کی تصدیک کر پاتا، میری حالت دیکھ کر میرے بہنوئی نے میرے فون سے دبئی اس خبر کی تصدیق کی تو پتہ چلا کہ یہ خبر سچ ہے مزید تفصیلات میں یہ پتہ چلا کہ جم سے وہ گھر لوٹے اور انہیں شدید طور پر ہارٹ اٹیک پڑا اور وہ جاں بحق ہوگئے۔

ہمارے دوست رانا خان صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں اللہ انکی مغفرت فرمائے اور انکے درجات کو بلند کرے، اس بار دبئی جانے سے پہلے میں نے انکے صاحب زادے سہرام اے خان کو اپنے دبئی آنے کی اطلاع دی جو کہ دبئی برانچ میں اب رانا خان کی جگہ کو سنبھالے ہوئے ہیں وہ میرا نام سُن کر بہت خوش ہوا، باپ کی شرافت انکی نیکیاں اُسے وراثت میں ملی ہیں وہ مجھے کھانے پر وہیں گولف کلب لے گیا جہاں میں اور رانا خان بیٹھا کرتے تھے دو گھنٹے کے قریب ہم لوگ وہاں رہے زیادہ وقت رانا خان کے بارے میں بات چیت ہوئی وہ اپنے والد کے بارے میں ایک ایک واقعہ اور اسکے والد کے بارے میں میری گفتگو اور تاثرات کو بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنتا رہا اور میں اسکے وجود میں اپنے دوست رانا خان کو تلاش کرتا رہا؟

کرامات

میرے ہی لہو پر گزر اوقات کرو ہو
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو

دن ایک ستم، ایک ستم رات کرو ہو
وہ دوست ہو، دشمن کو بھی تم مات کرو ہو

ہم خاک نشیں، تم سخن آرائے سرِ بام
پاس آ کے ملو، دُور سے کیا بات کرو ہو

ہم کو جو ملا ہے وہ تمھیں سے تو ملا ہے
ہم اور بھُلا دیں تمھیں، کیا بات کرو ہو

یوں تو ہمیں منہ پھیر کے دیکھو بھی نہیں ہو
جب وقت پڑے ہے تو مدارات کرو ہو

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

بکنے بھی دو عاجز کو جو بولے ہے، بکے ہے
دیوانہ ہے، دیوانے سے کیا بات کرو ہو

ڈاکٹر کلیم عاجز

ایک صدی کا قصّہ

گیتا بالی

دیپک کنول (ممبئی،بھارت)

سرگودھا کا ایک سنکی سردار جسے اُلٹی گنگا بہانے میں ہمیشہ مزہ آتا تھا۔اصل میں وہ دقیانوسی اور فرسودہ سماج سے اتنا شاکی تھا کہ جب بھی اُسے موقع ملتا تھا وہ سماج کو للکارتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں نقار خانے میں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنتا۔یہی حال اُس سردار کا بھی تھا۔تنگ آکر وہ روایت شکنی پر اُتر آیا۔اُس دور میں جب کہ لڑکیوں کا گھر سے نکلنا ممنوع تھا۔اُنہیں شجر ممنوعہ سمجھ کے سات پردوں کے پیچھے چھپایا جاتا تھا، اُسنے حوصلے کا کام کیا۔اُسنے اپنی بیٹیوں کو کھلی ڈھیل دی۔ اُسنے اپنی دو بیٹیوں کو نہ صرف کلاسیکل ناچ گانا سیکھنے کی طرف راغب کیا بلکہ انہیں گھڑسواری میں بھی مشاق بنانے کی کوشش کی۔جو قدامت پسند سکھ تھے اُنہوں نے اس سنکی سردار کا بائیکاٹ کر دیا۔جب یہ لڑکیاں ناچ گانا سیکھ کے سٹیج پر پروگرام پیش کرنے لگیں تو سماجی ٹھیکداروں نے ان لڑکیوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا،جس جس تھیٹر میں اس سردار کی بیٹیاں اپنا پروگرام پیش کرتی تھیں وہ اُن تھیٹروں پر سنگ باری کرتے تھے۔اُسنے ہمت نہیں ہاری۔وہ اپنی بیٹیوں کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔اس سردار کا نام پنڈت کرتار سنگھ بالی تھا جو کہ ایک فلاسفر تھا،ایک عالم تھا اور ساتھ ہی وہ امرتسر کے گولڈن ٹمپل کا راگی بھی تھا۔کرتار سنگھ بالی کے اجداد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کشمیری ہندو تھے اور سکھ مذہب تب اُنہوں نے اختیار کیا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کو فتح کیا۔وہ کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر چلے آئے اور پھر وہیں پر جا کر بس گئے۔کرتار سنگھ کی بیوی پنجاب کے ایک ماہر تعلیم کی بیٹی تھی اور کافی پڑھی لکھی عورت تھی۔کہا جاتا ہے کہ کرتار سنگھ بالی اتنا ذہین اور زیرک تھا کہ اُس کے پاس دور دور سے لوگ اپنے مسائل لے کے آتے تھے اور اپنی مشکلیں آسان کرنے کے لئے اُس سے صلاح مشورہ مانگتے تھے۔وہ اُن کے لئے مشکل کشا تھا۔وہ خوشی خوشی ہر ایک کا مسلہ سنتا اور پھر اُن کا ازالہ کرنے کے لئے اُنہیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتا۔کرتار سنگھ کی دو بیٹیاں جن کے نام ہر کیرتن کور اور ہر درشن کور تھا۔انکے نانا تخت سنگھ کنہیا مہا ودھالیہ کا بانی تھا جسکی بنیاد اُسنے 1904 میں فیروز پور (پنجاب) میں ڈالی تھی۔یہ اپنی نوعیت کا پہلا لڑکیوں کا بورڈنگ اسکول تھا۔

پنڈت کرتار سنگھ بالی کھلے ذہن کا آدمی تھا۔وہ مذہبی ہو کے بھی ترقی پسند سوچ رکھتا تھا۔وہ بیٹیوں کو چار دیواری میں قید کرنے کے حق میں نہیں تھا۔یہ وہ دور تھا جب لڑکیوں کو بوجھ سمجھا جاتا تھا اور اُنہیں گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔گو کہ پنڈت کرتار سنگھ کی مالی حالت کافی خستہ تھی مگر باوجود اسکے اُس نے اپنی بیٹیوں کو کبھی بوجھ نہیں سمجھا۔وہ انہیں قدرت کی طرف سے بخشا گیا ایک انمول تحفہ سمجھتا رہا۔اُس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو کتھک ناچ سیکھنے کی طرف راغب کر دیا۔اتنا ہی نہیں اُسنے ان دونوں بہنوں کو گھڑسواری اور مارشل آرٹس کی ٹریننگ دلوائی۔ہر کیرتن کور جو بعد میں گیتا بالی کے نام سے مشہور ہوئی،1930 میں متحدہ پنجاب کے صوبے سرگودھا میں پیدا ہوئی تھی۔کرتار سنگھ اپنی بچیوں کو دوستوں کی طرح سمجھتے تھے اور اُنہیں ہر طرح کا سکھ دینے کی کوشش کرتے۔امرتسر جو کہ تعلیم وتمدن کا مرکز تھا مگر اس شہر پر کٹر اور قدامت پسند اس طرح حاوی ہوئے تھے کہ اُنکے ہوتے ہوئے آرٹ اور کلچر کو پنپنے کا کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔امرتسر میں کئی سارے تھیٹر تھے مگر جتنے بھی تھیٹر تھے اُنہیں بھی مذہبی پرچار کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔اسی بیچ ہر کیرتن کور کو فلم میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی جو اُسنے بخوشی قبول کی۔فلم کا نام ''دی کوبلر'' تھا۔ایک تو تھا ہی دیوانہ اُس پر آئی بہار۔پہلے تھیٹر اور اب فلمیں۔اُس زمانے میں فلموں میں کام کرنے والوں کو عزت کی نظر سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔کرتار سنگھ بالی کی یہ روایت شکنی اُسکے خاندان کے لئے مہنگی ثابت ہوئی۔انتہا پسند طبقے نے اُنکا قافیہ تنگ کرنا شروع کیا۔ادھر پہلی فلم ریلیز ہونے کے بعد اُسے فلموں کے بہت سارے آفر ملنے لگے مگر وہ ان آفرس کو لبیک نہ کہہ سکے کیونکہ کرتار سنگھ بالی کا انتہا پسندوں نے جینا محال کر دیا تھا۔اُسنے سوچا کہ یہاں رہ کر اُسکی بیٹیاں پھل پھول نہیں پائیں گی اسلئے تنگ آکر کرتار سنگھ بالی نے امرتسر کو چھوڑ کے بمبئی کے آزاد ماحول اور اُسکی کھلی فضاؤں میں رہنے کا فیصلہ کیا۔وہ امرتسر کو الوداع کہہ کے بمبئی چلے آئے۔

ہر کیرتن کور، ہر کیرتن کور سے گیتا بالی کیسے ہو گئی اسکے پس منظر کی کہانی یہ ہے کہ وہ جس فلم میں کام کر رہی تھی اُس فلم میں یہ اُس فلمی کردار کا نام تھا جو اُسنے فلم میں ادا کیا تھا۔اُسے یہ نام اتنا بھا گیا کہ اُسنے اپنا نام بدل کر گیتا بالی رکھ لیا۔جس فلمساز کے ساتھ اُسنے معاہدہ کر لیا تھا اُسنے وہ معاہدہ کیدار شرما کے حق میں تبدیل کیا۔کیدار شرما اُن دنوں کافی فعال تھا۔وہ جب ایک دن گیتا بالی سے ملنے گیا تو یہ دیکھ کر اُسے گہرا دھچکا لگا کہ گیتا اپنے پریوار کے ساتھ ایک باتھ روم میں رہ رہی تھی۔اُسنے اس باصلاحیت لڑکی کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔اُسنے اُسے فلمیں سائن کرنے کی کھلی چھوٹ دی اپنے پریوار کی بدحالی دور کرنے کے لئے اُسے جو بھی رول ملا کیا۔اُسنے اے آر کاردار کی فلم ''دلاری'' میں مدھو بالا اور شام کے ساتھ کام کیا۔یہ فلم اپنے سریلے گانوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کی جاتی ہے۔اس فلم کے موسیقار نوشاد علی تھے۔اسی فلم کے گانے ''سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے'' نے محمد رفیع کو راتوں رات کروڑوں دلوں کا محبوب بنا دیا تھا۔

بطور ہیروئن اُسنے جو پہلی فلم کی اُسکا نام ''بدنامی'' تھا۔ یہ فلم 1946 میں ریلیز ہوئی۔1948 میں اُسکی فلم ''سہاگ رات'' ریلیز ہوئی جس میں اُسکا ہیرو بھارت بھوشن تھا اور ہدایت کار کیدار شرما تھے۔اُسنے ثریا کے ساتھ بھی کام کیا۔فلم تھی ''بڑی بہن''۔ثریا اُس وقت اپنے عروج پر تھی۔یہ فلم 1949 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال کیدار شرما کی ہدایت میں بننے والی دوسری فلم ''نیکی بدی'' بھی

ریلیز ہوئی۔1950 اُسکی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ایک فلم کیدار شرما کی ہدایت میں بننے والی''باورے نین'' تھی جس میں اُسکا ہیرو راجکپور تھا اور دوسری فلم ''نشانہ'' تھی جس میں اشوک کمار اور مدھو بالا کلیدی کردار میں تھے۔''باورے نین'' میں اُسکی فطری اور دل کو چھو لینے والی اداکاری دیکھ کے لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

گیتا بالی بڑی فراغ دل اور آزاد طبع لڑکی تھی۔اگر کوئی اُسکے پاس سنگیت سیکھنے کے لئے آتا تھا تو وہ اُسے منع نہیں کرتی تھی بلکہ وقت نکال کر اُسے سنگیت سکھاتی تھی۔بھگوان دادا فلموں میں چھوٹے موٹے رول کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ گیتا بالی سے ملا اور اُسے ایک کہانی سنائی۔کہانی گیتا بالی کو پسند آئی تو بھگوان دادا نے اُس سے پوچھا کہ کیا وہ اس کہانی پر اُسکے ساتھ کام کرنا پسند کرے گی۔گیتا بالی دیو آنند کے ساتھ فلم ''بازی'' سائن کر چکی تھی جس کے ہدایت کار گورودت تھے۔ایسے میں کوئی دوسری ہیروئن ہوتی تو وہ بھگوان دادا جیسے سی گریڈ ایکٹر کے ساتھ کام کر کے اپنے کیریر کو داو پر نہیں لگاتی۔گیتا کے خمیر میں مدد کرنے کا جذبہ کچھ اسطرح سے رچا بسا تھا کہ وہ نفع نقصان کی پرواہ نہیں کرتی تھی بلکہ کسی دوسرے کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتی تھی۔اُسنے بھگوان دادا کے ساتھ کام کرنے کے لئے حامی بھر لی۔

1951 کا سال گیتا بالی کے لئے شادمانی اور ظفریابی لے کے آیا۔ اُسکی ایک نہیں دو دو فلمیں دھوم مچا گئیں۔''بازی'' اور بھگوان دادا کی ''البیلا''۔گیتا بالی غضب کی اداکارہ تھی۔اُسکا چہرہ ہی نہیں اُسکی آنکھیں بھی بولتی تھیں۔وہ چہرے کے ایک ہلکے سے تاثر سے بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔فلم ''بازی'' کا وہ گانا بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے۔اپنے پہ بھروسہ ہے تو داو لگا لے۔'' اس گانے میں جس طرح اُسنے اپنی آنکھوں کا استعمال کیا تھا وہ دیدنی تھا۔اس فلم نے اُسے چوٹی پر لا کے کھڑا کر دیا۔اسی سال اُس کی دوسری فلم ''البیلا'' ریلیز ہوئی۔فلمی پنڈتوں کو جب یہ فلم دکھائی گئی تو اُنہوں نے اس فلم کو دیکھ کر پیشن گوئی کی کہ یہ فلم ایک شو بھی نہیں چلے گی۔گیتا کی فطری اداکاری، اُسکے ناچ اور سی رامچندر کی سحر آفرین موسیقی نے فلم بینوں پر ایسا جادو کر دیا کہ جب پردہ سیمیں پر گیتا بالی اور بھگوان دادا گانے پر ڈانس کرنے لگتے تھے تو سارا ہال اُن کے ساتھ جھومنے لگتا تھا اور فلم بین پردے پر سکوں کی بارش کر دیتے تھے۔واہ گانے بھی کیا تھے۔شام ڈھلے کھڑکی تلے، سیٹی بجانا چھوڑ دو۔دل دھڑکے نظر شرمائے تو سمجھو پیار ہوگیا۔شعلہ جو بڑھکے، دل میرا دھڑکے، یاد ہیرے سے آ جا رے اکھیوں میں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دن،ہم کرشمہ کپور کے ساتھ شوٹنگ کر رہے تھے۔ اسی بیچ اُسکی چھوٹی بہن کرینہ کپور اُس سے ملنے سیٹ پر آ گئی۔میں دلیپ صاحب کے بغل میں کھڑا تھا۔میں نے دلیپ صاحب سے کہا کہ مجھے اس لڑکی میں گیتا بالی کی جھلک نظر آ رہی ہے تو دلیپ صاحب چونک کر میری طرف دیکھ کے بولے۔''کیا بات کر رہے ہیں آپ۔کہاں گیتا بالی اور کہاں یہ'' آپ اسی بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ گیتا بالی کا اداکاری میں کیا مقام تھا۔

گیتا بالی کا بڑا بھائی دگ وجے سنگھ بالی بھی فلموں میں آ گیا تھا۔وہ بطور معاون ہدایت کار کام کر رہا تھا۔گیتا بالی نے اُسکا مستقبل بنانے کے لئے خون پسینے کی محنت سے کمایا پیسہ لگا کر خود فلم پرڈیوس کی اور اپنے بھائی کو اس فلم کی ہدایت کاری سونپ دی۔اس فلم کا نام ''راگ رنگ'' تھا۔اس فلم میں اُسکے مد مقابل اشوک کمار تھا۔یہ فلم 1952 میں ریلیز ہوئی۔اس سال اُسکی کل ملا کر چھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔''راگ رنگ''''آنند مٹھ''''جل پری''''جال''''زلزلہ'' اور ''بے تاب''۔''آنند مٹھ'' میں پرتھوی راج کپور کلیدی رول میں تھا جب کہ اس فلم کے اداکاروں میں گیتا بالی کے علاوہ پردیپ کمار اور بھارت بھوشن بھی جلوہ گر تھے۔''جل پری'' اور ''بے تاب'' میں اُسکا ہیرو اشوک کمار تھا جب کہ ''زلزلہ'' اور ''جال'' میں اُسکا ہیرو دیو آنند تھا اور ہدایت کار گورودت تھے۔

''البیلا'' کی ملک گیر کامیابی سے حوصلہ پا کر بھگوان دادا نے گیتا بالی کے ساتھ ایک اور فلم بنائی جس کا نام ''جھمیلا'' تھا۔یہ فلم 1953 میں ریلیز ہوئی۔ اس بار تقدیر نے بھگوان دادا کا ساتھ نہیں دیا اور فلم بری طرح فلاپ ہوئی۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''باز'' بھی ناکام رہی۔اسمیں گورودت نے ہدایت کاری کے ساتھ ساتھ اداکاری میں بھی ہاتھ آزمایا تھا۔

گیتا بالی نے دیو آنند کے ساتھ سب سے زیادہ فلمیں کیں۔گیتا بالی دیو آنند کی من پسند ہیروئن تھی۔اُسنے اسکے ساتھ چھ فلمیں کیں۔''بازی''''جال'' ''فیری''''ملاپ''''فرار'' اور ''پاکٹ مار''۔اسی طرح اُسنے شمی کپور کے ساتھ پانچ فلمیں کیں۔''مس کوکا کولا''''کافی ہاوس''''مجرم''''مہر'' اور ''جب سے تمہیں دیکھا ہے''

بقول شخصے شمی کپور کی کامیابی کے پیچھے گیتا بالی کا ہاتھ تھا۔گیتا بالی سے شمی کپور کی ملاقات 1955 میں فلم ''مس کوکا کولا'' کے سیٹ پر ہوئی تھی۔اس فلم کا ہدایت کار شمی کا دوست ہری آہلوالیہ تھا۔گیتا بالی ایک کامیاب ایکٹرس تھی جب کہ شمی کپور ابھی تک فلمی دنیا میں اپنی جگہ نہ بنا پایا تھا۔فلم کے سیٹ پر دونوں کی ملاقات ایسے ہی ہوئی جیسے ایک ہیرو کی ملاقات اپنی ہیروئن سے ہوتی ہے۔ شوٹنگ کے دوران وہ اس سردارنی سے دب کے رہا۔فلم پوری ہوئی بس قصہ ختم۔

اس فلم کے بعد اُنہوں نے ایک اور فلم سائن کی جس کا نام ''رنگین راتیں'' تھا۔اس فلم کو مشہور ہدایت کار کیدار شرما بنا رہے تھے۔چونکہ وہ ایک فلم ساتھ میں چکے تھے اس لئے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔وہ شوٹنگ کے لئے رانی کھیت پہونچ گئے جو کہ ایک ہل اسٹیشن ہے۔دن بھر شوٹنگ ہوتی رہتی تھی۔شام کو دونوں گھومنے نکل جاتے تھے۔گیتا بالی کو پہاڑوں پر گھومنا بہت اچھا لگتا تھا جب کہ شمی کو شکار کرنے کا بڑا شوق تھا۔وہ اپنے ساتھ بندوق لیکر چلتا تھا اور شکار کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا تھا۔ایک شام اُسنے ایک شیر کو دیکھا۔جونہی اُسنے نشانہ باندھا شیر نے اُسے چکمہ دیا۔اُسے شکار کے ہاتھ سے چلے جانے پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ گیتا تھی جو شمی کو حوصلہ دیتی رہی۔گھبراو مت۔وہ شیر بچ کے نہیں جائے گا۔ایک شام جب وہ شوٹنگ سے واپس لوٹ رہے تھے گیتا بالی کی جیپ اُس سے آگے تھی جب کہ

اُسکی گاڑی گیتا کی گاڑی کے پیچھے تھی۔اچانک گیتا کی جیپ ایک پُل کے بیچوں بیچ رک گئی۔شمی نے دیکھا کہ گیتا بونٹ پر جاکے کھڑی ہوگئی۔جب شمی کی جیپ قریب پہونچی تو گیتا شمی سے بولی۔شمی وہ رہا تمہارا شکار۔جب شمی نے جیپ کے آگے شیر کو کھڑا پایا تو اُسکی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔یہی وہ لمحہ تھا جب شمی اس سردارنی کی دلیری پر فریفتہ ہوگیا۔تاریخ تھی ۱۲ اپریل ۱۹۵۵۔

سوال یہ تھا کہ ''رنگین راتیں'' کی ہیروئن مالا سنہا تھی جب کہ اس فلم میں اُسکا کوئی رول نہیں تھا پھر اُسنے اس فلم میں ایک غیر روایتی رول کرنے کیلئے حامی کیسے بھرلی جب کہ وہ مرکزی کردار ادا کرتی تھی۔اصل میں وہ شمی کپور کو چاہنے لگی تھی۔چونکہ یہ ایکطرفہ عشق تھا اس لئے وہ شمی کے قریب رہنا چاہتی تھی۔اُسنے کیدار شرما کو مجبور کیا کہ وہ اُسکے لئے اس فلم میں کوئی رول نکال لے۔کیدار شرما نے اُسے مالا سنہا کے بھائی کا رول کرنے کے لئے کہا۔اپنے محبوب کے قریب رہنے کے لئے وہ لڑکی ہوکر بھی مردانہ رول کرنے کے لئے راضی ہوگئی۔اب جب کہ شمی بھی اُسکی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا،اُسنے گیتا کے سامنے شادی کی پیشکش رکھی جو اُسنے ٹھکرا دی۔وہ پیار کا اقرار تو کررہی تھی مگر شادی کے معاملے میں وہ خود ہی رکاوٹ ڈال رہی تھی۔اُسنے ہمت نہیں ہاری۔وہ اُسکے پیچھے پڑا رہا۔وہ ایک بچے کی طرح بار بار اُس سے ایک ہی سوال کرتا۔مجھ سے کب شادی کروگی؟ وہ ہر بار یہ کہہ کر اُسکا دل توڑ دیتی، ابھی نہیں۔ گیتا بڑی صاف گو اور نیک دل لڑکی تھی۔اُسنے شمی سے کہا کہ وہ اُس سے بے انتہا پیار کرتی ہے اور وہ اُسکے سوائے کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی مگر وہ اُس سے شادی نہیں کرسکتی کیونکہ اُس پر اپنے پریوار کی کفالت کی ذمہ داری ہے جس سے وہ منہ موڑ نہیں سکتی۔

اُسکے منع کرنے کے باوجود وہ ہر ایک گھنٹے کے بعد اُس سے پوچھتا۔ مجھ سے کب شادی کروگی۔چار مہینے کے مسلسل رونے گڑگڑانے اور منتیں کرنے کے بعد آخر ایک دن انہونی ہوگئی۔شمی کے گھر والے پرتھوی تھیٹرس کے ساتھ بھوپال چلے گئے تھے۔گھر میں کوئی نہیں تھا اسلئے وہ جوہو کے ایک ہوٹل میں رک گیا تھا۔اسی بیچ گیتا وہاں آگئی۔اُسنے ایک بار پھر اُس سے شادی کرنے کی پیشکش کی، یہ سوچ کر کہ وہ پھر اُسکی پیشکش ٹھکرادے گی مگر اُس دن معجزہ ہوگیا۔اُسنے شمی سے کہا۔چلو ہم شادی کرلیتے ہیں۔شمی خوشی سے اُچھل پڑا۔اُسنے سوچا کہ وہ گھر والوں کو یہ خوشخبری سنائے گا اور پھر مہورت دیکھ کے بیاہ رچالے گا۔اس سے پہلے کہ وہ گیتا بالی سے پوچھتا اُسنے شمی کپور سے کہا۔شادی کرنی ہے تو ابھی اور اسی وقت۔شمی نے پوچھا۔ابھی؟ اُسنے زور دے کے کہا۔ہاں ابھی اور اسی وقت۔وہ اپنے بیڈ سے اُچھل کر بولا۔چلو۔ابھی شادی کرلیتے ہیں۔

اُسنے اُسے گاڑی میں بٹھالیا اور وہ سیدھے جانی واکر کے گھر چلے گئے ۔جانی واکر نے ایک ہفتے پہلے نور سے بھاگ کر شادی کی تھی۔وہ اُس سے صلاح لینا چاہتے تھے۔وہ جب جانی واکر سے ملے تو اُسنے شمی سے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اسلئے ہمیں قاضی کو نکاح کرانے کے لئے ڈھونڈنا پڑتا ہے۔تم لوگ ہندو ہو،تم کسی مندر میں جاکر اپنا بیاہ رچا سکتے ہو۔شمی گیتا کو وہاں سے اپنے دوست ہری آہلووالیہ کے گھر پر لے گیا۔وہ ان دونوں کو نیپین سی روڈ کے بان گنگا مندر میں لے گیا۔بھور کا وقت تھا۔شمی کرتے پاجامہ میں تھا جب کہ گیتا کڑھائی دار شلوار کرتے میں غضب ڈھا رہی تھی۔پنڈت نے اُن سے کہا کہ دو گھنٹے کے بعد آئیں، وہ اُنکا بیاہ رچا دیں گے۔وہ دو گھنٹے تک مندر کے باہر جاکے بیٹھے رہے۔دو گھنٹے کے بعد پجاری اُنہیں مندر میں لے کر گیا اور پھر ان دونوں کی شادی کرڈالی۔ان دونوں نے اگنی کنڈ کے گرد سات پھیرے لئے۔جب پنڈت نے شمی سے کہا کہ وہ گیتا کی مانگ میں سیندور ڈال دے تو اتنی صبح وہ سیندور کہاں سے لاتا۔شمی کو ایک تدبیر سوجھی۔اُسنے گیتا بالی کا میک اپ بکس کھولا اور اُسمیں سے لپ اسٹک نکالی۔یہ ہندوستان کا ایسا پہلا انوکھا دلہا تھا جس نے سیندور کی جگہ لپ اسٹک سے اپنی بیوی کی مانگ بھری تھی۔ہری آہلووالیہ اکلوتا گواہ تھا جو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔وہ گیتا کو لے کے اپنے دادا کے پاس پہونچ گیا۔دادا نے دونوں کو گلے لگایا اور اُنہیں جی بھر کے آشیرواد دیا۔شمی نے بھوپال فون کرکے اپنے والدین کو یہ خوشخبری سنائی۔وہ یہ خبر سن کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔اُسکے بعد وہ گیتا کے گھر والوں کو یہ خوش خبری سنانے چلے گئے۔اگست 1955 میں شمی کی شادی گیتا بالی سے ہوئی۔اُسکے ٹھیک دو سال بعد فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' ریلیز ہوئی جس نے شمی کی تقدیر بدل کے رکھ دی۔وہ راتوں رات اسٹار بن گیا۔اُسکو کامیاب بنانے میں گیتا بالی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔جس طرح کے ڈانس اُسنے اپنائے وہ گیتا بالی کی ہی دین تھی۔گیتا بالی کمال کی ڈانسر تھی۔اُسنے اپنے شوہر کی نہ صرف شخصیت اُبھارنے میں مدد کی بلکہ اُسے کامیابی کے سبھی منتر سکھلا دئے۔

''تم سا نہیں دیکھا'' کی کامیابی کا جشن منانے کے لئے دلی میں ایک تقریب منعقد کی گئی تھی جسمیں شمی کپور اور گیتا بالی کو مدعو کیا گیا تھا۔شمی کپور نے گیتا بالی سے جب ساتھ چلنے کے لئے کہا تو اُسنے شمی کپور کے ساتھ چلنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ کسی اور کو ڈیٹ دے چکی ہے۔شمی کپور بڑا مایوس ہوا۔شمی کپور جس گیتا بالی کو جنون کی حد تک چاہتا تھا، اُسکے بنا اپنی کامیابی کا جشن اکیلے منانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔بہر حال اپنے غم کو دل میں سمیٹے وہ بمبئی سے چلنے والی ٹرین فرنٹیئر میل میں سوار ہوگیا۔دو چار اسٹیشن کے بعد اُسکے دوستوں نے اُس سے کہا کہ زنانہ کمپارٹمنٹ میں ایک برقعہ پوش خاتون اُس سے بات کرنا چاہتی ہے۔وہ جب ڈبے میں اُس خاتون سے ملنے گیا تو اُس خاتون نے اپنے منہ سے برقعہ ہٹایا۔جب شمی کپور نے اس خاتون کو دیکھا تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔یہ اور کوئی نہیں بلکہ گیتا بالی تھی۔وہ بھلا اپنے شوہر کی اس خوشی کی گھڑی میں اُس سے الگ کیسے رہ سکتی تھی۔

گیتا بالی ہر طرح کے رول کرنے میں ماہر تھی۔وہ اداکاری نہیں کرتی تھی بلکہ اُس کردار کو جی لیتی تھی جسے وہ پردہ سیمیں پر ادا کرتی تھی۔مزے کی بات یہ ہے کہ گیتا بالی نے اپنے سسر اور جیٹھ کے ساتھ بھی کام کیا۔پرتھوی راج کپور کے

ساتھ فلم ''آنند مٹھ'' کی جب کہ اپنے جیٹھ راجکپور کے ساتھ فلم ''باورے نین'' کی ۔جس سال اُسکی شادی ہوئی اُسی سال اُسکی فلم ''وچن'' ریلیز ہوئی۔ ''وچن'' میں اُسکے ساتھی کلا کار راجندر کمار اور بلراج ساہنی تھے۔اس فلم میں اُسکی عمدہ اداکاری کے لئے اُسے فلم فیر ایوارڈ سے نوازا گیا۔وہ ایک اور فلم ''کوی'' کے لئے بھی بہترین ساتھی اداکارہ کے لئے نامزد کی گئی تھی ۔یہ فلم بھی اسی سال ریلیز ہوئی۔

یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ گیتا بالی کا سیکرٹری مشہور فلمساز، بونی کپور اور انیل کپور کا والد سریندر کپور تھا۔شادی کے بعد اُسنے بہت کم فلمیں کیں ۔جو کیں وہ خاصی کامیاب رہیں، جن میں کیدار شرما کی 'رنگین راتیں' شکتی سامنت کی ''انسپکٹر'' سی ایل دھیر کی ''زندگی'' ایچ ایس رویل کی ''پاکٹ مار'' گورودت کی ''سیلاب'' ہریش کی ''لالٹین'' اور جی پی سپی کی ''مسٹر انڈیا'' اور محمد حسین کی ''اجی بس شکریہ'' قابل زکر ہیں ۔وہ کپور خاندان کی پہلی خاتون تھی جس نے شادی کے بعد بھی فلموں میں کام جاری رکھا۔اُسنے زیادہ تر وقت اپنے بچوں کو دیا۔شمی کپور اتنا مصروف ہوگیا تھا کہ وہ ہفتوں گھر سے باہر رہتا تھا۔

اُسکی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ راجندر سنگھ کے شہرہ آفاق ناول ایک چادر میلی سی پر فلم بنائے۔اُسنے جب اپنے شوہر سے زکر کیا تو وہ فوراً راضی ہوگیا اور اُسنے اُسے فلم بنانے کے لئے سرمایہ فراہم کیا۔ اسکی ہدایت کاری کی باگ ڈور راجندر سنگھ بیدی کو تھمائی گئی۔اس فلم کا نام ''رانو'' رکھا گیا۔اس میں وہ دھرمیندر کی بڑی بہن کا رول ادا کرنے والی تھی۔وہ اپنے بیٹے اور شمی کپور کو اپنے ساتھ لوکیشن دیکھنے کے لئے پنجاب کے گاؤں میں لے گئی۔ٹھنڈ کا موسم تھا۔شمی کپور سے ٹھنڈ برداشت نہیں ہو پا رہی تھی جب کہ وہ ٹھنڈ میں چہک رہی تھی ۔چونکہ شمی کپور بہت مصروف تھا۔وہ اُسوقت ناصر حسین کی فلم ''تیسری قسم'' کر رہا تھا۔وہ اپنے بیٹے کے ساتھ پنجاب میں ہی رکی ۔ایک روز اُسے بخار ہوا۔شمی کپور کو خبر کی گئی۔وہ اُڑتا ہوا چلا آیا۔ پتہ چلا اُسے خسرہ ہوگیا ہے۔وہ اُسے بمبئی لے آیا۔بمبئی میں وہ پندرہ روز تک اسپتال میں رہی۔ چیچک نے اُسکے معصوم اور خوبرو چہرے کو اتنا ڈراونا بنا دیا تھا کہ اُسے دیکھ کے وحشت ہونے لگتی تھی۔ پندرہ وز کے بعد اُسنے آخری سانس لی۔

گیتا بالی کم عمری میں اس جہاں فانی سے کوچ کر گئی۔اُسے جیسے قبل از مرگ ہی آگہی ہوگئی تھی۔شمی کپور کی دوسری بیوی نیلما دیوی شمی کپور اور گیتا بالی کی زبردست پرستار تھیں ۔ایک دن اُسنے گیتا بالی سے آٹوگراف لیا۔گیتا بالی نے اُسکے آٹوگراف بک پر لکھا ۔یاد رکھنا M کو۔ یاد رکھنا E کو۔ دونوں کو ملا کے ME ہو جاتا ہے۔یعنی میں یا مجھے۔مطلب یہ کہ مجھے مرنے کے بعد یاد رکھنا۔گیتا بالی محض پینتیس سال جی پائی ۔اُسکے دو بچے ہوئے۔ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹے کا نام آدتیہ راج کپور ہے جب کہ بیٹی کا نام کنچن ہے۔جسکی شادی ہندی فلموں کے مشہور ہدایت کار اور فلمساز من موہن ڈیسائی کے بیٹے کانتی ڈیسائی سے ہوئی ہے۔شمی کپور اُسے مرتے دم تک نہیں بھول سکا وہ محض دس سال ساتھ رہے مگر ان دس سالوں میں اُنہوں نے دس صدیاں جی لیں۔

☆

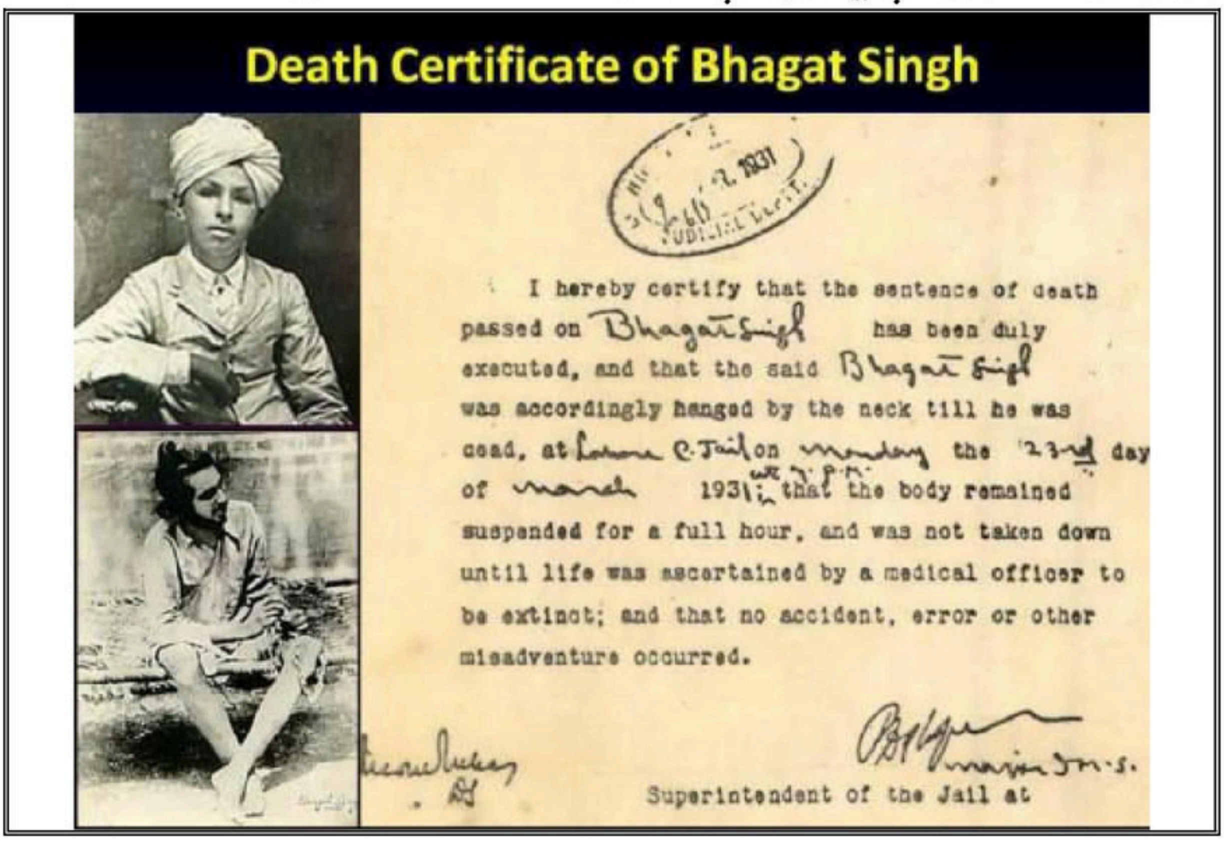
Death Certificate of Bhagat Singh

I hereby certify that the sentence of death passed on Bhagat Singh has been duly executed, and that the said Bhagat Singh was accordingly hanged by the neck till he was dead, at Lahore C. Jail on Monday the 23rd day of March 1931 that the body remained suspended for a full hour, and was not taken down until life was ascertained by a medical officer to be extinct; and that no accident, error or other misadventure occurred.

Superintendent of the Jail at

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

میں آپ کا پرانا عقیدت مند ہوں۔ایک وجہ تو یہ ہے کہ آپ ''چہارسُو'' کے مدیرِ مسئول ہیں جس نے اردو رسائل کی تاریخ میں ایک روایت بنائی ہے اس کا زرسالانہ ''دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' رکھا ہے جو دنیا کا سب سے انوکھا زرسالانہ ہے جس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے بانی مدیرِاعلیٰ جناب ضمیر جعفری ہیں۔آپ کی ان سے بے پناہ عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ انہیں مرحوم نہیں لکھتے۔مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ وہ آپ کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور آپ کی بے پناہ صلاحیت کے قائل بھی تھے۔۱۹۸۵ء میں ورلڈ ہیومر کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے وہ عطاء الحق قاسمی صاحب کے ساتھ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔میں عثمانیہ یونیورسٹی میں نیا نیا لکچرر ہوا تھا۔پاکستانی مہمانوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ضمیر جعفری صاحب کی شخصیت جتنی بھاری بھرکم تھی اتنے ہی وہ نرم طبیعت کے مالک تھے۔ان کا مشفقانہ رویہ اور شگفتگی آج بھی یاد آتی ہے۔جب انہیں پتہ چلا کہ افسانے لکھتا ہوں تو کئی کتابیں مجھے دیں جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔عطاء الحق قاسمی صاحب سے نسبتاً بے تکلفی تھی۔قاسمی صاحب نے اپنے کالموں میں مجھ ناچیز کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد وہ جب بھی حیدرآباد آئے ان سے خوب ملاقاتیں رہیں۔تیسری بات یہ کہ آپ ایک تخلیقی فن کار ہیں اپنے رسالے میں سب سے زیادہ جگہ افسانوں کو دیتے ہیں۔آپ پینٹنگ اور فوٹو گرافی کی باریکیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ٹائٹل سے لے کر آخری صفحے تک ایک ایک صفحے سے آپ کی جاں فشانی اور تکمیلیت پسندی جھلکتی ہے۔خود مجھے اپنا سرورق دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔اسکیچ، فوٹو گرافی اور پینٹنگ کا خوب صورت امتزاج ہے۔آپ کی ذہانت، ندرت اور جمالیاتی احساس کا دل سے قائل ہونا پڑا۔میرا خیال ہے یہ سرورق سب سے مختلف اور منفرد ہے۔قدیم بند دروازہ اور چھت کی کھڑکیاں حیدرآباد کی قدیم تہذیب کا باب بند ہو جانے کی علامت ہے (اس بند دروازے کے پیچھے بے شمار کہانیاں چھپی ہوئی ہیں) اور فوٹو گرافس!!

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے یادگار لمحات۔۱۹۹۰ء میں جامعہ عثمانیہ نے گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ فن کاروں کے اعزاز میں شاندار تقریب کا اہتمام کیا تھا (کیونکہ جامعہ عثمانیہ کے سپوت سی نارائن ریڈی کو اس سال یہ ایوارڈ ملا تھا) اس میں شرکت کے لیے قرۃ العین حیدر تشریف لائی تھیں۔شعبہ اردو میں کئی پروفیسروں کی موجودگی کے باوجود مجھے قرۃ العین حیدر پر تعارفی مضمون انگریزی میں پڑھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جبکہ میں صرف لکچرر تھا (اس سے اس دور کے اساتذہ کی فراخ دلی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے) عینی آپا بہ نفسِ نفیس ڈپارٹمنٹ آئیں میرا لکھا ہوا مضمون دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔مطمئن ہوئیں کچھ مبالغہ آمیز جملوں کو کاٹ دیا۔کہیں کوئی لفظ بدل دیا۔اپنی آئیڈیل مصنفہ کو اتنے قریب دیکھ کر دل پر کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ہر تصویر کے بارے میں لکھوں گا تو خط کافی طویل ہو جائے گا۔پروفیسر گوپی چند نارنگ سے طالب علمی کے زمانے سے متاثر ہوں ان کی تقریر اور تحریر کے جادو کا معترف ہوں اتفاق سے وہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کے ممتحن تھے۔وہ میرے مرّبی اور محسن ہیں۔انتظار حسین صاحب کو بھی طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا۔جب ساہتیہ اکادمی نے انہیں پریم چند فیلوشپ پر ہندوستان بلایا اور انہوں نے اردو کے مختلف مراکز کا دورہ کیا تو حیدرآباد میں ان کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل رہا۔جو دو تین دن ان کے ساتھ گزرے وہ میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔مجتبیٰ حسین صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ میرے خاکے ''بیگ احساس تم ہی ہو؟'' سے کیا جا سکتا ہے۔میں ان کی محبتوں کا اسیر ہوں۔

صارفیت کے اس دور میں آپ جیسے لوگ بھی ہیں جو سود و زیاں کی پرواہ کیے بغیر ادبی دنیا کے لاتعداد مشاہیر اور شہرت سے دور رہنے والے ادیبوں اور شاعروں کا خصوصی نمبر بلا کسی تخصیص کے محنت اور اخلاص کے ساتھ ترتیب دیتے ہیں۔جب آپ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی اس وقت تک مجھے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی نہیں ملا تھا۔بقول بشریٰ رحمٰن ''جہاں جس ملک میں کوئی گوہرِ نایاب نظر آیا یا جس کے کام نے چونکا دیا اسے تلاش کر کے ''چہارسُو'' کے صفحات کی زینت بنا دیا خاص طور پر انڈو پاک کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔یہ ''چہارسُو'' کا کارنامہ ہے۔''

''براہِ راست'' کے عنوان سے جو انٹرویو چہارسو میں شائع ہوئے انہیں جمع کر کے پانچ سو صفحات کی ایک کتاب ''رنگ باتیں کریں'' ترتیب دینا اور بھیجنا یہ جنون نہیں تو پھر کیا ہے؟ آپ کی یہ دیوانگی ضرور رنگ لائے گی۔سوانحی اشاریے کو آپ نے بڑا خوبصورت نام ''سرمئی شام کا اجالا'' دے کر بھرپور تخلیقیت کا اظہار کیا۔''براہِ راست'' کی تمہید میں آپ کی محبت جھلکتی ہے۔ساری ادبی دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ آپ جو چالیس سوالات تیار کرتے ہیں ان سے فنکار کی شخصیت آئینہ ہو جاتی ہے۔ایک طرف اسی فنکار پر لکھے گئے توصیفی مضامین دوسری طرف آپ کے سوالوں کے نشتر! پڑھنے والے کو فنکار کے وزن و وقار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔یہ آرٹ آپ نے کہاں سے سیکھا؟ کبھی اپنے اندر چھپے ہوئے تخلیق کار سے بھی ایسے ہی سوال کیجیے گا حضور!! پھر دیکھئے دل کا کیا رنگ ہوتا ہے۔

حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں ''چہارسُو'' کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔

شمارے کے مشمولات دلچسپ ہیں۔نند کشور وکرم، انل ٹھکّر اور شموئل احمد کے افسانے پڑھ پایا۔تینوں کا موضوع قربانی ہے۔شموئل احمد کا افسانہ پڑھ کر شہنشاہ بابر اور ہمایوں کا قصہ یاد آ گیا۔انل ٹھکّر کا افسانہ پڑھ کر ایک لطیفہ یاد

آ گیا۔ میں اسے یہاں دہراؤں گا نہیں۔

"ایک صدی کا قصہ" میں راج کمار کا نام دیکھ کر بڑے شوق سے پڑھا۔ دیپک کنول سے ایک چھوٹی سے غلطی ہو گئی۔ فلم "وقت" کا مکالمہ تھا "چنائے سیٹھ یہ چاقو بچوں کے کھیلنے کی چیز نہیں ہاتھ کٹ جائے تو خون نکل آتا ہے" دیپک کنول نے چاقو کی جگہ "چھری" لکھ دیا۔ ویسے مضمون شاندار ہے۔ راج کمار انوکھے مزاج کے فنکار تھے ان کے بے شمار قصّے مشہور ہیں۔ ایک بار موسیقار بپی لہری جو ہمیشہ زیورات سے لدے رہتے ہیں ان کا سامنا راج کمار سے ہو گیا۔ راج کمار نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا "بس اک سیندور کی کمی ہے" خط بہت طویل ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ لمبی عمر دے اور آپ کی تخلیقی صلاحیتوں میں برکت عطا فرمائے (آمین)

پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد، بھارت)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، دعائیں۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی آپ دکن سے ڈاکٹر بیگ احساس کو ڈھونڈ لائے اور آپ کی تلاش سے عاشقانِ اردو کو بیگ صاحب کی نسبت بہت سی نئی معلومات دستیاب ہوئیں۔ بالخصوص اُن کا افسانہ "دخمہ" تو قارئین کے لیے بے مثال تحفہ سے کم نہیں۔

یہ کہنا درست لگتا ہے کہ ہمیشہ سے کہانی سنانے والے کے حالات ہی اس سے وہ لکھواتے آئے ہیں جن سے اس کا معاشرہ اس کی زندگی کے دور میں گزر رہا ہوتا ہے، یا گزر چکا ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ کام تلخ تجربات کراتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھی تلخی لئے ہوتا ہے، کبھی اسے ان پریشان کن دنوں میں بھی کوئی انسانیت کی کرن جھانکتی نظر آ جاتی ہے تو بات غم وغصہ کی جگہ کچھ اور ہی بن کر سامنے آتی ہے، وہ تحریر مٹنے کے لئے وجود میں نہیں آتی ہے، ایسا ہوتا ہے مگر کم۔ حالات اگر بالفرض ہر قسم کے دکھ اور پریشانی سے یکسر خارج ہوں تو شاید اچھی فکشن کا ظہور میں آنا ہی بند ہو جائے اور ہم کہہ سکتے ہیں فکشن نویس شاید جنت میں بے کاری کا الاؤنس لے رہے ہوں گے۔

موجودہ دور بھی اپنی پریشانیاں لئے چل رہا ہے۔ اس کا رونا کیا کہ ہمارہ سیارہ گرم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس پر پانی ناپید نہ سہی تو عنقا۔ ان بیماریوں پر واویلا کرنا کیا جن کا علاج انسان کی پہنچ سے ابھی تک باہر ہے اور ان جنگوں کے اثرات پر توبہ تلا کیسی جو عوام خود نہیں لاتے ان پر مسلط کی جاتی ہیں۔ رونا تو وہ حقیقت پسندانہ ہے جو مشفق قسم کے حضرات کے ان پر ستم ڈھانے سے پیدا ہوتا ہے جو ان سے صرف نیکی کی توقع رکھتے ہیں، کہیں امن کے پردے میں جنگ کراتے ہیں، کہیں خرابے کی مٹی کو خاک شفا کہہ کر بیچتے ہیں، کہیں زلزلے کی زد میں آ جانے والوں کو جاں باختہ جوس کے ڈبے اور جاں باختہ اینٹی بائیوٹکس کا تحفہ بھیج کر انکم ٹیکس سے سرخروء کے طلبگار بن جاتے ہیں۔

گلزار جاوید نے بھی اپنے افسانے سینے میں چھپا سانپ میں ان امور سے آگاہی کا ثبوت دیا ہے جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ وہ مصنوئی فکشن کے نہ دلدادہ ہیں نہ خالق جن میں مصنف حقیقت کو بالائے طاق رکھ کر خود اپنے جذبات کا شکار ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر افسانہ ایک بیانیہ ہے ہمارے دور کے سماج کے ایک پہلو کا جائزہ، اس کے کردار و واقعات اس حد تک حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں کہ صرف صاحبانِ قلم ہی نہیں سماجی شعور رکھنے والا کوئی عام انسان اگر پڑھے تو وہ کہہ اٹھے گا اس افسانے کو میں نے کیوں نہیں لکھا، یہ سب میں جھیل چکا ہوں، میرے کینسر کے مریض بھائی کے ساتھ یہی ہوا تھا، یہی جسے اس ملک میں شدید بیماری سے واسطہ پڑے اس کی تقدیر ہے۔

گلزار نے واقعات کی جس کڑی کو اس افسانے کے لئے چنا ہے اس کے مرکزی کردار تکلیف جھیلنے والے پنجاب کے درمیانہ درجے کے تین افراد ہیں ۔۔ ماں باپ اور بیٹا اور ان پر ستم توڑنے والے، وہ جنہیں وائے افسوس دعوی مسیحاء ہوتا ہے۔ یہ مسیحا مختلف ناموں سے بیماروں کی زندگی میں آتے ہیں اور جس نصب العین سے اس پیشے میں آتے ہیں، تعلیم حاصل کر کے یا تعلیم کو علاج معالجے کے لئے غیر ضروری سمجھ کر، اسے اکثر مریض کے مرتے دم تک پورا کرتے ہیں۔ اپنے مرتے دم تک تو خیر ضروری ہوتا ہی ہے ورنہ گھوڑا گھاس سے یاری کریگا تو کھائے گا کیا۔ ان میں اور ہنگامہ گیروں میں کیا فرق ہوتا ہے جو رستوں پر بیٹھ کر تعویزوں، بوتل میں بند کیچوؤں اور سانڈے کے سرعام قتل کا تماشہ دکھا کر لوگوں کو لوٹتے ہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جنہوں نے زندگانی گزارنے کی یہ راہ تعلیم اور ٹریننگ کے طویل سفر میں اپنائی اور سیکھی ہے انہیں نہ دعوی مسیحائی ہوتا ہے نہ انکی نظر مریض کی مالی استطاعت پر ہوتی ہے۔

گلزار جاوید نے بیمار معاشرے کے صرف ایک عارضے پر کہانی کے روپ میں قلم اٹھایا ہے، ہنستے ہنساتے موڈ میں، جزویات کا ان کے ہاں توڑا نہیں، نہ افسانے کے بنیادی عنصر کہانی کا پھر کیوں نہ ان سے مزید کی توقع رکھی جائے۔ خرابیوں کی یہ مہابھارت تو بہت طویل ہے، کہانیاں ہی کہانیاں اس میں چھپی ہیں۔

حسن منظر (کراچی)

میرے گلزار، صدا خوش رہو۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی تمہارا انتخاب ایک خوبصورت انسان اور لاجواب ادیب بیگ احساس کی صورت میں منفرد ٹھہرا۔ بیگ صاحب نے سوالات کے جواب بہت مثبت انداز میں دیے ہیں جس میں اُن کے نقطۂ نظر کے ساتھ معلومات کا ذخیرہ بھی موجود ہے۔ بیگ صاحب کے افسانے "دخمہ" کی بابت الفاظ دستیاب نہیں ایک نئے عقیدے، تہذیب اور چلن سے متعارف بھی خوبصورتی سے کرا گئے اور بہت بڑے المیہ کی نشاندہی بھی بردبار طریقے سے کرنے میں کامیاب رہے۔

آپا جمیلہ شبنم کے سفرنامہ کی آخری قسط پڑھ کر دل ڈوبنے لگا کہ پتہ

نہیں اب اُن کی تحریر آپ کب شاملِ اشاعت کریں گے۔ بہرحال قدرت نے اُن کے قلم میں خاص تاثیر بھردی ہے۔ فیروز عالم نے طب کو بھی ادب کے انداز میں لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ بڑے لکھنے والے ہیں۔ کولیسٹرول کے بارے میں ہر پڑھا لکھا آدمی باخبر ہونا چاہیے اور فیروز عالم کے مضمون کے بعد تو بے خبر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تابش خانزادہ کے ناول نے خوب جکڑا ہوا ہے۔ ہر عمر کا قاری اُن کی گرفت میں ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ اسی طرح کامیابی سے آگے بڑھتے رہیں۔

افسانے سبھی عمدہ تھے خاص کر وکرم جی کی ''قربانی''، ٹھکّر جی کی ''سنگ''، شموئل صاحب کا ''لمبا لیٹ'' اور محترمہ سیما پیروز نے ''کھارے سوڈے کی بوتل'' میں سوڈے کے بجائے شراب بھر کے کہانی کو دو آتشہ بنا دیا۔ رینو بہل بہت ذہین اور محنتی لڑکی ہے۔ میری بابت اُس کی تحریر پڑھنے کے بعد ہر کوئی میری رائے سے متفق ہو جائے گا۔ ایک تحریر جس نے اس بار بہت متاثر کیا وہ جمیل احمد عدیل کے ''دھوپ افسانے'' ہے۔ کیا خوبصورت انداز میں افسانوں کا تجزیہ کیا ہے کہ تجزیہ بھی بجائے خود افسانے کے آگے کا لطف دے گیا۔ فاری شانے اسٹیفن ولیم ہاکنگ کے بارے، بہت عمدہ معلومات فراہم کی ہیں اُس سے کہو کہ وہ یہ سلسلہ جاری رکھے اُسے لکھنے کا سلیقہ آتا ہے۔

دیپک کنول جی نے حسبِ سابق راجکمار کو صحیح معنوں میں راجکمار بنا کر پیش کیا۔ شاعری میں آصف ثاقب، مسلم شمیم، چاند صاحب، عارف شفیق، وشال کھلّر، مسعود تنہا اور ڈاکٹر ریاض احمد نے کمال کیا ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو ایس اے)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ برائے مئی جون ۲۰۱۸ء محترم بیگ احساس جیسی شخصیت سے موسوم ہے جن کی تمام عمر بلاشبہ علم وادب کی ترویج و ترقی میں صرف ہوئی ہے۔ آپ نے اس طرح ایک ٹھوس اور خوبصورت انداز میں ان کی خدمات پر جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس پر آپ مبارک کے مستحق ہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ ایک شاعر اور ادیب کی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک نہایت نفیس اور محبت کرنے والے مہربان انسان ہیں۔ رینو بہل صاحبہ نے ''پیار کا بے لوث جھرنا'' کے عنوان سے ان کے بارے میں جو مضمون تحریر کیا ہے وہ قدر دانی کا ایک اظہار ہے جو قابلِ تعریف ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے اہم طبّی معلومات کے سلسلے میں کولیسٹرول کے بارے میں بہت آسان فہم انداز میں قارئین کی نذر جو تحریر کی ہے اسے پڑھ کر وہ بخوبی دل کے امراض میں کولیسٹرول کے کردار سے آگاہ ہو کر بچاؤ کی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں۔ فاری شانے ''قدرت کی صناعی کا امین'' کے عنوان سے صدی کے نامور سائنسدان اسٹیفن ہاکنگ کے بارے میں جو دلچسپ اور معلوماتی مضمون تحریر کیا بہت سے قارئین اس سے پہلی مرتبہ آگاہ ہوئے ہوں گے۔

افسانوں میں شموئل احمد نے ''لمبا لیٹ'' میں بیمار باپ کے بیٹے کی بے مثال خدمت اور محبت اور پُرخلوص جذبات کے اظہار کی داستان رقم کی گئی ہے جو متاثر کن ہے۔ ''کھارے سوڈے کی بوتل'' میں سیما پیروز ایک ایسے حساس مسئلے کی منظر کشی کی ہے جو کسی بھی مرد کو درپیش آ سکتا ہے۔ اسی لیے مذہب میں نیچی نظروں کا حل پیش کیا گیا ہے۔ آغا گل نے ''بھولو'' کے عنوان سے نصف صدی سے زیادہ عرصہ پہلے کے حالات پر جو سیاسی منظر نامہ لکھا ہے اور انہیں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے وہ حالات اب بدل چکے ہیں اور نہ ہی وہ نقطۂ نظر عملی طور پر اب ممکن ہے۔ قومی وحدت کے لیے عملی اقدامات کرنے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔ نند کشور وکرم کا افسانہ ''قربانی'' اور انل ٹھکّر کا افسانہ ''سنگ'' دلچسپ تحریریں ہیں۔

شاعری میں بھی بہت اچھا کلام شامل کیا گیا ہے۔ اس ساری کاوش سے شمارہ کو خوبصورت انداز میں قارئین کی نذر کرنے پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ قدرے تاخیر سے موصول ہوا تو میں نے آپ کے دستیاب فون نمبروں پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کہیں سے جواب نہیں ملا۔ اس شمارے میں ڈاکٹر بیگ احساس کے حوالے سے جو کچھ پڑھنے کو میسر ہوا اس نے طبیعت خوش کر دی نہ صرف یہ کہ ''براہِ راست'' اُن کی زندگی سے وابستہ حقائق کو منکشف کر گیا بلکہ شعر و ادب پر اُن کی دسترس، ان کی شخصیت کا عکاس نکلا۔ مثلاً واجدہ تبسم پر ان کے خیالات کا ثبوت اس عبارت سے عیاں تھا:

''وہ لٹ پٹ کر حیدرآباد آئی تھیں افسانہ اترن کی کامیابی کے بعد ایک کمرشل رسالے۔۔۔۔ اس طرح کے افسانے نہیں لکھے'' ڈاکٹر بیگ احساس کے یہ خیالات یقیناً تاریخِ افسانہ میں ایک تازیانے کی حیثیت رکھتے ہیں اور میرے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ پھر گائے کے گوشت کے استعمال پر اُن کے یہ رشحات ''مثلاً حیدرآباد میں اشرافیہ گائے کا گوشت کھانا پہلے ہی سے ناپسند کرتی۔ صرف غریب اور نچلے متوسط درجے کے افراد گائے کا گوشت کھانے کے عادی تھے۔ تمام ہوٹلوں میں بکرے کا گوشت استعمال ہوتا ہے یا چکن۔۔۔۔ یو پی بہار کے لوگ بڑے جانور کے گوشت کے عادی ہیں۔ ایک ایسی چشم کشا حقیقت ہے جس کا ثبوت میں خود اور میرا خاندان ہے ہمارے یہاں بھی اگر کہیں سے پہنچ جاتا ہے تو ہم انکار نہیں کرتے بلکہ دینے والے کے دل شکنی کرنے کے بجائے کسی اور تک خاموشی سے بڑھا دیتے ہیں۔

بیگ احساس کے افسانے کا رنگ ہی کچھ اور ہے نئی نسل میں ان کے افسانے سونے پر سہاگہ ہیں جس کا ذکر چہارسو کے ۴۶ صفحات کو مزین کر رہا ہے۔ ''دخمہ'' یقیناً ان کے افسانوں میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''چہارسُو'' کو اس قرطاسِ اعزاز پر مبارکباد پیش ہے اور ڈاکٹر بیگ احساس کو ان کے ایک قاری کا خراجِ تحسین!

سید نصرت بخاری کی ''بُو'' سعادت حسن منٹو کی ''بُو'' سے متاثر ہو کر

لکھی گئی ہے۔ اگرچہ مصنف نے بنیادی خیال سے انحراف کرتے ہوئے اپنے افسانے کو ایک نیا روپ دینے کی کامیاب کوشش ضرور کی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا کولیسٹرول ''چہار سُو'' کے قاریوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ فاری شا نے اسٹیفن ہاکنگ پر جو تحریر کیا ہے وہ چہار سو کے قاریوں کے لیے ایک سوغات سے کم نہیں۔

غالب عرفان (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہار سُو'' ہر بار چونکانے والی شخصیات کے گوشے کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ پروفیسر یونس شرر جیسے بے باک قلم کار سے آپ نے بے باک سوالات کیے اور انہوں نے بے جھجک معقول جوابات دیے۔ ان کی تخلیقات بھی نئے ذائقے سے آشنا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر حنیف فوق، جمیل جالبی، احمد ہمدانی، تسلیم الٰہی زلفی، حمایت علی شاعر، پروفیسر سحر انصاری، نیرّ جہاں جیسے مشاہیر جناب یونس شرر کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ نظم، غزل، مسدس ہر جگہ یونس شرر کامیاب ہیں۔

محترمہ شہناز خانم عابدی کے افسانچے دلچسپ ہیں۔ آپ کا افسانہ ''سینے میں چھپا سانپ'' کڑوی حقیقت کا غماز ہے۔ ویسے وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔ حکیم و ڈاکٹر تو لوٹنے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں اِلا ماشاءاللہ ''یوم الحساب'' میں یسٰین احمد نے ایک شریف النفس بیوی کا کردار دکھایا ہے جو خاموشی سے غائب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بعض گزرے ہوئے شاعروں کے ضخیم مجموعے بہ صرفِ زرِ کثیر شائع کیے ہیں اُسی سلسلے کی ایک کڑی شاعر برق و آشیاں کا مجموعہ ہے۔ بلتستان کی امراؤ جان ادا بہت دل چسپ ہے۔ جناب دیپک کنول نے حسبِ معمول سری دیوی کے بارے میں خوب معلومات بہم پہنچائیں ان کی موت پُر اسرار نہیں رہ گئی تھی!

ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اکثر ادبی مجلّوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ اُن میں چھپنے والی متعدد تحریریں غیر معیاری ہوتی ہیں۔ اگر مدیران اُن تحریروں کو قبل از اشاعت بغور پڑھ لیتے تو یہ تخلیقات کبھی اشاعت پذیر نہ ہوتیں۔ میں چہار سو کا طویل عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بات وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ اس میں شامل ہونے والی ہر تحریر مدیر چہار سو نہ صرف توجہ سے پڑھتے ہیں بلکہ پرچے کا معیار بھی بلند رکھنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ میں اپنی بات کے ثبوت میں چہار سو کے تازہ شمارے کی مثال دینا چاہوں گا جس میں حیدرآباد، دکن کے ڈاکٹر بیگ احساس کی شخصیت وفن کو سرورق سے لے کر پسِ ورق تک جس قرینے اور سلیقے سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا ہے اُسے دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہار سو کا تازہ شمارہ مئی جون ۲۰۱۸ء باصرہ نواز و بصیرت افروز ہوا۔ اس مرتبہ قرطاس اعزاز ڈاکٹر بیگ احساس کے نام ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حق بہ حقدار رسید تو غلط نہ ہوگا۔ ڈاکٹر بیگ احساس کی دس مطبوعات زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ تحقیق و تنقید سے متعلق بھی ہیں وہ جن اہم تعلیمی اور ادبی اداروں سے وابستہ رہے ہیں ان کو یہ اعزاز ملنا ہی چاہیے۔ چہار سو میں شامل بیشتر قلمکار جانے مانے ہوئے ہیں اور جو نو واردانِ بساطِ دل ہیں وہ بھی متوجہ کرنے لگے ہیں۔ آغا گل اور رینو بہل کے افسانوں میں ایسا لگتا ہے کہ پورا عہد سانس لیتا ہے۔ شعری تخلیقات لائقِ مطالعہ اور قابلِ تعریف ہیں۔ خاص طور پر مہندر پرتاپ چاند، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر اور شگفتہ نازلی کے اشعار نئے پن کے ساتھ ساتھ معنویت سے بھی بھرپور ہیں۔

اختر شاہجہاں پوری (بھارت)

گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

آپ کی توجہ اور عنایت کے سبب مجھے چہار سو کا ہر شمارہ کسی نہ کسی وسیلے اور راستے سے مل جاتا ہے۔ انل ٹھکّر کے ذریعہ گذشتہ شمارہ ملا تھا۔ تازہ شمارہ محترم مہندر پرتاپ چاند صاحب کے توسط سے ملا۔ اور ایک عرصہ سے میں نے کسی شمارے کی رسید بھی نہیں دی نہ آپ کی محبتوں کا شکریہ ادا کیا۔ یہ عبارت تمام کوتاہیوں کی تلافی کے طور پر قبول فرمائیں اور اپنی محبتوں کے اس ترسیلی سلسلے کو جاری رکھیں۔

چہار سو کے ہر شمارے میں بھارتی اہلِ قلم کی بے پناہ نمائندگی دیکھ کر ایک مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے سرحدوں کے سارے کانٹے یکلخت پھولوں میں تبدیل ہو گئے۔ آپ کا ادارہ قابلِ مبارک باد ہے کہ ہم لوگوں سے رسالہ کے ذریعہ آپ نے رابطہ بنائے رکھا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے ایک افسانہ آپ کو ارسال کروں لیکن ہمت بھی نہیں ہوتی۔ آپ کے دربار میں صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں کی رسائی ہے حالانکہ میں نے پہلا افسانہ ۱۹۷۲ء میں لکھا تھا۔ آج بھی کبھی کبھی افسانے کی مزاج پُرسی کر لیتا ہوں۔

نذیر فتح پوری (پونہ، بھارت)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہار سُو'' کا تازہ شمارہ حسبِ روایت اپنے ادبی و علمی وقار کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ خطوط کے بعد ڈاکٹر محمد بیگ احساس کا گوشہ پڑھا۔ ''براہِ راست'' افسانہ، مضمون اور ان کے فکر و فن پر لکھی گئی تحریریں متاثر کن ہیں۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے مطالعے سے بھرپور سوالات کے جوابات ڈاکٹر صاحب نے تفصیل اور اعتماد سے دیے ہیں۔ اپنی کہانیوں کا دفاع کرنا آسان نہیں مگر انہوں نے کامیابی سے دفاع کیا ہے۔ میں اُن کی اس بات سے متفق ہوں کہ:

''جدیدیت کے نام پر کہانی کے اسٹرکچر کے ساتھ جو کھلواڑ کیا گیا اس سے اختلاف رہا۔'' (ص ۱۲)

ایسا کچھ عصر حاضر کے شاعروں نے بھی شعر کے ساتھ کیا ہے۔ ممتاز مفتی مرحوم کا یہ قول کہ ''افسانہ بڑا بدمعاش ہوتا ہے آپ جیسے شریف آدمی سے یہ خود کو کس طور پر لکھواتا ہے؟'' یہ سوال میں گلزار جاوید بھائی سے کر رہا ہوں دیکھیں کیا جواب آتا ہے۔ بیگ احساس کی تحریروں اور افسانوں سے اُن کا تاریخ، تہذیب اور ادب کا گہرا مطالعہ جھلکتا ہے۔ ''آگ کا دریا'' اُن کی تحریر مختلف ہے اور پھر یہ اعتراف:

''میں نے اپنی ایک اسکالر (جو انگریزی کی بھی ایم اے تھی) اسے قرۃ العین حیدر اور ورجینا وولف کے تقابلی مطالعے پر کام کروایا دونوں میں بے پناہ مماثلت ہے حتیٰ کہ بعض اقتباسات تک حیرت انگیز طور پر ملتے جلتے ہیں'' (ص ۱۶)

وارث علوی، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر مولا بخش، رضوانہ پروین کی تحریروں میں ایک بات مشترک ہے کہ بیگ احساس کا اسلوب منفرد ہے اُن کی کہانیوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ مجتبیٰ حسین صاحب نے اپنے شگفتہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

رخسانہ صولت سلیمی کا عرصہ بعد افسانہ نظر سے گزرا۔ یہ افسانہ مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کرداروں کے نام، لفظیات اور ماحول وغیرہ محبت اور ذاتی نظریات سے جنم لینے والی متاثر کن کہانی ہے۔ سیما پیروز کی کہانی ''کھارے سوڈے کی بوتل'' اپنی پیش کش کے لحاظ سے زبردست ہے۔ آغا گل کا ''بھولو'' کا افسانہ اس کا اختتام اسے افسانہ بناتا ہے کہانی کے کچھ بیانات پر خاموشی میرا تبصرہ ہے۔ سید نصرت بخاری کا افسانہ ''بُو'' کا بیانیہ سادہ ہے مگر کہانی سفر تیز کرتی ہے ''دارے'' کی زندگی میں کس طرح تبدیلیاں آتی ہیں گاؤں کے کچھ منفی کردار اور ہوٹل والے اور گوالے کے مثبت کردار، جانوروں میں رہ کر نارمل زندگی کی طرف لوٹ آنا اچھا افسانہ ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے اس بار ''کولیسٹرول'' کے متعلق آسان زبان اور سادہ پیرائے میں زبردست معلومات فراہم کی ہیں۔ فاری شا نے عظیم سائنس دان، فلسفی اور سیاسی وسماجی مفکر اسٹیفن ولیم ہاکنگ کی زندگی اور خدمات پر مختصر مگر جامعیت کے ساتھ اپنا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ''پیار کا بے لوث جھرنا'' میں رینو بہل صاحبہ نے یوگیندر بہل تشنہ کی زندگی کے مثبت رویے روشن کیے ہیں تحریر سے ایک انسان دوست کی تصویر ابھرتی ہے۔ بہت خوب۔

شگفتہ نازلی، عارف شفیق، زیبا سعید، ملک محمد انور، آفتاب خان اور انیس الرحمان کی غزلوں کے اشعار پسند آئے۔ عشاق کشتواڑی کی غزل سماجی و سیاسی ناہمواری کی ترجمان ہے۔ آصف ثاقب، غالب عرفان، مہندر پرتاپ چاند، کرامت بخاری اور اشرف جاوید کی غزلیں فنی پختگی کے ساتھ عصری تقاضوں کی نمائندہ ہیں۔ پروین شیر کی نظم ''غار در غار'' اور روپا صبا کی ''بت'' میں گھٹن زدہ ماحول اور نسوانی جذبات کی ترجمانی ہے۔ فرح کامران اور سلیم انصاری کی نظمیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ یونس شرر صاحب، سیما پیروز اور آصف ثاقب کے خط اہم ہیں۔ نیلوفر عباسی کے شکایتی خط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اُن کا جذباتی ہونا فطری ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اپنی خاص خوشبوؤں اور منفرد رنگوں کو اپنے جلو میں سموئے ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۸ء نظر نواز ہوا۔ دل مسرتوں کے احساس سے بھر گیا۔ قرطاسِ اعزاز کے لیے اس مرتبہ آپ کی نظر انتخاب پروفیسر یونس شرر پر پڑی۔ آپ ہر مرتبہ ایسی علمی وادبی شخصیت کو مسند اعزاز کے لیے منتخب کرتے ہیں جس کے بارے میں اہل ادب کبھی بھی دو رائے نہیں رکھتے۔ یونس شرر صاحب پر لکھے گئے جیّد اہلِ ادب کے مضامین اور آراء اور شرر صاحب کے کلام کے مطالعے سے چہارسو کے توسط سے ہمیں ایک بڑے دانشور اور صاحب طرز شاعر سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالوں نے بھی یونس صاحب کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں ہماری بڑی رہنمائی فرمائی۔ آپ اس ادبی کارنامے پر داد کے مستحق ہیں۔ میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ چہارسو کے دیگر سلسلے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً افسانوں میں ڈاکٹر آزاد کا (اسکین) سلیم آغا قزلباش کا (دل کا ٹکڑا) یسٰین احمد کا (یوم الحساب) طیبہ ولایت خان کا (نوری) اور گلزار جاوید کا (سینے میں چھپا سانپ) ناقابلِ فراموش افسانے ہیں۔ غزلیات میں غالب عرفان، شاہین، مسلم شمیم، کرامت بخاری، تبسم انوار، رومانہ رومی کی غزلیات خوبصورت ادبی شہہ پارے ہیں۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

من منگل بہار پیارے گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس ناچیز جنگل خیش کی خاطر آپ چہارسو کے شعر وادب کے موج میلے بہم کرتے ہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ مطالعہ کی گونا گونی ذوق وشوق کی فراوانی چہارسو کا طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ رکھے بڑا دیدہ ور پرچہ ہے۔ آغا گل کے جانے پہچانے ''اپنے پن'' نے لطف دیا۔ ان کی ''جھنجھلاہٹوں'' میں افسانوی آہٹیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح کا افسانوی تاثر کوئٹہ کی پراسرار اور تاریخی فضاؤں ہی میں دستیاب ہے۔ دیپک کنول صاحب کے قلم کا فلمی استحسان اپنے نہج کی رنگ آمیزی رکھتا ہے۔ راجکمار کی شخصی اور فنی عظمت کو انہوں نے خوب اختصاصی آہنگ دیا ہے۔ بھارت بھوشن کے باب میں انہوں نے نہ لکھا ہو تو اب لکھیں۔ کرن دیوان، اجیت، نلنی جیونت، گیتا بالی سے متعلق کیا خیال ہے۔ سفرنامہ ''کاروانِ مصطفیٰؐ'' دل کو چھو لینے والی نوشت ہے۔ جس نے یہ لکھی ہے یا لکھا ہے وہ دلِ حساس کی مینا کاریوں سے بخوبی آشنا ہے۔ ماشاءاللہ۔ کولیسٹرول ایک تجزیاتی اور معلوماتی مضمون ہے۔ اس سے انجانے خوف کا سدّ باب ہوا۔ ''پیار کا بے لوث جھرنا'' بہل صاحب کی نہایت پیاری تصویر ہے۔ لکھنے والے کا قلم اور موضوع کا تشخص حسن وخوبی خاصے کی چیزیں ہیں۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

...... غزل خوشبو ......

اردو ادب محترم گل بخشالوی کی زندگی ہے جسے وہ تنہا نہیں گزراتے بلکہ اپنے ہم عصر شعراء کو بھی ساتھ رکھتے ہیں اور انہیں ان کا جائز مقام اور قرار واقعی اہمیت بھی دیتے ہیں۔ یہ خوبی ہمیں محترم گل بخشالوی جیسے نظم و غزل کے قادر الکلام شاعر اور خوش باطن شخصیت میں ہی نظر آتی ہے ورنہ ہم نے تو قلمکاروں کی قابل ذکر تعداد کو نرگسیت، خودار تکازی اور صرف اپنی ہی ذات و تخلیقات کے عشق میں بتلا پایا ہے۔ محترم گل بخشالوی کی شخصیت اور رویہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ دوسرے شعراء کی محبت میں ان کے کام کو نمایاں کرنے کی مخلصانہ تگ و دو کرتے بھی نظر آتے ہیں جس کی مثال ان کی تازہ کاوش ''غزل خوشبو'' ہے۔ جس میں انہوں نے عہد حاضر کے ۲۷ معروف شعراء کی غزلیں شامل کی ہیں۔ یہ شعراء محترم گل بخشالوی کا انتخاب ضرور ہیں لیکن ان کی غزلیں جو اس مجموعے کی زینت بنی ہیں خود ان ۲۷ شعراء نے اپنے کلام سے منتخب کی ہیں۔ اب یہ غزلیں گل بخشالوی صاحب کا انتخاب بھی ہیں۔ اور یوں اس انتخاب کو دو آتشہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ''غزل خوشبو'' کی مہک اور محبوبیت قارئین میں انتہائی مقبولیت حاصل کرے گی اور محترم گل بخشالوی کی اس تالیف دل پذیر کو خوش ذوق قارئین کے بک شیلف میں ہی نہیں خواب وادی میں جانے سے پہلے پڑھتے پڑھتے تکیے کے نیچے رکھے جانے کا وہ مقام بھی حاصل ہوگا جسے مقبولیت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ ......ابصار عبدالعلی

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: کوئی نہیں، دستیابی: بخشالوی پبلشرز، کھاریاں۔

...... کھنڈر کا بھوت ......

اس وقت برصغیر میں میرے علم میں میرے علاوہ کوئی ایسا شکاری زندہ نہیں جس نے شیر شکار کیے ہوں۔ ممکن ہے دنیا میں ہی ایسا کوئی شکاری نہ ہو، میں بھی بس یوں ہوں جیسے نہیں ہوں۔ اور یقیناً اب شیر کے شکار کے بارے میں لکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس لیے کہ شیر کا شکار، جس طرح میرے زمانے میں ہو چکا وہ اب ممکن نہیں۔ وہ وقت گذر گیا، ہم لوگ شیر بلکہ آدم خور شیر کے آخری شکاری تھے۔ مجھے پھر بھی یقین ہے، میری کتابیں بہت عرصہ زندہ رہیں گی، ان کتابوں کے شائقین ہمیشہ زندہ رہیں گے، ایک وقت آئے گا جب کچھ لوگ ضرور کہیں گے، قمر نقوی قابلِ ذکر شیر کا شکاری تھا۔ لوگ میرے بیان کردہ واقعات پر یقین کریں گے اس لیے کہ میرے علاوہ کوئی قابلِ یقین قصہ نہیں لکھ سکتا۔ بہت کم لوگ اس کام کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں، میں شکاری بھی ہوں، ادیب اور شاعر بھی اور شیر کے بارے میں میرے تجربات و معلومات بہت وسیع ہیں مگر میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے جتنا علم دیا ہے وہ باعث تشکر ہے۔ ......نقشبند قمر بخاری

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

...... جبران سے ملیے ......

جبرآن صاحب ایک فکری و نظریاتی انسان ہیں، کبھی کبھی اس حوالے سے اُن میں سخت گیری بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر ایسا نہیں کہ ہمدردی و نرم دلی اُن کی فطرت کا حصہ نہیں۔ مذہبی اقدار و روایات اُن کا سب سے بڑا اثاثہ ہیں لیکن وہ انسان اور انسانیت کی تکریم کو بھی فوقیت دیتے ہیں، کسی بھی بنیاد پر تعصب و نفرت کے خلاف ہیں اور اپنی تخلیقات میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری اور افسانہ نگاری زمینی حقائق کی آئینہ دار ہے، اس لیے اُن کے ہاں تصورات کی رنگینیاں نہیں، اُن ماورائی جذبات و احساسات کی ترجمانی نہیں جو پڑھنے والوں کے لیے کشش و جاذبیت کا باعث ہوں۔ اُن کے تصورات میں ایک ایسا معاشرہ ہے جو باہمی رواداریوں، محبت اور خلوص کا عکاس ہو، بالخصوص پاکستان اور پاکستانی معاشرہ نظریۂ پاکستان کی حقیقی تصویر ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تخلیقات اُن کے پڑھنے والوں کو فکری گمراہی سے بچا سکیں۔ ......ڈاکٹر انیس الرحمٰن خاں

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۱۰۰۰، دستیابی: جبران اشاعت گھر، اردو بازار، کراچی۔